قوسِ قزح

اسرار ایوب

قوسِ قزح

اسرار ایوب

مراسم



’’قوسِ قزح‘‘ اردو کے دامن میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے کہ اس میں زندہ رہنے کے بیشتر اوصاف موجود ہیں۔ مقصدیت کی بلندی اور معنویت کی گہرائی اس کتاب کو بہت منفرد بنا دیتی ہے۔

الطاف حسن قریشی
ایڈیٹر اردو ڈائجسٹ

اسرار ایوب (اپنے ہم عصر کالم نگاروں میں) واحد شخص ہے جس کی نیت بھی درست ہے، سمت بھی ٹھیک ہے اور ارادے بھی نیک ہیں اور یہ کامیاب کالم نگاری کے لیے ’لیتھل کومبی نیشن‘‘ (Lethal Combinition) ہے۔

حسن نثار
کالم نگار / ٹی وی اینکر / شاعر

اسرار ایوب کی بے ساختہ اور بامقصد تحریریں قاری کو اپنے حصے کی کوئی شمع جلانے پر آمادہ کرتی ہیں، ان کا اندازِ بیاں عام فہم، دلچسپ اور افسانوی ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

قیوم نظامی
سابق وزیرِ مملکت / سیکریٹری اطلاعات
پاکستان پیپلز پارٹی

پہلے روزنامہ خبریں اور اب روزنامہ جناح میں ’’قوسِ قزح‘‘ کے عنوان سے اسرار ایوب کا کالم فی الواقعہ کسی بھی موضوع کے ساتوں رنگ سمیٹے ہوئے ہوتا ہے۔

عمران خان
چیئرمین، تحریک انصاف، پاکستان

Marasim
Publishers
722 A.ST 7 NEAR COMMUNITY CENTRE
MODEL TOWN HUMAK ISLAMABAD
0300-5040433

قوسِ قزح

اسرار ایوب

قوسِ قزح

اسرار ایوب

مراسم

722A St 7 NEAR COMMUNITY CENTRE

MODEL TOWN HUMAK ISLMABAD

O300-5040433

ضابطہ

نام کتاب	:	قوسِ قزاح
مصنف	:	اسرار ایوب
سنِ اشاعت	:	2010ء
زیرِ نگرانی	:	سردار زرار خان
اہتمام	:	سید آلِ عمران
سرِ ورق	:	موڈی
تعداد	:	500
ناشر	:	مراسم پبلشرز
کمپوزنگ	:	ارسلان حامد
پرنٹر	:	کارواں پریس لاہور
قیمت	:	300روپۓ

انتساب

نادیہ اور میرب

کے نام

کہ میری قوسِ قزح کے رنگ ان دونوں سے زیادہ کسی کے

مقروض نہیں

ترتیب

ایک بیش قیمت اضافہ

''قوسِ قزح'' اسرار ایوب کے خیال افروز اور معلومات افزا کالموں کا مجموعہ ہے جو قومی اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ موضوعات انتہائی سنجیدہ ہونے کے باوجود اپنے اندر ایک تازگی اور چاشنی رکھتے ہیں۔ پختہ کالم نگار اپنے قلم کی مضراب سے دل کے تار چھیڑتا اور ذہن کے دریچے کھولتا جاتا ہے۔ تحریر میں کاٹ کے علاوہ صداقت کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ قدرت نے انہیں شاعری کا ملکہ بھی عطا کیا ہے اور قرآنِ حکیم کی عظمت کا گہرا شعور بھی۔ کالموں کے موضوعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ قلم کار سائنسی علوم پر بھی دسترس رکھتا ہے۔ وہ حکمرانوں کی ملمع سازی اور فریب کاری نہایت موثر انداز میں بیان کرتے ہیں اور انسانیت کو تباہی سے بچانا اور اپنے ہم وطنوں کو ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا مشورہ ہے کہ ہماری قوم کو فلم کے اداکاروں اور کرکٹ کے کھلاڑیوں کے بجائے سائنس دانوں اور مفکروں کو بلند مقام دینا چاہیے۔

''قوسِ قزح'' اردو کے دامن میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے کہ اس میں زندہ رہنے کے بیشتر اوصاف موجود ہیں۔ اس کے مطالعے سے انسانی تاریخ کے عجائبات اور انسانی تہذیب کے اسباق ذہن پر نقش ہوتے اور دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ مقصدیت کی بلندی اور معنویت کی گہرائی اس کتاب کو بہت منفرد بنا دیتی ہے۔

الطاف حسن قریشی

ایڈیٹر اردو ڈائجسٹ

17/2/2010

اک اور نام

ایک زمانہ وہ تھا جب ہر دوسرا نوجوان اداکار، گلوکار، کھلاڑی یا فلمکار بننا چاہتا تھا۔ آج کل جسے دیکھو کالم نگار بننا چاہتا ہے حالانکہ اس کام کے ساتھ وابستہ ''گلیمر'' اور ''پیسہ'' بہت کم کو نصیب ہے، تو غالباً اصل وجہ یہ ہے کہ کالم نگار ڈھیلا ڈھالا بھی ہو تو اس کی ''نیوسینس ویلیو'' ضرور بن جاتی ہے اور بدقسمتی سے اس معاشرہ کی واحد ویلیو ہی نیوسینس ویلیو ہے۔

30 سال کی قلم کھپائی اور قلم گھسائی کے بعد مجھے اتنا تجربہ ضرور ہو گیا ہے میں کسی بھی نو وارد کے چند کالم پڑھ کر ہی اسکی نیت، سمت، عزائم اور ارادوں کا اندازہ لگا لیتا ہوں۔

اسرار ایوب واحد شخص ہے جس کی نیت بھی درست ہے، سمت بھی ٹھیک ہے اور ارادے بھی نیک ہیں اور یہ کامیاب کالم نگاری کے لیے ''لیتھل کومبی نیشن'' (Lethal Combinition) ہے۔ اسرار کو اپنے اکثر ساتھیوں پر یہ فوقیت اور سبقت بھی حاصل ہے کہ وہ باقاعدہ صاحبِ دیوان خوبصورت شاعر بھی ہے، سو میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ اسرار اسی طرح قلم اور کالم تپسیا میں مگن رہا تو صفِ اول کے کالم نگاروں میں اک اور نام کا اضافہ ہو جائے گا۔

حسن نثار

کالم نگار / ٹی وی اینکر / شاعر

22/2/2010

پڑھا لکھا بے باک کالم نویس

جاگیردارانہ سماج میں مڈل اور لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے دھرتی سے جڑے ادیب شاعر اور کالم نویس گمنام اور تاریک راہوں میں ہی مارے جاتے ہیں یا اسرار ایوب کی طرح کٹھن حالات کے افق پر چل کر ہی قوسِ قزح کی طرح نمودار ہو پاتے ہیں۔ اسرار ایوب ایک پڑھے لکھے بے باک کالم نویس ہیں، ان کی بے ساختہ اور بامقصد تحریریں قاری کو اپنے حصے کی کوئی شمع جلانے پر آمادہ کرتی ہیں، ان کا اندازِ بیاں عام فہم، دلچسپ اور افسانوی ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ سماجی برائیوں، ریاستی نظام کی اذیتوں اور نوکر شاہی کی ذہنیت کو بے نقاب کرنا اسرار ایوب کا عقیدہ ہے۔

اسرار ایوب اپنے ایک کالم میں رقمطراز ہیں: ''ماہرین نے ترقی یافتہ قوموں کے عمومی رویّے کا تجزیہ کیا تو پتہ چلا کہ اس کی بنیاد 9 چیزوں پر قائم ہوتی ہے۔ ضابطۂ اخلاق، عزتِ نفس وخودداری، احساسِ ذمہ داری، قانون کا احترام، دوسروں کے حقوق کی پاسداری، کام سے محبت، بچت اور خرچ کا سلیقہ، کوئی بڑا کام کرنے کی لگن اور وقت کی پابندی۔ انہی 9 چیزوں کے فقدان نے ہمیں غریب بنا دیا ہے''۔ اسرار ایوب کے کلام ''سرد دھوپ'' کا مطالعہ بھی کر چکا ہوں، وہ مجھے اقبال کی فکر کے مقلد نظر آئے، ان کے دو اشعار قارئین کی نذر ہیں کہ

طبقات کی تفریق زمانے سے مٹا دو
انسان کو انسان سے آزاد کرادو
بے چارے مسلمان کا دم گھٹنے لگا ہے
اسلام کو ملا کے شکنجے سے چھڑا دو

قیوم نظامی

سابق وزیرِ مملکت و مرکزی سیکریٹری اطلاعات پی پی پی

14/10/2009

مشعلِ راہ

الیکٹرانک میڈیا کے بڑھتے ہوئے اثر رسوخ کے باوجود پاکستان میں سنجیدہ طبقے کی نظریات سازی میں اخبارات اور بالخصوص ان میں شائع ہونے والے کالم نہایت موثر کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہ امر انتہائی مسرت کا باعث ہے کہ اردو صحافت کے مستند اور سینئر کالم نگاروں کی صف میں اب ایسے نئے کالم نگار بھی اپنی جگہ بنا رہے ہیں جن کے نکتہءنظر سے تو اختلاف ضرور ممکن ہے لیکن ان کا غیر متعصّبانہ تجزیہ، ان کی دیانت اور گہری تحقیق کے بعد کسی معاملے کے ہر پہلو کو قارئین کے سامنے لانے کی کوشش شک وشبے سے بالاتر رہتے ہیں۔ ایسے ہی کالم نگاروں میں سے ایک اسرار ایوب بھی ہیں۔

پہلے روزنامہ خبریں اور اب روزنامہ جناح میں ''قوسِ قزح'' کے عنوان سے ان کا کالم فی الواقعہ کسی بھی موضوع کے ساتوں رنگ سمیٹے ہوئے ہوتا ہے۔ اسرار ایوب کی تحریروں میں پاکستان کے عام آدمی اور اسکے مسائل کے لیے گہری دردمندی، معاشرے کو بہتر و باشعور بنانے کی شدید خواہش اور آئین وقانون کی بالادستی کے لیے بھرپور جذبے کی تحریک نظر آتی ہے۔

کسی معاملے پر فکر وتحقیق کے بغیر، محض جذباتیت کے زیرِ اثر کوئی موقف اپنا لینا ہمارا سب سے بڑا المیہ ہے اور یہی انفرادی رویہ قومی رویے کی تشکیل میں طرح طرح کی کمزوریوں کا باعث بنتا ہے جس کے تدارک کے لیے ہر صاحب فکر ونظر کو پوری کوشش کرنی چاہیے۔ میں اسرار ایوب کی کالم نگاری کو اسی جدوجہد کا ایک اہم حصہ سمجھتا ہوں۔ امید ہے کہ ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھ کر قومی مفادات کے لیے بساط بھر جدوجہد کی انکی یہ روش نہ صرف قائم رہے گی بلکہ دوسروں کے لیے بھی مشعلِ راہ بھی ثابت ہوگی۔

عمران خان

چیئرمین، تحریک انصاف پاکستان

4/1/2010

منتخب خط

محترم اسرار ایوب صاحب
اسلام علیکم

کافی عرصے سے آپ کا کالم پڑھ رہا ہوں۔آپ کبھی ان کے خلاف لکھتے ہیں جن کی سطوت و حاکمیت کو لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا و حکمت جان کر قبول کرتے چلے آرہے ہیں اور کبھی ان پر حرف زنی کرتے ہیں جن کا کہا ہوا ہر حرف، حرفِ آخر ہوتا ہے۔ہمیں تو سمجھایا گیا تھا کہ جو کچھ لکھنا تھا لکھا جا چکا ہے اور جو کچھ سوچنا تھا سوچا جا چکا ہے، مذید سوچنے سے دین و ایمان کو خطرہ لاحق ہو جائے گا، طبقاتی تقسیم کے خلاف لکھو گے تو یہ خدائے بزرگ و برتر کی تقسیم کو چیلنج کرنے کے مترادف ہوگا؟

آپ نے پچھلے کالم میں قرآن مجید کا ایک حوالہ دیا تھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ اہل ایمان وہ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کی آیات بھی پڑھی جاتی ہیں تو وہ ان پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں گر پڑتے بلکہ غور و فکر کے بعد ایمان لاتے ہیں۔ یہ کلام برحق ہے لیکن یاد رکھیے کہ آگہی اور شعور کی باتیں کرنے والے کبھی خیریت سے نہیں رہ سکے ہیں۔قدیم یونان کے سقراط کو بھی یہی خبط تھا بلکہ جب اس کو زہر کا پیالہ پینے کی سزا سنائی گئی تو اس نے کہا کہ اس عظیم آدرش (فکر و نظر) کی راہ میں میری جان بہت حقیر ہے جس کی آواز پر لبیک کہہ کر میں نے اپنا انسانی فریضہ ادا کیا، میں نہ ہوتا تو یہ آواز کسی اور کو سنائی دے دیتی۔

اسرار ایوب صاحب! حریتِ فکر کی روش پر مت چلیے۔فرعونوں قارونوں اور ہامانوں کو سرِ عام مت للکاریئے۔اس معاشرے کی جستجو مت کیجئے جہاں کوئی کسی کا دستِ نگر نہ ہو، جہاں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو اپنا غلام نہ بنا سکے، جہاں حاکمیت صرف اور صرف اللہ کی ہو اور جہاں تقلید کی روش فکر و نظر پر حاوی نہ ہو سکے۔آزادی، ترقی، عدل و انصاف، بنیادی حقوق، کفالت عامہ، انسانی عزت و تکریم اور اس طرح کے دیگر الفاظ اپنی تحریروں سے مٹا دیجئے کہ یہ خواب

اب چکنا چور ہو چکے ہیں۔

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اقتدار پرستوں ،سرمایہ داروں اور پیشواؤں کے ہاتھوں لکیر کے فقیر بن کر ہم اپنے دلوں پر مہریں لگوا بیٹھے ہیں،ان تالوں کو توڑنے کی جدوجہد ان لوگوں کے خلاف کھلم کھلا بغاوت ہے جو سیاہ وسفید کے مالک ہیں،اس جان لیوا کوشش سے باز آ جایئے لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ باز آنے والے نہیں۔

محمد اکرم سہیل
سیکریٹری تعلیم
آزاد حکومت ریاست جموں وکشمیر
22/7/2008

سوچنا چھوڑ دوں کیسے میں بھلا جیتے جی
سوچنا چھوڑ دے انسان تو مر جاتا ہے

اسرار ایوب

انھیں بھی دوست سمجھو

ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں کہ بیرونی مداخلت نہ ہو تو قدرت جو کرتی ہے صحیح کرتی ہے لیکن میرا بیٹا دوسرے بچوں کی طرح سمجھ سکتا ہے نہ سیکھ سکتا ہے؟ فطرت کا خاص توازن میرے بیٹے میں کہاں ہے؟ یہ سوال ایک معذور بچے کے والد نے ''اسپیشل ایجوکیشن'' کے ایک سکول کی سالانہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے پوچھا اور وہاں موجود لوگوں پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔

والد نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ میرے بیٹے جیسا ذہنی وجسمانی طور پر معذور کوئی بچہ دنیا میں آتا ہے تو اسکے ذریعے ہمیں فطرت کے خاص توازن کو سمجھنے کا صحیح موقع ملتا ہے اور فرق اس بات سے پڑھتا ہے کہ ہم اس بچے کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟ اس کے بعد انہوں نے یہ کہانی سنائی کہ ایک مرتبہ میں اور میرا بیٹا ایک گراونڈ کے سامنے سے گزرے جہاں ہماری کالونی کے بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ میرے بیٹے نے بڑی حسرت سے پوچھا کہ ابا آپکے خیال میں کیا یہ بچے مجھے اپنے ساتھ کھیلنے دیں گے اور میں نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کیے؟ میں جانتا تھا کہ ایک معذور بچے کو اپنی ٹیم میں کون شامل کرنا چاہے گا لیکن ایک باپ ہونے کے ناطے یہ خیال آیا کہ اگر کسی نے میرے بیٹے کو اپنی ٹیم میں شامل کرلیا تو اپنائے جانے کا یہ احساس اس میں محرومی و مایوسی کو شکست دینے والا اعتماد پیدا کرسکتا ہے، اسی خیال نے مجھے بیٹنگ کرنے والی ٹیم کے کیپٹن سے وہ سوال کرنے پر مجبور کر دیا جو میرے بیٹے نے مجھ سے کیا تھا اور میری توقع کے برعکس اس نے میرے بیٹے کو اپنی طرف سے کھلانے کی ہامی بھرلی۔

چھ گیندوں کا کھیل باقی تھا، جیتنے کے لیے چودہ رنز کی ضرورت تھی اور سات کھلاڑی آوٹ ہو چکے تھے۔ آخری اوور مخالف ٹیم کے بہترین باؤلر نے کرانا تھا جبکہ بچی کھچی بیٹنگ میں کوئی ایک بھی مستند بلے باز نہیں تھا۔ میرے بیٹے والی ٹیم کی شکست یقینی دکھائی دیتی تھی، غالباً اسی لیے کپتان نے اسے بیٹنگ کے لیے تیار ہونے کا اشارہ کیا۔ پیڈ پہنتے ہوئے اس نے بڑے

پُر جوش انداز سے میری طرف دیکھا اور میرے آنسو بہنے لگے۔اسی دوران وہاں کی فضا ولولہ انگیز نعروں سے گونجنے لگی کیونکہ ایک بلے باز نے حیرت انگیز طور پر پہلی دو گیندوں پر دو چھکے لگا دیے لیکن پھر خاموشی چھا گئی کیونکہ تیسری گیند پر وہ آؤٹ ہو گیا۔اب تین گیندوں کا کھیل باقی تھا اور جیتنے کے لیے صرف دو رنز درکار تھے۔میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور یہ سوچ کر سانس رکتی ہوئی محسوس ہونے لگی کہ اگر میرے بیٹے کو بیٹنگ کے لیے بھیجا گیا تو اس کی ٹیم یقینی طور پر ہار جائے گی جسکا ذمہ دار میرے بیٹے کو ٹھہرایا جائے گا اور اگر اسے بیٹنگ کے لیے نہ بھیجا گیا تو اس کا اعتماد شاید کبھی بحال نہ ہو سکے۔ہر دو صورتوں میں مجھے امید کی وہ کرن ڈوبتی دکھائی دی جو میرے بیٹے کے گرد چھائے اندھیروں میں اس روز پہلی مرتبہ اُبھری تھی۔

میرا خیال یہ تھا کہ میرے بیٹے کو بیٹنگ کے لیے نہیں بھیجا جائے گا لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ کپتان نے اس کے ہاتھ میں بلا تھما کر اس کے کندھے پر تھپکی دی اور کھیل کے میدان کی طرف روانہ کر دیا۔مخالف ٹیم کے بچے بھی میرے بیٹے کو اچھی طرح جانتے تھے،انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میچ ہار جیت کے مراحل سے آگے جا چکا ہے،اگر ایسا نہیں ہوتا تو کیا کسی دوسرے کھلاڑی کو بیٹنگ کے لیے نہ بھیجا جاتا؟

مخالف ٹیم کے کپتان نے تھوڑی دیر کے لیے اپنے کھلاڑیوں کو اکٹھا کر کے ان سے کوئی بات کی اور میچ دوبارہ شروع ہو گیا۔باؤلر نے شاید یہ سوچ کر بڑی نرمی سے بال کرایا کہ ایک رن بن جائے اور باقی کی دو گیندیں دوسرے بلے باز کو بھرپور طریقے سے کرائی جا سکیں۔اس کے باوجود میرے بیٹے کا بلا گیند کو نہ چھو سکا،اگلی گیند بھی بڑی آسان تھی لیکن وہ بھی کسی رکاوٹ کے بغیر وکٹ کیپر کے ہاتھوں میں جا پہنچی،آخری گیند بھی سیدھی نکل گئی لیکن امپائر نے معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اسے ''نو بال'' قرار دے دیا۔آخرکار بلے نے گیند کو چھو ہی لیا،میرے بیٹے نے تیزی کے ساتھ بھاگنے کی کوشش کی لیکن تھوڑی ہی دور جا کر وہ گر گیا۔بال فیلڈر کے ہاتھوں میں آ چکی تھی جو اسے باؤلر کی طرف پھینک کر میرے بیٹے کو بڑی آسانی سے

آؤٹ کرا سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور بال وکٹ کیپر کی طرف پھینک دی ۔اس دوران میرا بیٹا کھڑا ہو کر دوبارہ بھاگنا شروع کر چکا تھا۔ پہلا رن مکمل ہو گیا تو وہاں موجود لوگوں نے زور زور سے ''ون مور۔ون مور'' (یعنی ایک رن اور۔ایک رن اور) کے نعرے لگانے شروع کر دیے اور وہ دوبارہ دوڑنے لگا۔اس بار بھی اسے بڑی آسانی کے ساتھ رن آؤٹ کیا جا سکتا تھا لیکن وکٹ کیپر نے گیند وکٹ پر مارنے کے بجائے باؤلر کی جانب پھینک دی اور باؤلر نے اسے پکڑنے کی کوشش ہی نہیں کی ۔میرے بیٹا دو مرتبہ اور گرا لیکن ساتھیوں کے جوش و خروش نے اسے حوصلہ نہیں ہارنے دیا، اس نے دوسرا رن بھی مکمل کر لیا اور کھیل کا میدان زوردار نعروں اور تالیوں سے گونج اٹھا۔

اپنی ٹیم کو جتوا کر جب وہ گراؤنڈ سے باہر آیا تو تمام کھلاڑیوں اور شائقین نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ میں بھی تالیاں بجاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔اس کی ٹیم نے اسے کندھوں پر اٹھا لیا اور میری آنکھوں سے اتنے آنسو بہے جتنے پہلے کبھی نہیں بہے تھے۔اس روز کرکٹ کھیلنے والے بچوں نے محبت اور انسانیت کا ایک سچا نمونہ پیش کیا۔

میرا بیٹا اپنی معذوری کے باعث زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکا لیکن جب تک زندہ رہا ایک لمحے کے لیے بھی اس خوشی کو نہیں بھولا جو اسے اس روز ملی جب وہ میچ جیت کر بڑے جذباتی انداز میں بھاگتا ہوا میری طرف آیا اور میں نے آگے بڑھ کر اپنے ''ہیرو'' بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔

باپ بیٹے کی یہ کہانی جب بھی یاد آتی ہے،اس سوچ میں کھو جاتا ہوں کہ ہم اپنی زندگی میں فطرت کے خاص توازن کو سمجھنے کے کتنے مواقع ضائع کر دیتے ہیں؟ اور بظاہر معمولی دکھائی دینے والے کئی رابطے ہمیں کتنی بار اس اہم ترین دوراہے پر لا کھڑا کرتے ہیں جہاں سے ایک راستہ محبت و انسانیت کی بلندیوں کو جاتا ہے اور دوسرا بے حسی اور سرد مہری کی پستیوں کو؟ کسی نے کیا خوب کہا کہ کوئی معاشرہ دراصل اپنے اس رویے سے پرکھا جاتا ہے جو وہ اپنے محروم و

مجبور طبقوں سے روا رکھتا ہے؟ بدقسمتی سے ہمارے یہاں معذوروں اور زیردستوں کو وہ مقام نہیں دیا جاتا جس کا وہ حق رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے چور، ڈاکو، ذخیرہ اندوز، رشوت خور اور قاتل تو بڑے فخر کے ساتھ ''وی آئی پی'' پروٹوکول میں گھومتے پھرتے ہیں لیکن محروموں اور مجبوروں کی زندگی اس غم میں گُھلتے گزرتی ہے کہ انہیں کس جرم کی پاداش میں حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے؟

بچپن کا ایک بھولا بسرا کلاس فیلو الطاف یاد آ رہا ہے جسے اسکی معذوری کے باعث کوئی اپنی ٹیم میں نہیں رکھتا تھا، پھر بھی جب ہم کرکٹ کھیلنے لگتے تو وہ بھی ان لڑکوں کے ساتھ کھڑا ہو جاتا جن میں سے ٹیم کیپٹن اپنی اپنی ٹیم چُنتے۔ ایک ٹیم کا کیپٹن میں ہوا کرتا تھا اور جس حسرت سے وہ میری طرف دیکھتا تھا آج اس کا خیال آتے ہی آنکھیں بے اختیار نم ہوگئیں۔ کاش وہ زمانہ لوٹ آئے تو میں سب سے پہلے الطاف کو چُنوں۔

روزنامہ خبریں، 2/6/2008

کسی کے درد سے مجھ کو نہ شادمانی دے

وزیرستان جو آجکل میدانِ جنگ بنا ہوا ہے، میری زندگی میں اس لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس ایجنسی کے روکھے سوکھے اور گرم شمالی حصے میں وہ ہری بھری اور ٹھنڈی جگہ بھی واقع ہے جسے رزمک کہتے ہیں اور جہاں وہ کیڈٹ کالج ہوا کرتا تھا جس کی آغوش نے چار برس مجھے تعلیم دی اور میری تربیت بھی کی۔ آٹھویں جماعت میں ہمارے انگریزی کے استاد ایک انگریز ہوا کرتے تھے اور جس دن سے تبلیغی جماعت والوں نے یہ بتایا تھا کہ ایک کافر کو مسلمان بنانے اور جہنّم کی آگ سے بچانے کا کتنا ثواب ہوتا ہے، دل و دماغ پر دن رات انہیں اسلام قبول کروانے کی دھن سوار رہتی تھی۔ انکی نرم مزاجی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہماری کلاس کے لڑکے آئے روز انہیں بڑے زور و شور سے کلمہ پڑھنے کی دعوت دیتے رہتے تھے جسے وہ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا کرتے تھے۔ اسلام قبول کرنا تو دور کی بات وہ تو ہماری دعوتِ حق کو اتنی اہمیت بھی نہیں دیتے تھے کے اس کے بارے میں کوئی بات ہی کر لیں۔ ایک دن ہم نے یہ تہیّہ کر لیا کہ آج اسلام قبول نہ بھی کروا سکے تو انہیں گفتگو پر ضرور آمادہ کریں گے کیونکہ کالج کے مولوی صاحب کے بقول کسی کافر کو دعوتِ حق کے بارے میں بحث مباحثے پر تیار کرنا بھی کم ثواب کی بات نہیں تھی۔ اس روز بچ نکلنے کی انکی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی، ہم نے آخر کار انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر ہی لیا اور پھر اسلام قبول کرنے یا نہ کرنے پر سوال جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

پہلا سوال یہ تھا کہ اسلام کیوں قبول کروں؟ اور اسکا جواب ہمارے پاس اسکے سوا کچھ نہیں تھا کہ اسلام قبول کرنے سے جنت ملتی ہے۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ اسلام قبول نہ کروں تو کیا ہو گا؟ اور اسکا جواب اچھے اچھوں کے پاس بھی اسکے علاوہ اور کیا ہوتا ہے کہ اسلام قبول نہ کرنے سے انسان جہنّم میں چلا جاتا ہے؟ تیسرا سوال یہ تھا کہ اس کا مطلب ہے ہمارے دور کے کم و بیش سبھی بڑے بڑے سائنس دان، فلاسفر، مفکّر جہنّم میں جائیں گے؟ ہم نے کہا جی ہاں

اور وہ مسکرا کر بولے کہ پھر تو میں بھی جہنّم میں ہی جانا پسند کروں گا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ یہ سب جہنمی لوگ اپنی ذہانت ،فکر،لگن ،محنت ،سچائی اور ایمانداری سے جہنم کو جنت میں تبدیل کر دیں گے جبکہ آج کے مسلمان کیا جنت کو جہنّم نہیں بنا دیں گے؟

انگریز استاد کی بات جو اس وقت سر سے گزر گئی اور رفتہ رفتہ بھول بھی گئی، 26 سال بعد اچانک نہ صرف یاد آئی بلکہ سمجھ بھی آئی جب کینڈا سے آئے ایک دوست نے بتایا کہ جہاں وہ رہتے ہیں وہاں کا درجہ حرارت منفی 45 ڈگری سینٹی گریڈ کے لگ بھگ ہوتا ہے ،اس درجہ حرارت پر پاکستان جیسے کسی ملک میں زندہ رہنے کا تصور بھی محال ہے لیکن وہاں انتظامات اتنے اچھے ہیں کہ لوگ بڑی ہی آسودہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ گھر ہو دفتر ہو یا بازار ،سب کے سب سینٹرلی ہیٹڈ (Centrally Heated) ہیں ،تمام عمارتیں ایک دوسرے کے ساتھ اسطرح جڑی ہوئی ہیں کہ لوگ ایک کے اندر سے ہی دوسری میں داخل ہو جاتے ہیں اور دور جانا ہو تو اپنے کمرے سے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے گاڑی اسٹارٹ کر کے اسکا ہیٹر چلا دیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے برفانی گلیشیروں (جنکے پانی کو بڑی ہنر مندی کے ساتھ زیرِ استعمال لایا گیا ہے) تک جانے اور مناظرِ فطرت سے لطف اندوز ہونے کا ایسا زبردست نظام ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ کئی کئی سو کلومیٹر پر محیط نیشنل پارک اسطرح بنائے گئے ہیں کہ جانور اور انسان ایک دوسرے سے بالکل محفوظ ہیں۔ ایک پارک میں 750 کمروں کا ایسا عالیشان ہوٹل تعمیر کیا گیا ہے کہ اسے دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے انسان کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ کینڈا کے عمومی درجہ حرارت کو ذہن میں رکھیے اور سوچیے کہ اگر ایک منٹ کے لیے بھی بجلی یا گیس بند ہو جائے تو کیا ہو؟ لیکن ایک منٹ کے لیے بھی بجلی بند ہوتی ہے نہ گیس ، وہاں کے لوگ لوڈ شیڈنگ کے نام تک سے ناواقف ہیں ۔ کینڈا میں ہر رنگ ، ہر نسل ، ہر مذہب اور ہر فکر کے لوگ آباد ہیں لیکن وہاں کوئی بھی کسی دوسرے کے معاملات میں مداخلت کی آزادی نہیں رکھتا اور یہی وجہ ہے کہ الگ الگ نظریات کے حامل افراد بھی مل جل کر ہنسی خوشی رہ رہے ہیں۔ کرائم ریٹ نہ ہونے کے

برابر ہے۔اور تو اور کوئی اکیلی نہتی لڑکی بھی کسی خوف وخطرے کے بغیر پورا ملک گھوم سکتی ہے۔میرے پیارے دوست آفتاب نزیر کو کینڈا سے بس ایک ہی شکایت ہے کہ یہ ملک اتنی عمدگی سے چل رہا ہے کہ اسے مذید عمدہ بنانا بظاہر ممکن دکھائی نہیں دیتا۔انہوں نے کہا کہ کینڈا جنت سے کم نہیں اور میری توجہ انگریز استاد کے اس سبق کی جانب مبذول ہوگئی جو انہوں نے ہمیں آٹھویں جماعت میں پڑھایا تھا۔آپ خود ہی فرمایئے کہ کیا کینڈا قدرتی آب و ہوا کے اعتبار سے جہنّم نہیں لیکن کیا وہاں کے لوگوں نے اسے جنت نہیں بنایا ہوا؟

اب آیئے پاکستان کی طرف ،اسکے چار موسموں کو نگاہ میں رکھیے اور پھر برف پوش پہاڑوں، سرسبز وشاداب وادیوں، جھیلوں، جھرنوں، ندیوں، دریاؤں،سمندروں،صحراؤں ، زرخیز زمینوں اوران میں موجود معدنیات کے بیش بہا خزانوں کو ذہن میں لاکر بتایئے کہ ہماری دھرتی میں کیا وہ تمام چیزیں پوری آب وتاب کے ساتھ موجود نہیں جو کسی ملک کی قدرتی آب و ہوا کو جنت بناتی ہے لیکن کیا ہم نے اسے جہنّم نہیں بنایا ہوا؟ ہمارے یہاں دیگر مذاہب کے لوگ نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن ایک خدا اور ایک رسولؐ کو ماننے والے مسلمان نجانے کتنے ہی فرقوں، کتنی ہی ذاتوں اور برادریوں میں تقسیم ہوکر کیا ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نہیں بن چکے؟ کیا ہم میں قوتِ برداشت نام کی کوئی شے باقی ہے؟ کیا ہمیں ملکی سالمیت کی کوئی پرواہ ہے؟ کیا ہماری کرتوتوں کی وجہ سے ہمارے ملک پرآگ اورخون کی بارش نہیں ہورہی اوراسکے باوجود کیا ہم کرپشن،لوٹ مار،چور بازاری،ذخیرو اندوزی اوررشوت سے باز آ رہے ہیں؟ ہمارے پاس بجلی پیدا کرنے کے لامحدود وسائل ہیں لیکن جتنی لوڈشیڈنگ ہمارے یہاں ہوتی ہے کیا دنیا میں کہیں اور بھی ہوتی ہے؟ ہم قدرتی گیس کے ذخائر سے مالا مال ہیں لیکن انہیں تصرف میں لانے کے بجائے کیا بیچنے پر نہیں تلے ہوئے؟ ہمارے کھیت دنیا کی بہترین زرعی اراضی میں شمار کیے جاتے ہیں لیکن ہماری اکثریت کیا ایک ایک بوری آٹے کے لیے ترس نہیں رہی؟ ہمارے پاس اہلیت واچھائی کے اعتبار سے بہترین لوگ موجود ہیں لیکن ہم نے

کیا ہر شعبے میں ماجھوں گاموں کو آگے نہیں لایا ہوا؟ ملک کو جنگی ضرورت ہے کیا وہ ملک چھوڑ کر نہیں جا رہے اور جنگی ضرورت نہیں کیا وہ سیاہ وسفید کے مالک نہیں بنے ہوئے؟

کاش ہم اپنی ڈیڑھ ڈیڑھ انچ کی مسجد سے باہر نکل سکیں، کاش ہم خدا کے عظیم پیغام کی عالمگیریت کو سمجھ سکیں جس پر ایمان لانے کا دعوی کرتے ہیں، کاش ہم اس نبیؐ کے نقشِ قدم پر چل سکیں جسکی صداقت اور امانت کی گواہی اسکے بدترین دشمن بھی دیتے تھے، کاش ہم کردار کے اس سانچے میں ڈھل سکیں جو گناہ گار سے نہیں بلکہ اسکے گناہوں سے نفرت سکھاتا ہے، کاش ہمارے رویّے سے امن ومحبت اور علم وآگہی کی ایسی بارش برسے جو اس جہنّم کی آگ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھا دے جو ہماری جنت میں جل رہی ہے۔ آیئے سب یہ آرزو اپنائیں کہ

خدایا دیدہء بینا کو بے کرانی دے
تُو میرے سوزِ تمنا کو جاودانی دے
ترے فلک پہ ستارے ترے رہیں روشن
جو دل کی شب ہے اسے بھی تو ضوفشانی دے
خزاں رسیدہ ہیں جو لوگ ایک مدت سے
وہ کِھل اٹھیں تو مجھے بھی رُتیں سہانی دے
خدایا پھیل رہے ہیں جو دشت تھام انہیں
رُکے ہوئے ہیں جو دریا انہیں روانی دے
تُو میری موت پہ رکھ اپنا اختیار مگر
میں خود جیوں جسے مجھ کو وہ زندگانی دے
وہ شادماں ہی سہی میرے درد سے یارب
کسی کے درد سے مجھ کو نہ شادمانی دے

روزنامہ جناح، 21/2/2010

کیا ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے

پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس وہ کمزور سا بچہ، ڈرائیور ہوٹل کے پچھواڑے میں پڑے کچرے کے ڈھیر کو بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ بچے کچھے کھانوں کا یہ ذخیرہ گزشتہ رات کی موسلا دھار بارش سے ایک ملغوبہ سا بن کر رہ گیا تھا اور اس ملغوبے میں روٹی کے وہ ٹکڑے بھی تحلیل ہو چکے تھے، جن سے (ڈرائیور ہوٹل کے ایک ویٹر کے بقول) اس غریب بچے اور اس کے معذور دادا کا پیٹ پلتا تھا۔ میں نے ویٹر سے پوچھا کہ جب تم جانتے ہو کہ یہ غریب بچہ اور اس کا معذور دادا ہوٹل کی بچی کھچی روٹی سے اپنا پیٹ پالتے ہیں تو تم ان کے لئے روٹی کے یہ ٹکڑے سنبھال کر کیوں نہیں رکھتے۔ کچرے کے ڈھیر میں کیوں پھینک دیتے ہو؟ اس نے بڑی لاپروائی سے جواب دیا کہ ''صاحب ہمارے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہوتا ہے''۔ غور کیجئے کہ روٹی کے ٹکڑے ہوٹل کے باہر کچرے کے ڈھیر میں پھینکنے کا وقت تو ہے، لیکن وہیں ہوٹل کے اندر اس معصوم بچے کے لئے سنبھال کر رکھنے کا وقت نہیں ہے؟ مجھے اس پر غصہ تو بہت آیا لیکن یہ سوچ کر خاموشی اختیار کر لی کہ وقت کی کمی کا یہ مسئلہ تو پورے پاکستان بلکہ پوری دنیا کو درپیش ہے۔

یونیورسٹی آف ایری زونا کے پروفیسر ٹیموتھی جونز کے ایک سروے کے مطابق دنیا ہر سال اپنا آدھا کھانا ضائع کر دیتی ہے۔ صرف امریکہ میں ہر 12 مہینوں کے دوران 100 ارب امریکی ڈالر کا کھانا ضائع کر دیا جاتا ہے اور ایک برطانوی فلاحی تنظیم ''فیئر شیئر'' (Fair Share) کے اعداد و شمار کے مطابق برطانیہ میں ہر سال ضائع ہونے والے کھانے کی مالیت 18 ارب پاؤنڈ اسٹرلنگ ہے (برطانیہ میں ہر سال ایک کروڑ ستر لاکھ ٹن کھانا کچرے کے ڈھیر میں چلا جاتا ہے جس میں سے چالیس لاکھ ٹن کھانے کے قابل ہوتا ہے)۔ برطانیہ کے لوگوں نے گزشتہ دس برس میں جو کھانا ضائع کیا وہ برطانیہ کے کل کھانے کا 15 فیصد ہے جبکہ پاکستان کے لوگ ہر سال اپنا 25 فیصد کھانا کچرے کے ڈھیر میں پھینک دیتے ہیں۔

ایک طرف تو یہ عالم ہے اور دوسری طرف دنیا میں ہر سال 91 لاکھ 25 ہزار لوگ خوراک کی کمی کے باعث لقمہ اجل بن جاتے ہیں جن میں 58 لاکھ 40 ہزار بچے بھی شامل ہیں جن کی عمر 5 سال سے کم ہوتی ہے۔یعنی ہر ساڑھے تین سیکنڈ میں ایک انسان اور ہر ساڑھے پانچ سیکنڈ میں ایک معصوم بچہ بھوک کے ہاتھوں ہلاک ہو رہا ہے۔مناسب مقدار میں خوراک نہ ملنے سے بچوں میں پائی جانے والی بیماریاں اتنی شدت اختیار کر لیتی ہیں کہ ان پر قابو پانا ممکن نہیں رہتا۔مثلاً پر عالمی ادارہء صحت کے 2005 کے اعداد و شمار کے مطابق ڈائریا سے ہلاک ہونے والے ہر 100 بچوں کو ضرورت کے مطابق کھانا مل جائے تو ان میں سے 61 بچ جائیں۔اسی طرح ملیریا اور نمونیا کے شکار بچوں میں بالترتیب 57 فیصد اور 52 فیصد بچے ایسے ہوتے ہیں جن کی غذائی ضرویات پوری کر دی جائیں تو وہ ان بیماریوں سے ہلاک نہیں ہو سکتے۔

اقوام متحدہ کے ادارہ برائے خوراک وزراعت کی رپورٹ کے مطابق گزشتہ 30 برس کے دوران آبادی میں 70 فیصد اضافے کے باوجود دنیا کی زرعی پیداوار اتنی بڑھی کہ ہر شخص کے حصے میں آنے والے حراروں میں 17 فیصد اضافہ ہوا،اس کے باوجود تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق دنیا کے 85 کروڑ 40 لاکھ لوگ خوراک کی کمی کا شکار ہیں (جن میں 7 کروڑ کے لگ بھگ پاکستانی شامل ہیں) اور ظاہر ہے کہ اس کی ایک اہم وجہ بھی وہ کھانا ہے جو ہم ضائع کر دیتے ہیں۔

اگر دنیا کے لوگ اتنا ہی کر سکیں کہ اپنا فالتو کھانا ضائع نہ ہونے دیں تو بچے کھچے کھانے کی صورت کچرے کے ڈبوں میں ڈالے جانے والے کھربوں ڈالر کے علاوہ بھوک اور خوراک کی کمی کے باعث بیمار لوگوں کے علاج معالجہ پر خرچ ہونے والی خطیر رقم بھی بچائی جا سکتی ہے،جس سے خوراک کی کمی کو کسی دقّت کے بغیر پورا کیا جا سکتا ہے۔بچے کھچے کھانے کو ضائع ہونے سے بچا کر ہم اپنے ماحول کو بھی ایک بڑے نقصان سے بچا سکتے ہیں۔وہ اس طرح

کہ جتنا کم کھانا ضائع ہوگا اتنا ہی کم کھانا گلے سڑے گا اور اتنی ہی کم میتھین گیس پیدا ہوگی جو ماحول کے لئے بڑی نقصان دہ ہوتی ہے۔

کیا ہمارے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ ہم اپنی پلیٹ میں اتنا ہی کھانا ڈالیں جتنا کھا سکیں؟ کھانا ضائع ہوتے ہوئے دیکھ کر کم از کم اتنا ضرور سوچ لیا کیجئے کہ روٹی کے چند فالتو ٹکڑوں کا مسئلہ جو ہمارے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا، بے شمار لوگوں کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔اس سنگین مسئلے کے حل کے لئے دنیا بھر میں جدوجہد شروع کی جا چکی ہے۔ برطانوی فلاحی تنظیم 'فیئر شیئر' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کے ممبران شہر بھر کے ہوٹلوں، شادی ہالوں اور ایسی تمام جگہوں کے ساتھ مسلسل رابطے میں رہتے ہیں جہاں بچے کھچے کھانے کی بھاری مقدار کچرے کے ڈھیر میں ڈالے جانے کا امکان ہوتا ہے، تنظیم کی گاڑیاں یہ فالتو کھانا اٹھا کر لے آتی ہیں جسے ڈبوں میں نفاست کے ساتھ پیک کر کے ان غریب لوگوں کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے جو کھانا خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔اس تنظیم نے اپنے قیام کے پہلے ہی سال 18 ہزار ٹن کھانا ضائع ہونے سے بچا کر 12 ہزار غریب لوگوں میں اس طرح تقسیم کیا کہ ہر شخص کو 208 مرتبہ پیٹ بھر کر کھانے کو ملا۔اس کارِ خیر میں کیا ہمیں بھی فوری طور پر شامل نہیں ہو جانا چاہیے؟

ایک دوست کی یاد آ رہی ہے جس کے ساتھ ہوٹل میں بھی کھانا کھانے کا موقع ملتا رہتا ہے اور گھر میں بھی۔ وہ ہوٹل میں بچنے والے اپنے کھانے کا پارسل بنوا کر وہاں سے واپسی پر کسی ضرورت مند کو محبت سے پیش کر دیتا ہے اور گھر میں بچنے والے کھانے سے آئے روز کسی نہ کسی غریب کی دعوت کرتا رہتا ہے۔ کاش ہم بھی اس کے نقشِ قدم پر چل سکیں تاکہ آئندہ کسی معصوم کو کچرے کے ڈھیر کی طرف حسرت سے نہ دیکھنا پڑے۔ کیا ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے؟

روزنامہ خبریں، 13/8/2006

بڑے خودکش بمباروں سے چھوٹے خودکش بمباروں تک

''اوھکا''(OHKA) جاپان کا تیار کردہ خودکش جہاز تھا جس میں تین راکٹ لگے ہوتے تھے اور جو 2646 پاؤنڈ وزنی تیز دھماکہ خیز مواد اپنی ناک میں اٹھا کر اڑ سکتا تھا، اس چھوٹے سے جہاز کو (جس میں بمشکل ایک آدمی بیٹھتا تھا) ایک بڑا بمبار جہاز اٹھا کر ہدف کے قریب لے جاتا اور چھوڑ دیتا، اوھکا 220 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑتا ہوا جب ہدف کے اور بھی قریب پہنچتا تو اس کا پائلٹ اسکی راکٹ موٹرز کو آن کر دیتا جس کے بعد یہ 600 میل فی گھنٹہ کی طوفانی رفتار سے (اپنے پائلٹ سمیت) امریکی بحری جہازوں سے ٹکرا کر انہیں پاش پاش کر دیتا۔ دوسرے خودکش جہاز کو ''کیٹن''(KAITEN) کہتے تھے جسکی لمبائی 48 فٹ تھی اور جو 3400 پاؤنڈ دھماکہ خیز مواد اٹھا کر اڑنے کی استطاعت رکھتا تھا، اسے اڑانے والا بھی اس کے ساتھ ہی ''شہید'' ہو جاتا تھا۔ یہ تو تھے فضائیہ کے خودکش حملہ آور، اب آیئے نیوی اور آرمی کی طرف، ''شینیو''(SHINYO) اس خودکش موٹر بوٹ کا نام تھا جو اتنی تیزی کے ساتھ اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھتی تھی کہ اسے نشانہ بنانا تقریباً تقریباً ناممکن ہوتا تھا، اس پر بھی ایک ہی شخص بیٹھتا تھا جو اسے امریکی بحری جہازوں کے ساتھ ٹکرا کر اپنے ساتھ ساتھ انہیں بھی نیست و نابود کر دیتا تھا، ''کیریو''(KAIRYU) ایک خودکش آب دوز ہوا کرتی تھی اور اس کا کام بھی اپنے سوار سمیت ہدف سے ٹکرانا تھا، ''فکیوریو''(FUKURYU) اس جاپانی تیراک کو کہا جاتا تھا جو اپنے جسم کے ساتھ بم باندھ کر ٹارگٹ سے ٹکرا جاتا تھا اور ''نیکاکو''(NIKAKU) اس خودکش بمبار (سپاہی) کو کہتے تھے جو دھماکہ خیز مواد کے ساتھ رینگتے رینگتے امریکی ٹینکوں یا دوسری فوجی گاڑیوں کے نیچے پھٹتا تھا۔

دوسری جنگِ عظیم میں جاپانیوں نے خودکش حملوں کے لیے کل ملا کر 750 اوھکا جہاز، 9200 شینیو موٹر بوٹ (جن میں سے 6200 نیوی اور 3000 آرمی کے لیے تھیں)، 300 کیریو آب دوزیں اور بے شمار 'فکیوریو' اور 'نیکاکو' (خودکش بمبار) تیار کیے اور

جب انہیں استعمال کرنا شروع کیا تو امریکہ کے اوسان خطا ہو گئے، اسی لیے تو ہیروشیما اور ناگا سا کی پر ایٹم بم گرے اور جاپان کو وہ چوٹ لگی جس کی ٹیس قیامت تک ختم نہیں ہو گی، یہی وہ مقام تھا جس سے جاپانیوں کی تاریخ کا وہ نیا باب شروع ہوا جس نے جاپان کو سائنسی، معاشی اور معاشرتی تعمیر و ترقی کی اس سطح پر لا کھڑا کیا کہ اس کے پاس اسلحہ بارود ہے نہ خودکش بمبار لیکن کوئی اس کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرات نہیں کرتا، جس امریکہ کو سینکڑوں بلکہ ہزاروں خودکش جہازوں، موٹر بوٹوں، آبدوزوں اور حملہ آوروں پر مشتمل ایک بڑی ہی مضبوط اور فعال آرمی بھی حساب کتاب میں نہ لا سکی، وہی امریکہ جی ڈی پی، جی این پی، فی کس آمدن اور انسانی ترقی کے اعداد و شمار سے ''ہنڈز اپ'' ہو گیا۔ اس سنہرے دور تک پہنچنے کے لیے جاپانیوں نے تین کام کیے، پہلا یہ کہ اپنی شکست تسلیم کی، دوسرا یہ کہ اپنے لیے ایک نئی منزل کا تعین کیا اور تیسرا یہ کہ اپنے ملک میں وہ ثکافتی انقلاب برپا کیا جو نئی منزل تک پہنچنے میں فیصلہ کن کردار ادا کر سکتا ہے۔

جاپانیوں نے یہ جان لیا کہ جب تک سائنس و ٹیکنالوجی کی راہ نہیں اپنائی جائے گی، تحقیق و تخلیق کا دامن نہیں تھاما جائے گا، اندھی تقلید و بھیڑ چال سے کنارہ کشی نہیں اختیار کی جائے گی، تب تک ایک خودمختار و باوقار قوم کی شکل میں نہیں ابھرا جا سکتا۔ اور یہ مان لیا کہ جس منزل کا خواب وہ دیکھ رہے ہیں وہاں پہنچانے میں کلیدی کردار سائنسدان اور مفکرین ہی ادا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ان ''اربابِ عقل و فکر'' کو کچھ اسطرح اپنا (Celebriti) سلیبرٹی بنا لیا کہ تقاریب میں انہی کو مہمانِ خصوصی کے طور پر بلایا جاتا، یومِ آزادی پر انہی کے پیغامات نشر کیے جاتے، میڈیا انہی کی خبروں سے بھرا ہوتا، سب سے زیادہ تنخواہیں بھی انہی کو دی جاتیں، ڈراموں اور فلموں میں بھی سائنس و ٹیکنالوجی کی اہمیت کو اجاگر کیا جاتا، الغرض پورے کا پورا معاشرہ سائنس و ٹیکنالوجی کے گیت گانے لگا۔ اس ثکافتی انقلاب سے ہوا یہ کہ جاپانی بچوں میں خود بخود تحقیق و تخلیق کا ایک بڑا ہی زبردست قسم کا رجحان پیدا ہو گیا (اور وہ وقت بھی

آیا کہ پرائمری سکولوں کے بچے ڈیجیٹل گھڑیاں بنانے لگے) جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 50 سال میں ہی جاپانی دنیا پر چھا گئے اور انہوں نے اپنے خوابوں کا آفتاب اپنے ہاتھوں سے حقیقت کی دنیا میں اچھال دیا جس کی کرنوں سے انکی تقدیر کے اندھیرے یکدم اجالوں میں تبدیل ہو گئے۔

یہ تھی بڑے خودکش بمباروں کی کہانی ، اب آیئے چھوٹے خودکش بمباروں کی طرف جو کوئی اور نہیں بلکہ ہم لوگ خود ہیں۔ چھوٹے خودکش بمباروں کی بات چلتی ہے تو اس ''نادان'' کی یاد آجاتی ہے جس کے سامنے کوئی آگ میں ہاتھ ڈال کر اپنی انگلیاں جلا لیتا ہے لیکن وہ پھر بھی آگ میں ہاتھ ڈالنے سے باز نہیں آتا تا آنکہ اسکی انگلیاں بھی جل جاتی ہیں۔

ہمارا پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ ہم اپنی غلطی ہی تسلیم کرنے کو تیار نہیں جس کے بغیر سدھرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم یہ بھی نہیں سوچتے کہ یہ جو ہمارے یہاں آٹے چینی کی ذخیرہ اندوزی ہوتی ہے اس کا ذمہ دار کیا امریکہ ہے؟ ہم نے اپنے پانی اور کوئلے کے بے شمار ذخائر کو بجلی میں تبدیل نہیں کیا تو اسکی وجہ کیا بھارت ہے؟ ہمارے یہاں کثرت سے بننے والی غیر معیاری اور جعلی ادویات ، کیا یہود و ہنود کی ملی بھگت کا نتیجہ ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہی نہیں کہ ہماری منزل کیا ہے؟ 62 برس گزرنے کے باوجود ہم یہی فیصلہ نہیں کر سکے کہ ہمیں جانا کہاں ہے؟ اگر ہمیں جمہوری ملک بننا تھا تو ہمارے یہاں ہر سطح پر انتہا پسندی اور آمریت کیوں پلتی رہی اور پل رہی ہے؟ اگر ہم قوم ہیں تو ہم میں یکجہتی کیوں نہیں اور ہم رنگ ونسل کے دلدل میں کیوں دھنسے ہوئے ہیں؟ اگر ہم مسلمان ہیں تو ہماری اسلامیات الگ الگ کیوں ہے؟ اگر ہم فرقوں کو نہیں مانتے تو سکولوں میں داخلے اور سرکاری ملازمتوں میں بھرتی کے فارموں میں فرقے کا خانہ کیوں بنا ہوا ہے؟ اگر ہمارا ملک غریب ہے تو شاہ خرچیوں اور عیاشیوں سے باز کیوں نہیں آتے ؟ اور تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں ہماری تاریخ کے بدترین بحران سے نکالنے کے لیے سائنسدانوں اور مفکرین کی ضرورت ہے لیکن ہم نے ایکٹروں اور

کرکٹروں کو اپنا قومی ہیرو بنایا ہوا ہے؟ یومِ آزادی پر قومی یکجہتی کی اپیل کرنی ہو، پولیو کے قطرے پلانے ہوں، بجلی کی بچت کا پیغام دینا ہو، ہر طرف ایکٹر یا کرکٹر ہی چھائے ہوتے ہیں؟ (اور تو اور) فلسفیانہ نوعیت کے موضوعات پر بھی ان حضرات سے رائے زنی کروائی جاتی ہے، سب سے زیادہ معاوضہ بھی یہی لوگ لیتے ہیں، انکے علاوہ ہمارے ملک میں اگر کسی کے وارے نیارے ہیں تو وہ سول اور ملٹری بیوروکریسی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بچے بالعموم ''سبھی کچھ'' بننا چاہتے ہیں لیکن ''اربابِ عقل وفکر'' میں شامل نہیں ہونا چاہتے جن کے حالات سب سے خراب ہیں، اسی لیے تو ہم بھیڑ چال اور اندھی تقلید کے موذی مرض میں مبتلا ہیں، ہمارے یہاں تحقیق وتخلیق نہ ہونے کے برابر ہے اور سائنس وٹیکنالوجی کو شجرِ ممنوعہ کا درجہ حاصل ہے۔

کاش ہم جاپانیوں کی تاریخ سے سبق سیکھیں اور اسلحہ و بارود کے کلچر کو خیر آباد کہہ کر امن و محبت کی تہذیب کو اپنائیں؟ کاش ہم پر گرنے والے مہنگائی، غربت، لوڈ شیڈنگ، عدم تحفظ، افراتفری، کرپشن اور آمریت کے ایٹم بم ہماری تاریخ میں نئے باب کا اضافہ کریں اور ہم بھی کسی سنہرے دور میں داخل ہوسکیں لیکن اس کے لیے ہمیں غلطیوں کو تسلیم کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا ہوگا، ایک نئی منزل کا خواب دیکھنے کی جرات دکھانا ہوگی اور سائنس وٹیکنالوجی کو اپنی ثکافت میں داخل کرنے کی جدوجہد سے گزرنا ہوگا، اگر ہم یہ تینوں کام کرنے میں کامیاب ہو گئے تو کچھ عجب نہیں کہ ہم بھی اپنے خوابوں کا سورج اپنے ہاتھوں سے حقیقت کی دنیا میں اچھال دیں جس کی شعاعوں سے ہمارے نصیب کی تاریکی بھی یکدم روشنی میں تبدیل ہوجائے۔

روزنامہ جناح، 2009

دربدری کی عمر قید

خانہ بدوش چرواہوں کو ملنے سے پہلے ان کا ذکر ہوتے ہی برف پوش پہاڑ، اجلی نیلی جھلیں، ٹھنڈے میٹھے چشمے، ہری بھری وادیاں اور وسیع وعریض سبزہ زار نگاہوں میں گھوم جاتے تھے، میں سمجھتا تھا کہ ان جیسی حسین زندگی اور کس کی ہوسکتی ہے اور سوچتا تھا کہ یہ لوگ اپنی زندگی سے کتنی محبت کرتے ہونگے لیکن حقیقت کچھ اور ہی تھی۔

خانہ بدوش چرواہوں کی زندگی کئی اعتبار سے انکے مویشیوں سے بھی بدتر ہوتی ہے کہ انکے مویشی ان سے بہتر خوراک کھاتے ہیں، ان سے زیادہ آرام کرتے ہیں اور ان سے زیادہ صحت مند ہوتے ہیں۔ پھر مویشیوں کی دیکھ بھال تو چرواہے کرتے ہیں لیکن چرواہوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ باتیں مجھے خانہ بدوش چرواہوں کے ایک کنبے سے معلوم ہوئی تھیں جو ڈڈیال (میر پور) سے وادی نیلم اور گلگت کی سرسبز وشاداب چراہ گاہوں کی جانب رواں دواں تھا۔ یہ کنبہ تیرہ نفوس پر مشتمل تھا جن میں بلور خان کی بیوی کے علاوہ انکے چھ بچے دو بہوئیں اور تین پوتے شامل تھے۔ اس کنبے کی کل کائنات چالیس بھیڑ بکریاں تین خچر اور چار گھوڑیاں تھیں۔ ایک بڑی خوبصورت گھوڑی گزشتہ روز پیدا ہوئی تھی جسکی وجہ سے ان لوگوں کو راولاکوٹ میں قیام کرنا پڑا اور ہماری ملاقات ہوگئی جو کافی دیر تک جاری رہی۔ اس دوران رات کا کھانا بھی پکایا اور کھایا گیا جو روکھے سوکھے چاولوں اور بکری کے دودھ کی چائے پر مشتمل تھا۔ میں چائے نہیں پیتا چنانچہ میرے لئے قہوہ تیار کیا گیا جس میں بطور خصوصی دو الاچیاں بھی ڈالی گئیں۔ کھانا پکانے کے لئے جو چولہا کام آیا وہ لوہے کی پتلی سلاخ کو موڑ توڑ کر تیار کیا گیا تھا، ایندھن کے طور پر آس پاس سے اکٹھی کی گئی سوکھی لکڑیاں استعمال کی گئیں۔

بلور خان بتا رہے تھے کہ وہ ہر سال دس پندرہ بھیڑ بکریاں بیچ کر ساٹھ ستر ہزار روپے کماتے ہیں جن سے سال بھر کے اخراجات پورے کرنے ہوتے ہیں۔ یعنی تیرہ افراد کو ہر مہینے پانچ سے چھ ہزار روپے میں گزارا کرنا پڑتا ہے۔

اکثر خانہ بدوش اپنی پیدائش کی تاریخ اور جگہ کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے، بلور خان بھی اتنا ہی جانتے تھے کہ وہ ڈڈیال اور گلگت کے درمیان کسی روز کہیں پیدا ہوئے، البتہ یہ بات انہوں نے پورے وثوق سے کہی کہ ان کی پیدائش پر انکی والدہ کو آرام کا اتنا موقع نہیں ملا ہوگا جتنا ننھی گھوڑی کی ماں کو ملا کیونکہ گھوڑے کے بچے کو اٹھا کر چلا نہیں جا سکتا اور خود چلنے کے لئے اسے کم از کم چوبیس گھنٹے درکار ہوتے ہیں جبکہ انسان کے بچے کو اٹھا کر معمول کا سفر جاری رکھا جا سکتا ہے۔

بلور خان کے والد کالا خان قیامِ پاکستان کے بعد راجوری (مقبوضہ کشمیر) سے ہجرت کر کے آزادی کی خاطر آزاد کشمیر آئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ آزادی سے پہلے ان کے پاس اتنی جگہ تھی کہ جس میں کئی مکان بنائے جا سکتے تھے لیکن آزادی کے بعد اتنی بھی نہیں تھی کہ جس میں قبر بنائی جا سکتی۔ انکی موت نے انہیں تو دکھوں اور تکلیفوں سے رہائی دلا دی لیکن انکی نسلیں آج بھی غربت، بھوک اور بیماری کی چکی میں پس رہی ہیں۔ بلور خان کے بڑے بیٹے اقبال نے بتایا کہ انہوں نے زندگی میں کبھی خوشی کا ایک پل بھی نہیں دیکھا تو مجھے انکی بات پر یقین نہ آیا لیکن جب انہوں نے کھلے آسمان کے نیچے سخت زمین پر زہریلے کیڑے مکوڑوں کی زد میں مویشیوں کی طرح پڑے ہوئے اپنے کنبے کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے پوچھا کہ صاحب! جسکے ماں باپ، بہن بھائیوں اور بیوی بچوں کو سارا سارا سال اس طرح گزارنا پڑے اسکی زندگی میں خوشی کا پل کہاں سے آ سکتا ہے؟ تو میں لاجواب ہو گیا۔

اقبال نے اس عام تاثر کی بھی تردید کی کہ چرواہوں کے پاس انکی ہر بیماری کا دیسی علاج ہوتا ہے۔ سر درد، کھانسی، نزلہ، بخار وغیرہ کا علاج تو یہ لوگ ڈسپرین، اسپرین، اور پینا ڈول وغیرہ سے (اپنے طور پر) ہی کرتے رہتے ہیں لیکن کسی سنجیدہ بیماری سے نجات کے لئے انہیں بھی اچھے ڈاکٹر کی ضرورت ہوتی ہے جو عام طور پر انکی دسترس میں نہیں ہوتا۔

یہ بتاتے ہوئے کہ خانہ بدوش چرواہے اتنے اذیت ناک حالات سے دوچار ہیں کہ

انکا بس چلے تو ایک لمحے میں اپنے آبائی پیشے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر آباد کہہ دیں، اقبال کی آواز بھر آئی۔ بات بدلنے کے لئے میں نے گریس اور دیوسائی کے جنت نظیر سبزہ زاروں کا ذکر چھیڑ دیا، انکی توجہ اس جمیل وجلیل چاندنی کی جانب مبذول کرانا چاہی جو سبزہ زاروں میں بکھرے اوس کے پاکیزہ وشفاف قطروں کو موتیوں کی طرح جگمگا دیتی ہے، انہیں وہ سرگوشیاں سنانے کی کوشش کی جو وادی نیلم کے مہکتے دیودار دریائے نیلم کے اجلے نیلے پانیوں کی بھیگی ہوا سے کرتے ہیں اور ان سے پوچھا کہ اپنے پیشے کو خیر آباد کہنے کے بعد کیا آپ کو یہ سب یاد نہیں آئیں گے؟ وہ بولے کہ صاحب یہ جتنے بھی پیارے ہوں ہمارے بچوں سے پیارے تو نہیں ہو سکتے، اور اسکے بعد میں اقبال سے کچھ نہ پوچھ سکا۔

بلور خان کے کنبے سے ملاقات کے گھنٹے، منٹوں میں گزر گئے۔ یہ سیدھے سادے سے لوگ مجھے بڑے اچھے لگے، ان کا تو کوئی پتہ ہوتا نہیں البتہ میں نے انہیں اپنا پتہ ضرور دیا لیکن انہوں نے کبھی رابطہ نہ کیا۔ میں ان لوگوں کے لیے ایک کالم لکھنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکا لیکن اسکے بعد جب بھی کوئی خانہ بدوش چرواہا ملتا ہے اس سے بلور خان کے بارے میں ضرور پوچھتا ہوں کہ یہ لوگ ہر وقت میرے دل ودماغ میں کہیں نہ کہیں موجود رہتے ہیں۔ دو تین برس تک تو انکی کوئی اطلاع نہ ملی لیکن پھر کھوٹہ کے قریب ملنے والے ایک خانہ بدوش چرواہے نصیر نے بتایا کہ بلور خان سفر کے دوران جسطرح پیدا ہوئے تھے ویسے ہی فوت بھی ہو گئے اور انکی قبر بھی انکے والد کی طرح ڈڈیال اور گلگت کے درمیان کہیں ہے۔ اس خبر سے مجھے یوں لگا جیسے میرا کوئی بڑا ہی پیارا عزیز مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔ میں نے نصیر کے ذریعے بلور خان کے بیٹے کے لیے تعزیتی کلمات کے علاوہ اپنا موبائل نمبر تو بھجوایا لیکن کیا معلوم اس سے ملاقات ہو پاتی ہے یا نہیں؟

میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ کیا خانہ بدوش چرواہے ہمارے جیسے انسان نہیں؟ تو پھر وہ جانوروں جیسی زندگی کیوں گزار رہے ہیں؟ کیا وہ ہمارے ملک کے شہری نہیں؟ تو پھر انہیں

شہریوں جیسی مراعات کیوں حاصل نہیں؟ کیا ہمارا ملک انکا ملک بھی نہیں؟ تو پھر انہیں آج تک انکی قبر کے برابر جگہ کی ملکیت بھی کیوں نہیں دی گئی؟

خانہ بدوش چرواہے ایک ایسی سزا کاٹ رہے ہیں جس سے نجات موت کے بعد ہی ممکن ہوتی ہے۔ کاش دربدری کی اس عمر قید سے انہیں انکی زندگی میں رہائی نصیب ہو سکے۔

روزنامہ خبریں، 8/9/2006

اپنے حصے کی شمع

انکا نام فلیمنگ تھا اور وہ سکاٹ لینڈ کے ایک غریب کسان تھے۔ کھیتوں میں خون پسینہ ایک کرتے ہوئے انہیں ایک روز کسی بچے کی چیخ و پکار سنائی دی جو مدد مانگ رہا تھا۔ انہوں نے کھیتی باڑی کے اوزار وہیں پھینکے اور اس طرف بھاگنا شروع کر دیا جہاں سے بچے کی آوازیں آ رہی تھی۔ انہیں اس دلدل تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی جہاں ایک معصوم، زندگی کے ہاتھوں سے دھیرے دھیرے پھسلتا ہوا موت کی آغوش میں جا رہا تھا۔ وہ بری طرح سہما ہوا تھا، باہر نکلنے کی جتنی کوشش کرتا تھا اتنا ہی اندر دھنستا تھا۔ جب فلیمنگ وہاں پہنچے وہ دلدل میں اپنی کمر تک دھنس چکا تھا۔ فلیمنگ نے اسے بچا لیا۔

اگلے روز ایک عالیشان گھوڑا گاڑی فلیمنگ کے دروازے پر آ کر رکی، اس میں سے ایک بڑا ہی امیر کبیر اور باوقار شخص اتر کر فلیمنگ کے پاس آیا اور بولا کہ میں اس بچے کا باپ ہوں جسے آپ نے بچایا، آپ نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ میں مر کر بھی بدلہ نہیں چکا سکتا لیکن مجھے بتایئے کہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ فلیمنگ نے جواب دیا کہ آپ کی بڑی مہربانی لیکن بچے کی مدد کرتے ہوئے مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کسی دولتمند کا بیٹا ہے، میں نے اسے کسی صلے کی غرض سے نہیں بچایا اور نہ ہی مجھے اب کوئی صلہ چاہیے۔

اسی دوران اس کمرے کے دروازے پر ایک لڑکا آ کر کھڑا ہوا جہاں گفتگو جاری تھی، اُسے دیکھ کر اس شخص نے فلیمنگ سے پوچھا کہ کیا یہ آپ کا بیٹا ہے؟ انہوں نے بڑے فخر کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا اور وہ شخص بولا کہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں آپ کے بیٹے کو بھی ان اداروں سے تعلیم دلواؤں جہاں میرا اپنا بیٹا پڑھے؟ اس طرح مجھے یہ اطمینان حاصل ہوگا کہ میں اس غیور شخص کے بیٹے کے لیے کچھ اچھا کر سکا جس نے میرے بیٹے کی جان بچائی اور اگر اس بچے میں اپنے باپ کے گُن ہوئے تو پڑھ لکھ کر یہ یقیناً ایک بڑا آدمی بنے گا اور ہم دونوں اس پر فخر کر سکیں گے؟ کیا آپ مجھے اس خوشی سے محروم رکھنا چاہیں گے؟ اس پُرخلوص آفر کو

فلیمنگ جھجک کے باوجود ٹھکرا نہ سکے اور اس شخص نے انکے بیٹے کے لیے بھی تعلیم کا وہ بہترین انتظام کر دیا جو اپنے بیٹے کے لیے کیا تھا، بچہ پڑھتا اور آگے بڑھتا چلا گیا، لندن کے سینٹ میریز میڈیکل سکول سے 1908 میں گولڈ میڈل کے ساتھ فارغ التحصیل ہونے والے اسی بچے نے پنسلین دریافت کی اور الیگزنڈر فلیمنگ کے نام سے مشہور و معروف ہوا۔ وہی الیگزنڈر فلیمنگ جسے 1945 میں طب کے نوبل انعام سے بھی نوازا گیا۔ باپ نے ایک بچے کو بچایا اور بیٹے نے نجانے کتنے ہی بچوں کو بچانے کا سامان پیدا کر دیا۔

یہ کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی بلکہ اس سے بھی خوبصورت موڑ میں داخل ہو جاتی ہے جب امیر شخص کے بیٹے کو نمونیا ہو جاتا ہے اور الیگزنڈر فلیمنگ کی ایجاد کردہ دوا کے باعث اسے ایک مرتبہ پھر نئی زندگی ملتی ہے۔ امیر شخص نے غریب کسان کے بیٹے کی تعلیم کا بندوبست نہ کیا ہوتا تو پنسلین کیسے ایجاد ہوتی اور اس کا بیٹا دوسری مرتبہ کیسے بچتا؟ کیسی روح پرور کہانی ہے جو اس وقت اور بھی ناقابلِ فراموش ہو جاتی ہے جب یہ پتہ چلتا ہے کہ جس امیر شخص کے بیٹے کو دو نئی زندگیاں ملیں، اس کا اور اس کے بیٹے کا نام کیا تھا؟ ان کا نام تھا رینڈولف چرچل اور انکے بیٹے کا نام تھا ونسٹن چرچل۔ جی ہاں وہی چرچل جو 50 برس تک برطانیہ کے سیاسی افق پر روشن ستارے کی طرح چمکتے دمکتے رہے۔ کئی مرتبہ وزیر رہے، 1940 سے 1945 تک وزارتِ عظمی پر فائز ہوئے، 1945 سے 1951 تک اپوزیشن لیڈر رہے اور پھر 1951 سے 1955 تک کے لیے ایک مرتبہ پھر وزیرِ اعظم منتخب ہوئے۔ ونسٹن چرچل نے سیاست میں ہی نہیں بلکہ علم و ادب میں بھی اپنا لوہا منوایا اور 1953 میں ادب کا نوبل انعام بھی حاصل کیا۔ وہ ابرڈین، ایڈن برو اور برسٹل کی یونیورسٹیوں کے ریکٹر اور چانسلر بھی رہے۔

الیگزنڈر فلیمنگ اور ونسٹن چرچل کی یہ کہانی 1999 میں پہلی مرتبہ ''انٹر۔نٹ'' کے ذریعے منظرِ عام پر آئی جس سے یہ سبق سکھانے کی کوشش کی گئی کہ ہم جو کچھ دوسروں تک بھیجتے ہیں وہی ہم تک واپس بھی آتا ہے، لہذا ہمیں دوسروں تک کچھ اچھا ہی بھیجنا چاہیے تا کہ ہم تک

بھی کچھ اچھا ہی پہنچے۔اس کہانی سے اختلاف کرنے والے اس قسم کے دلائل پیش کرتے ہیں کہ چرچل اپنے بچپن میں کبھی کسی دلدل میں گرے ہی نہیں اور ان کے میڈیکل ریکارڈ کے مطابق انہیں نمونیہ سے بچانے والی دوا بھی پنسلین نہیں تھی لیکن اس کہانی کی تاثیر ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔اس سے متاثر ہوکر چند ہی روز قبل میرے ایک دوست نے اپنا نام ظاہر نہ کرنے کی خصوصی ہدایت کے ساتھ ایک غریب بچے کی تعلیم کے اخراجات اس وقت تک اٹھانے کا ذمہ لے لیا جب تک وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہیں ہو جاتا اور امپیریل میڈیکل کالج لندن میں زیرِ تعلیم میری بھانجی ریئم خان نے میرے گھر میں کام کرنے والی ایک بڑی ہی غریب لیکن بڑی ہی عظیم خاتون کے بچے کی ''اچھی'' تعلیم کا خرچ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے ذمے لے لیا۔پہلے 12 مہینوں کی فیس ریئم نے مجھے دے بھی دی ہے تاکہ میں ہر مہینے اسے باقاعدگی سے ادا کرتا رہوں اور یہ فیس ریئم نے اپنے والدین سے لے کر نہیں دی بلکہ اپنی اس کمائی سے دی جو میڈیکل کالج سے چھٹیوں کے دوران ایک ہسپتال میں اسسٹنٹ کی ملازمت کر کے حاصل ہوئی۔

میرے دوست اور ریئم خان نے اپنا اپنا کام کر دیا تو میرے ذہن میں اپنے حصے کی شمع کچھ اسطرح جلانے کا خیال پیدا ہوا کہ کچھ اچھے دوستوں کے مشورے اور معاونت سے ایک فلاحی تنظیم ''فرینڈ اِن نیڈ'' (FIN) کی بنیاد رکھ لی تاکہ اچھائی کی ترویج کو بڑے پیمانے پر منتقل کرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ موثر بھی بنایا جا سکے۔اس بارے میں کسی اور وقت تفصیل سے بات کریں گے فی الحال بس یہی کہنا ہے کہ اگر ہم میں سے ہر کوئی احمد فراز کے بقول ''شکوہءِ ظلمتِ شب'' کے بجائے ''اپنے حصے کی کوئی شمع'' جلانا شروع کر دے تو یقین مانیے کہ دنیا کی تاریکی کو مٹنے میں زیادہ دیر نہ لگے۔

روزنامہ جناح،16/4/2009

عورت،اسلام اور روایات

وہ رسم جسے نبی ءآخرالزماں نے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل ختم کر دیا تھا اسے آپؐ کے چاہنے والوں نے اپنی روایات کے ذریعے آج بھی زندہ رکھا ہوا ہے، وہ منظر جسکے بارے میں سن کر بھی رحمتِ عالمؐ اشکبار ہو جایا کرتے تھے اسے دیکھ کر بھی آپؐ کے نام پر مرنے مارنے کو تیار آپؐ کے امتی ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

مظلوم،معصوم، بے بس اور نہتی عورتوں کی زندہ درگوری نے میری روح تک کو گھائل کر کے رکھ دیا تھا لیکن بلوچستان میں رونما ہونے والے اس واقعہ پر آج سے پہلے کچھ لکھا اس لیے نہیں کہ اس کے خلاف آواز اٹھانے والوں پر تنقید کرتے ہوئے بلوچ رہنما سینیٹر جان جمالی نے فرمایا تھا کہ یہ لوگ دراصل بلوچ روایات سے واقفیت نہیں رکھتے۔تو میں نے سوچا کہ پہلے بلوچ روایات سے واقفیت حاصل کر لینی چاہیے اور اس مقصد کے لیے جن مستند ترین کتب کے مطالعے کا بتایا گیا ان میں "Sylvia Matheson" کی "Tigers of Baluchistan" سرِ فہرست ہے(سلویا میتھیسن ''بی بی سی'' کی نمائندہ ءخصوصی ہونے کے علاوہ ''وکٹر سیسون فیچر ایجنسی'' کی مینیجنگ ایڈیٹر تھیں، وہ ''یونیورسٹی آف لندن'' میں محقّق کی حیثیت سے بھی کام کرتی رہیں، انہوں نے "leathercraft in Land of Persia","Rajistan,Land of Kings" اور "An Archaelogical Guide" جیسی اہم کتابیں بھی لکھیں)۔

سلویا پانچ برس تک بلوچستان کے صحراؤں میں بھگٹی قبیلے کے ساتھ رہیں جسکے افراد کو روایتی طور پر ''بلوچستان کے شیر'' کہا جاتا ہے اور مری قبیلے کے ساتھ بلوچستان کے ممتاز ترین قبائل میں شمار کیا جاتا ہے۔بھگٹی سردار نے اپنے قبیلے کے ایک جنگجو باڈی گارڈ کے ساتھ سلویا کو ان جگہوں پر جانے کی اجازت بھی دے دی جہاں عام طور پر نہیں جانے دیا جاتا۔سلویا نے بھگٹی عورتوں کے ساتھ نہ صرف ملاقاتیں کیں بلکہ تاریخ میں پہلی مرتبہ ان کی تصاویر بھی بنائیں جو "ٹائگرز آف بلوچستان" کے مختلف صفحات پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

اس کتاب میں سلویا نے آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے جو پہلی مرتبہ برطانیہ میں 1967 اور پاکستان میں 1975 میں شائع ہوئی۔ ایک باب ''محبت کرنے والے۔ زندہ اور مردہ'' (Lovers-Dead and Alive) میں سلویا بلوچوں کے بارے میں لکھتی ہیں کہ بچوں کی شادیاں کیونکہ انکی پیدائش سے پہلے ہی طے کر دی جاتی ہیں اس لیے محبت کرنے والوں کا انجام عموماً انکی موت پر ہی ہوتا ہے، اسکے باوجود محبت کے نغمے شادی شدہ عورتوں کو مخاطب کر کے لکھے جاتے ہیں۔ قبائلی فضل و ہنر کی رو سے تمام جرائم میں سنگین ترین زنا کاری ہے جسکی سزا موت ہوتی ہے اور زنا کاری میں ملوث ہونے کے لیے ذرا سا شک یا ایسی افواہ بھی کافی ہوتی ہے جو مایوس حاسد رقیب یا ٹھکرائی ہوئی پکّی عمر کی عورت نے پھیلائی ہو۔

بھگٹی سردار کے چھوٹے بھائی احمد نواز خان نے سلویا کو بتایا کہ اگر کسی عورت کی نگاہ بھی کسی مرد پر پڑ جائے تو یہ اسے زنا کار ٹھہرانے کے لیے کافی ہوتا ہے، زنا کاری کا الزام کتنا ہی بے بنیاد کیوں نہ ہو لیکن اسکے ذریعے کوئی بھی شوہر اپنی ناپسندیدہ بیوی سے با آسانی نجات حاصل کر سکتا ہے۔ زنا کار مرد کو تلوار سے قتل کر دیا جاتا ہے یا گولی ماردی جاتی ہے جبکہ عورت کو درخت سے لٹک کے پھانسی لگنا ہوتا ہے۔ احمد نواز کی بات پر یقین نہ کرتے ہوئے سلویا نے پوچھا کہ تمھارا مطلب ہے کہ اسے خودکشی کرنی ہوتی ہے؟ وہ بولا جی ہاں اس لیے کہ بیوی کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرنا مرد کی شان کے خلاف ہوتا ہے اور اسے زندہ اس لیے نہیں چھوڑا جا سکتا کہ اس نے شوہر کا نام بدنام کیا ہوتا ہے۔ بعض عورتیں بھاگ کر بڑے سردار کی پناہ میں آ جاتی ہیں جو انہیں اپنے گھر میں حفاظت سے رکھتا ہے اور جب انکی تعداد بڑھ جاتی ہے تو سال میں ایک یا دو مرتبہ انکی نیلامی کر دی جاتی ہے، دور دراز سے آئے ہوئے لوگ انہیں خرید کر لے جاتے ہیں لیکن اس سے پہلے انہیں سردار کے آگے اس بات کی وضاحت کرنی ہوتی ہے کہ وہ ان عورتوں کو شادی کے لیے کیوں خریدنا چاہتے ہیں؟ کچھ رنڈوے ہوتے ہیں جو بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ایسا کرنا چاہتے ہیں، کچھ کو مال مویشی سنبھالنے اور پانی منگوانے کے لیے انکی

ضرورت ہوتی ہے اور کچھ ان سے بیٹے پیدا کرنا چاہتے ہیں لیکن ایک بات طے ہوتی ہے کہ کوئی مرد بھی اس علاقے کے آس پاس کا رہنے والا نہیں ہوتا جہاں کی اسکی خریدی ہوئی عورت ہوتی ہے تا کہ شادی کے بعد اسکی بیوی پرانے شوہر کے لیے ندامت کا باعث نہ بن سکے (صفحات 70,71,72)۔

کیا یہی ہیں وہ روایات جن کا حوالہ جمالی صاحب نے دیا تھا؟ کیوں نہ جمالی صاحب اور ان جیسے دیگر لوگوں کی خدمت میں کچھ حوالا جات قرآن کریم سے بھی پیش کیے جائیں جس پر ہم سب بڑے فخر سے ایمان لانے کا دعوی کرتے ہیں؟ اگر انہوں نے ذرا سی توجہ اور غیر جانبداری سے کام لیا تو مجھے یقین ہے کہ وہ آئندہ اپنی روایات کا سہارا کبھی نہیں لیں گے۔ جہاں تک زنا کاری کا تعلق ہے تو اس بارے میں قرآن شک وافواہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتا بلکہ واضح ثبوتوں کا مطالبہ کرتا ہے اور اسکی سزا مرد اور عورت دونوں کے بارے میں گولی یا پھانسی مقرر نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے کہ ہر دو کو ایک ایک سو کوڑے مارو (2 النور) لیکن اس معاملے کو کسی اور وقت تفصیل سے چھیڑیں گے کیونکہ فی الحال بات ہو رہی ہے درگور کی جانے والی عورتوں کی جنکا قصور یہ تھا کہ وہ زبردستی کے نکاح سے انکار کر رہی تھیں یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتی تھیں جو بلوچ روایات کے مطابق ایک بہت بڑا جرم ہے۔

اگر لفظ ''نکاح'' کا لغوی مطلب ہی جان لیا جائے تو بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نکاح میں زبردستی دراصل اسکی روح ہی کے خلاف ہے۔ نکاح عربی کا لفظ ہے جسکے معانی ایک دوسرے میں یوں گھلنے ملنے کے ہیں جسطرح آنکھوں میں نیند گھلتی ہے (نکع النعاس عینہ) یا جسطرح زمین میں بارش کی بوندیں جذب ہوتی ہیں (نکع المطر الارض)۔ قرآن کریم نے نکاح کو ایک مضبوط معاہدہ کہا ہے (21 النساء) اور معاہدے کے لیے فریقین کا بالغ ہونا ضروری ہوتا ہے، لہٰذا بلوغت یا جوانی کو ہی نکاح کی عمر قرار دیا گیا (6 النساء 34 بنی اسرائیل)۔ تو کیا بالغ فریقین کے درمیان کوئی مضبوط معاہدہ باہمی رضا و رغبت کے بغیر (یعنی

زبردستی) بھی ہوسکتا ہے؟ نکاح اس لیے نہیں کیا جاتا کہ بیوی سے جانوروں کی دیکھ بھال کرائی جائے یا پانی منگوایا جائے، نہ ہی اس سے مراد محض جنسی ملاپ ہے، اس کا مقصد تو اللہ کی طرف سے مقرر کردہ حقوق و فرائض کی پاسداری ہے (24النساء) اور نکاح سے مرد اور عورت دونوں پر یکساں حقوق و فرائض عائد ہو جاتے ہیں (228 البقرۃ)۔قرآن کریم کے بقول جوڑے اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ ان سے تسکین حاصل ہو اور محبت و رحمت کی فضا جنم لے(21الروم)، اسی لیے تو مردوں کو اپنی پسند کی عورتوں (3النساء) اور عورتوں کو اپنی پسند کے مردوں سے (19 النساء) نکاح کرنے کی ہدایت و اجازت دی گئی۔

موضوع کی مناسبت سے آپ کی خدمت میں بلوچ روایات کے ساتھ ساتھ قرآنی ہدایات بھی رکھ دی گئی ہیں، ان پر ہو سکے تو کم از کم ایک مرتبہ ضرور غور وفکر کیجئے اور خود ہی فرمائے کہ کیا یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد نہیں؟ ہمیں اپنی روایات یا قرآن میں سے کسی ایک کا انتخاب واضح طور پر کر لینا چاہیے کیونکہ انکے ایک ساتھ چلنے میں کسی ایک کا بھی فائدہ نہیں بلکہ دونوں کا نقصان ہے۔

روزنامہ جناح، 16/9/2008

ہمارا جان لیوا تضاد

سیاسیات کی زبان میں ''ریاست، سیاسی طور پر منظّم لوگوں کی اس قومی وحدت کو کہتے ہیں جو کسی خاص مقام پر رہتی ہے''۔خاص مقام سے مراد علاقہ ،لوگوں سے مراد آبادی، سیاسی تنظیم سے مراد حکومت اور قومی وحدت سے مراد حاکمِ اعلیٰ۔یعنی ریاست چار عناصر سے مل کر بنتی ہے اور یہ عناصر آبادی، علاقہ ،حکومت اور حاکمِ اعلیٰ ہیں جن میں سے کوئی ایک عنصر بھی کم ہو تو ریاست، ریاست نہیں رہتی۔ریاست کی اکائی گھر ہوتا ہے جسے معاشرے کی پہلی سیاسی تنظیم قرار دے کر ارسطو''ہاؤس ہولڈ''(House Hold) کا نام دیتا ہے اور کہتا ہے کہ'' گھر کا حاکمِ اعلیٰ باپ ہوتا ہے،جس کے تعلقات اپنی بیوی کے ساتھ آئینی فرماں روا کے سے ہیں اور بچوں کے ساتھ ویسے ہیں جیسے ایک ہمدرد، خیر خواہ اور ہر دلعزیز بادشاہ کے اپنی رعایا کے ساتھ ہوتے ہیں جبکہ جائداد اور ملازموں کے ساتھ وہ ایک مالک کی حیثیت سے سلوک کرتا ہے اور جیسا چاہتا ہے ان سے فائدہ اٹھاتا ہے''۔یعنی گھر بھی ایک چھوٹی سی ریاست ہوتا ہے کیونکہ اس میں بھی آبادی، علاقہ ،حکومت اور حاکمِ اعلیٰ کے عناصر موجود ہوتے ہیں، بہت سے گھر یعنی بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں مل جائیں تو ایک بڑی ریاست یعنی ملک بنتا ہے۔کہنے کا مقصد یہ ہے کہ گھر معاشرتی یا ریاستی زندگی کی پہلی درس گاہ ہے اور یہاں انسان جو کچھ سیکھتا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے(بالعموم)اس کی زندگی کا لازمی جزو بن جاتا ہے،اگر گھر میں اس کی تربیت اچھی ہوگی تو وہ ملک میں بھی اچھے شہری کی حیثیت سے زندہ رہنے کے قابل بن سکے گا اور اگر گھر میں اسے تخریب کا سبق پڑھایا جائے گا تو وہ ملک کے لیے بھی تعمیر کا باعث نہیں بن سکے گا۔بہترین معاشرہ وہ ہوتا ہے جہاں گھریلو اور ملکی زندگی میں ہم آہنگی ہو،یعنی آپ ایک فرد سے قومی ریاست میں جس طرح کے کردار کی امید رکھتے ہیں اس کی ترغیب گھریلو ریاست سے ہی دینی پڑے گی بصورتِ دیگر آپ کو اس سے خیر کی توقع رکھنے کا کوئی حق نہیں۔تو آیئے دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک کی گھریلو اور ملکی زندگی میں ہم آہنگی کی صورتحال کیا ہے؟یعنی ہم قومی سطح پر ایک

شہری کو جس سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں اس کے خدوخال کیا اس کی گھریلو زندگی میں بھی کہیں دکھائی دیتے ہیں یا نہیں؟

ہماری ''قومی ریاست'' کی ترجیح ہر دور میں قانون ومیرٹ کی بالادستی اور جمہوریت کا نفاذ ہوتی ہے جبکہ ہماری ''گھریلو ریاست'' میں (بالعموم) ان چیزوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا جہاں ''باپ'' کی آمریت قائم ہوتی ہے، قانون اس کی ذاتی مرضی سے بنتا ہے جو اس کے اپنے لیے الگ بیوی کے لیے الگ اور بچوں کے لیے الگ ہوتا ہے، کوئی اور غلطی کرے تو اس کا مواخذہ ہوتا ہے لیکن باپ ہر قسم کے مواخذے سے بالاتر ہوتا ہے، اپنی غلطی تسلیم کرنا اس کی شان کے خلاف ہوتا ہے، وہ اپنے علاوہ ہر کسی پر تنقید کرتا ہے، جب چاہے پرانا قانون توڑ کر نیا بنا دیتا ہے اور نیا قانون بھی کسی دوسرے سے زیادہ اسکی ذاتی سمجھ بوجھ پر مبنی ہوتا ہے، قانون شکنی حاکمِ اعلی ہونے کی دلیل ہوتی ہے لہذا باپ کی غیر موجودگی میں گھر کے دیگر افراد بھی قانون شکنی کر کے ذہنی ونفسیاتی سکون حاصل کرتے ہیں، حاکم اعلی کا تقرر میرٹ پر نہیں ہوتا بلکہ عمر اور طاقت کی بنا پر ہوتا ہے یا اسکی وجوہات معاشی ہوتی ہیں، بچے چاہے باپ سے زیادہ پڑھے لکھے اور سمجھدار ہی کیوں نہ ہوں لیکن اس کے جیتے جی وہ کبھی حاکمِ اعلی نہیں بن سکتے، وہ کتنا ہی بدکردار کیوں نہ ہو لیکن اس کی عزت گھر کے ہر شہری پر فرض ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے مزاج میں عموماً آمریت اور انتہا پسندی بھری ہوتی ہے، ہمیں اپنی مرضی دوسروں پر مسلط کرنے کی عادت ہے اور جو ہماری رائے سے اختلاف کرے اسے ہم ایک لمحے کے لیے بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتے، ہم میں ہر کوئی محض عمر اور طاقت کے بل بوتے پر خود کو دوسروں سے افضل سمجھتا ہے، جس کے پاس زیادہ پیسے ہوتے ہیں وہ جاہل اور احمق ہی کیوں نہ ہو لیکن سمجھتا یہ ہے کہ اسکی بات ماننا اسکے زیرِ کفالت لوگوں پر فرض ہے، کوئی اپنی غلطی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتا چاہے اس میں اسکا اپنا فائدہ ہی کیوں نہ ہو، جو جتنا بااختیار ہوتا ہے وہ اتنا ہی قانون شکن بھی ہوتا ہے، عام لوگ بھی اسی وقت تک قانون کی پیروی

کرتے ہیں جب تک کوئی انہیں دیکھ رہا ہو بصورتِ دیگروہ بھی اپنی مرضی کو ہی قانون سمجھتے ہیں، کوئی بھی اپنے گریبان میں جھانک کرنہیں دیکھتا بلکہ دوسروں کے کام میں کیڑے نکالتا رہتا ہے، میرٹ نام کی کوئی شے ہمیں چھو کر بھی نہیں گزری، ہم کتنے ہی کرپٹ کیوں نہ ہوں لیکن اپنے زیرِ اثر لوگوں پر اخلاقی برتری کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ ہماری گھریلو ریاست اور قومی ریاست میں کتنا تضاد ہے؟ اسی لیے تو سیاسی طور پر رائی برابر ترقی بھی نہیں کر سکے، سیاسی پسماندگی کیونکہ ہر دوسری پسماندگی کی جڑ ہوتی ہے لہذا ہم زندگی کے کسی شعبے میں بھی کوئی قابل تقلید مثال قائم نہیں کر سکے۔ اس تضاد کو ختم کرنے کی کوشش ہنگامی بنیادوں پر شروع کیے جانے کی فوری ضرورت ہے تاکہ امن و سلامتی کی طرف ہمارے منظّم سفر کا آغاز ہو سکے، اسی تضاد کو ختم کرنے کے لیے ترقی یافتہ معاشروں میں ان لوگوں کو خصوصی تربیتی کورس کروائے جاتے ہیں جو والدین بننا چاہتے ہیں، چنانچہ وہاں ایک بچہ گھریلو زندگی سے باہر نکل کر قومی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اسے کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں ہوتا اور (غلط یا صحیح) جس طرف بھی قومی دھارا بہہ رہا ہوتا ہے وہ بھی اس میں بہنے لگتا ہے جس سے قومی یکجہتی کو فروغ ملتا ہے اور کون نہیں جانتا کہ قوموں کے عروج و زوال میں قومی یکجہتی سے زیادہ کردار کسی بھی دوسری شے کا نہیں ہوتا۔

اس حقیقت میں شک و شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ گھریلو ریاست اور قومی ریاست کی ترجیحات کا فرق دراصل ایک ایسا جان لیوا تضاد ہے جو قوموں کو جیتے جی مار دینے کی قوت رکھتا ہے اور اس میں مبتلا قومیں اپنے تمام تر قدرتی و افرادی قوت کے وسائل کے باوجود بین الاقوامی سطح پر کوئی باعزت مقام حاصل نہیں کر سکتیں۔ جب تک ہم گھریلو ریاست اور قومی ریاست کے دھاروں میں فرق دور نہیں کریں گے، اس وقت تک یہ ممکن ہی نہیں کہ قومی یکجہتی کا خواب شرمندہءِ تعبیر ہو سکے اور ہماری قوی سلامتی کو درپیش خطرات و مسائل میں کمی واقع ہو۔

روزنامہ جناح، 12/10/2009

وزیرِ دفاع اور بنانا ری پبلک

ہمارے وزیرِ دفاع کو چین جانے سے روکا گیا تو انہوں نے ایک نجی ٹی وی کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے دوسوال اٹھائے۔ پہلا یہ کہ میرا نام تو نیب کی ''اگزٹ کنٹرول لسٹ'' میں ہے ہی نہیں، مجھے کیوں روکا گیا؟ اور دوسرا یہ کہ کیا پاکستان ''بنانا ری پبلک'' (Banana Republic) ہے؟ پہلے سوال کا جواب تو وزیرِ اعظم نے انہیں روکنے والوں کو معطل کر کے دے دیا جسکی وضاحت چیئر مین نیب نے ان سے معافی مانگ کر، کر دی لیکن دوسرے سوال کا جواب تا حال کہیں سے موصول ہوتا سنائی نہیں دیا تو میں نے سوچا کہ میں ہی کچھ عرض کر دیتا ہوں تا کہ انہیں آئندہ کسی سے یہ سوال پوچھنے کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑے۔

''بنانا ری پبلک'' کی اصطلاح سب سے پہلے (1904 میں) ایک امریکی ادیب ہنری نے اپنی کتاب Cabbages & Kings میں استعمال کی اور کیوں کی، اس کا درست ادراک اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک یہ پتہ نہ لگ جائے کہ کیلا یورپ کی منڈی تک کیسے پہنچا اور اس کے وہاں پہنچنے سے دنیا پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ یہ 1870 کی بات ہے کہ لورنز وڈی بیکر نامی ایک تاجر کیلے کو وسطی امریکہ سے بوسٹن لے گیا اور وہاں لے جا کر اسے ایک ہزار فیصد منافع پر فروخت کیا۔ یہ بات ریل کی پٹڑیاں بچھانے والے امریکی ماہرین کیتھ اور اسکے چچا کو معلوم ہوئی جنہوں نے ریلوے لائنوں کے دونوں اطراف کیلے کے پیڑ اس لیے لگوا رکھے تھے کہ دور دراز علاقوں میں پٹڑیوں پر کام کرنے والے مزدوں کے لیے کھانا لانے کی تکلیف نہ اٹھانی پڑے اور وہ کیلے کھا کر ہی گزارا کر لیا کریں، تو ان کے دل و دماغ میں بھی فوری طور پر کیلے کی تجارت کا خیال پیدا ہو گیا۔ انہوں نے کیلا جنوب مشرقی امریکہ میں لے جا کر فروخت کرنا شروع کر دیا اور خوب منافع کمایا۔ یورپ یا جنوب مشرقی امریکہ میں کیلے کی مقبولیت کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ ان علاقوں کے لوکل پھلوں سے بھی سستا ہوا کرتا تھا مثال کے طور پر ایک درجن کیلوں کو بیچ کر جو پیسے حاصل ہوتے تھے ان سے بمشکل دو

سیب خریدے جا سکتے تھے، اسکے باوجود اسکی تجارت نفع بخش اس لیے تھی کہ کیریبین اور جنوبی امریکہ میں اس کے درختوں کی بہتات کے لیے بے شمار رقبہ بڑی آسانی کے ساتھ دستیاب تھا اور نہایت ہی ارزاں لوکل لیبر کی بھی کوئی قلت نہ تھی۔

شروع شروع میں تو ڈی بیکر اور کیتھ کی کمپنیاں (''بوسٹن فروٹ کمپنی'' اور ''ٹراپیکل ٹریڈنگ اینڈ ٹرانسپورٹ کمپنی'') اپنے اپنے طور پر ہی کیلے کی تجارت کرتی رہیں لیکن بعد میں ''وسیع تر مفاد'' کے پیشِ نظر، رقابت کے بجائے اتحاد کر لیا گیا۔ ان دونوں کمپنیوں کے ملاپ سے 1899 میں ''یونائٹڈ فروٹ کمپنی'' ظہور پزیر ہوئی جو سارے برِاعظم میں استعمال ہونے والے کل کیلے کا 80 سے 90 فیصد سپلائی کیا کرتی تھی۔ اس کمپنی کی دیکھا دیکھی اور فروٹ کمپنیاں (مثلاً سٹینڈرڈ فروٹ کمپنی، کیویامل فروٹ کمپنی وغیرہ) بھی میدان میں اُتر آئیں، ان کمپنیوں نے اتنا پیسہ کمایا اور اتنی طاقت حاصل کر لی کہ حکومتیں بنانے اور گرانے لگ گئیں تا کہ ان کی تجارت کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔ جن علاقوں سے کیلا لے جایا جاتا تھا وہاں جمہوری سوچ کو پروان چڑھنے سے روکنے کے لیے کرپٹ اور بکاؤ سیاستدان پیدا کیے گئے جو اپنے ذاتی مفاد کو قومی مفاد کا نام دے کر ملک کی آبرو نیلام کرتے تھے، فروٹ کمپنیوں نے جہاں کا کیلا فروخت کر کر کے پورے پورے ملکوں جتنی دولت وقوت اکٹھی کر لی وہاں کے لوگ اپنے بے غیرت حکمرانوں کے باعث غربت کی چکی میں اسطرح پِستے رہے کہ زندگی موت سے بدتر ہوگئی۔ ان فروٹ کمپنیوں نے (اور تو اور) مفرور ڈاکوؤں اور لٹیروں کو اپنی پناہ میں لینا شروع کر دیا تا کہ ٹیڑھی انگلیوں کے ذریعے وہ گھی بھی نکالا جا سکے جو سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلتا تھا۔

چنانچہ ہنری نے Banana Republic کی اصطلاح بنیادی طور پر ایسے ملک (Honduras) لیے استعمال کی جہاں (1896-97 میں) اپنے قیام کے دوران اس نے دیکھا کہ حکمرانوں نے آمریت قائم کر رکھی ہے، وہ رشوت (Kickbacks) کے

عوض اپنے ملک کی زراعت کو غیروں کے ہاتھ نہایت ہی سستے داموں فروخت کر کے دھرتی ماں کی کوکھ اجاڑ رہے ہیں اوراس کے بیٹوں کو بے یار و مدد گار کر رہے ہیں۔ اسکے بعد ''بنانا ری پبلک'' کی اصطلاح ایسے تمام ممالک کے لیے استعمال کی جانے لگی جن میں کچھ اسطرح کی خصوصیات پائی جاتی ہوں کہ قومی وسائل کو غیر قومیں لوٹ کر لے جائیں اور قوم کو صدائے احتجاج بلند کرنے کی اجازت بھی نہ ہو، قومی تجارت سے فائدہ حکمرانوں کو ہو اور نقصان عوام کو، حکمرانوں کے کتے اور گھوڑے پھلوں کے مربے کھائیں اور عوام کے بچوں کو روکھی سوکھی روٹی بھی میسر نہ ہو، ایک طبقہ کچھ نہ کر کے بھی عیش و آرام کی زندگی بسر کرے اور دوسرا خون پسینہ ایک کر کے بھی دکھ و تکلیف کی چکی میں پِستا رہے، احتساب نام کی کوئی چیز اگر ہو تو وہ عوام کے لیے ہو جبکہ حکمران قانون سے بالاتر ہوں، قومی اسمبلی میں بیٹھنے والے بکاؤ ہوں اور انکی حیثیت ربڑ کی مہر جیسی ہو، اہم ملکی امور کے فیصلے دوسرے ممالک میں ہوا کریں البتہ انکی توثیق Rubber Stamp کے ذریعے ملک میں ہی ہوتی ہو، ملکی معیشت غیر ملکوں اور غیر ملکی کمپنیوں کے ہاتھوں میں ہو اور اپنی آنے والی نسلیں بھی قرض کے بوجھ تلے دبی ہوں، پیسے والے لوگ بینکاری نظام کی دھجیاں اڑائیں، ارب پتی اربوں روپئے کے قرض لے کر معاف کروالیا کریں اور انہیں پوچھنے والا کوئی نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔

گوئٹے مالا کو اس لیے ''بنانا ری پبلک'' کہا گیا کہ وہاں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور ترقی کی غیر مساوی ترویج دیکھنے کو ملتی ہے، سب سے بڑھکر یہ کہ وہاں کسی کے پاس تو زمین سرے سے ہے ہی نہیں اور کسی کے پاس اتنی ہے کہ سنبھالی نہیں جاتی۔ ارجنٹینا کو منتخب حکومتوں پر فوجی آمریتوں کی جانب سے پے در پے شب خون مارنے کی بدولت ''بنانا ری پبلک'' کے نام سے پکارا گیا۔ اور مونٹینگرو کے لیے یہ اصطلاح اس لیے استعمال کی گئی کہ یوگوسلاویہ کی شکست و ریخت کے بعد مسلسل بیس برس سے Milo Djukanovic نامی ایک شخص اس کا حکمران (کبھی وزیرِ اعظم تو کبھی صدر) ہے جو منظّم جرائم، تمباکو کی سمگلنگ، منی لانڈرنگ اور اٹلی

کی انڈر ورلڈ کے ساتھ اپنے دیرینہ تعلقات کی کی بنا پر جانا پہچانا جاتا ہے لیکن اس کے خلاف کوئی کاروائی اس لیے نہیں کی جاسکتی کہ اسے قانونی چارہ جوئی سے تحفظ حاصل ہے۔

''بنانا ری پبلک'' کی اصطلاح کا ایک بڑا ہی خوبصورت استعمال ایک مرتبہ امریکہ میں بولویا(Bolvia) کے سفیر گستاوو گُزمان نے کچھ ان الفاظ میں کیا کہ''امریکہ ہماری خودمختاری کو نظر انداز کر کے ہمارے ساتھ ایسا سلوک کر رہا ہے جیسا ایک بنانا ری پبلک کے ساتھ کیا جاتا ہے''۔

امید ہے کہ ہمارے وزیرِ دفاع کو اپنے''پہلے سوال کے بعد''اب دوسرے سوال کا جواب بھی اچھی طرح مل گیا ہوگا کہ کیا پاکستان بنانا ری پبلک ہے؟اوراس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جان چکے ہوں گے کہ اگر یہ بنانا ری پبلک ہے تو کس کی وجہ سے ہے اوراگر نہیں ہوگی تو کس کی وجہ سے نہیں ہوگی؟

روزنامہ جناح ،20/12/2009

میکائولی اور ہمارے حکمران

ہمارے حکمرانوں کا تعلق آمریت سے ہو یا جمہوریت سے، ان کے حکمرانہ تدبر کو دیکھ کر سولہویں صدی کا بدنامِ زمانہ مغربی مفکر نکولو میکاوَلی (1469-1527) یاد آجاتا ہے۔ اُس کی شہرت کا مرکز و محور اس کی مشہور کتاب ''دی پرنس'' (The Prince) ہے جس میں اس کی زیادہ تر توجہ حکمرانی کے ''کامیاب'' اصولوں پر مذکور ہے، اسی کتاب کے آٹھویں باب سے دو اقتباسات کا ترجمہ نقل کر دیتا ہوں جنہیں پڑھنے کے بعد آپ کو یہ اندازہ کرنے میں دشواری نہیں ہونی چاہیے کہ ہمارے کون کونسے حکمران میکاوَلی کے عقیدت مندوں اور نیاز مندوں میں شامل ہیں۔

میکاوَلی ایک مقام پر لکھتا ہے کہ ''حکمرانی کے لیے لومڑی کی صفات بہت ضروری ہیں تاکہ حکمران مکر و فریب کے جال بچھا سکے، اس کے ساتھ ساتھ اس میں شیر کی خُوبھی ہونی چاہیے تاکہ وہ بھیڑوں کو خائف بھی رکھ سکے۔ صرف شیر کی قوت اس لیے کافی نہیں کہ عقل مند حکمران وہ ہے کہ جسے جب یہ دکھائی دے کہ کوئی عہد یا معاہدہ اس کے مفادات کے خلاف جا رہا ہے یا جن وجوہات کے پیشِ نظر وہ معاہدہ کیا گیا تھا، وہ باقی نہیں رہے تو اسے بلا تامل توڑ ڈالے لیکن یہ بھی لازمی ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لیے نہایت دلفریب اور نگاہوں کو دھوکہ دینے والے دلائل پیش کیے جائیں''۔ دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ ''جو حکمران اقتدار پر اپنے قدم جمائے رکھنا چاہتا ہے اس کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ بدی کس طرح کی جاتی ہے اور بدی کرنے کے لیے کون سا وقت سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اس میں خوبیوں کا ہونا ضروری نہیں البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ خوبیوں والا دکھائی دے یعنی (چاہے وہ کتنا ہی سفاک، بے وفا، بدکار، لادین اور جھوٹا کیوں نہ ہو لیکن) بظاہر یہ نظر آنا چاہیے کہ وہ بڑا رحمدل، وفا شعار، نیک اطوار، مذہب پرست اور صداقت پسند ہے۔ ان میں سے کوئی خوبی اس میں سچ مچ پیدا ہو جائے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کے دل کی حالت ہمیشہ ایسی رہے کہ جونہی وہ دیکھے کہ مصلحتِ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس خوبی کو یکسر الگ کر دیا جائے تو وہ بلا جھجک اس کے

خلاف عمل کر سکے''۔ میکاوَلی کا بنیادی اصولِ سیاست یہ ہے کہ ''قوت کا نام عدل وانصاف ہے اور سچا وہی ہے جس کے پاس قوت ہے'' لیکن اس کے نزدیک وہ قوت ادھوری ہے جس میں چالبازی شامل نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اس کا سارا فلسفہء حکمرانی دولفظوں کے گرد گھومتا ہے اور وہ ہیں ''طاقت اور فریب''۔

مغربی سیاست میں جمہوری اداروں کے تندرست ہونے سے پہلے ''دی پرنس'' کو ''مقدس کتاب'' کا درجہ حاصل تھا اور کہا جاتا ہے کہ ''یورپ کے بڑے بڑے فرماں روا اسے سفر وحضر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے، تھامس کرام ویل اسے سرہانے رکھ کر سوتا تھا اور ہنری سوئم اسے جیب میں رکھتا تھا''۔ ثانی الذکر کے بارے میں تو یہاں تک مشہور ہے کہ جب وہ قتل ہوا اس وقت بھی میکاوَلی کا یہ شہکار اس کی جیب سے برآمد ہوا۔

ہمارے حکمرانوں کے قول وفعل کا تضاد جو ''بغل میں چھری منہ میں رام رام'' کی صورت آئے روز مشاہدے میں آتا رہتا ہے، کیا اس حقیقت کا آئینہ دار نہیں کہ یہ بھی میکاوَلی کے چاہنے والوں میں شامل ہیں؟ بلکہ مجھے تو پورا یقین ہے کہ اگر اچانک چھاپا مارا جائے تو ہمارے کئی سیاست دانوں کے تکیے کے نیچے یا جیب کے اندر سے بھی ''دی پرنس'' ملے گی اور نہ بھی ملے تو کیا ہم جانتے نہیں کہ ہمارے اکثر اہلِ حکومت بظاہر کیسے دکھائی دیتے ہیں اور حقیقت میں کیسے ہیں؟ جو چینی کی ذخیرہ اندوزی میں ملوث ہیں انہیں ٹی وی کیمرے کے سامنے دیکھا جائے تو کیا یوں نہیں لگتا ہے کہ ان سے زیادہ ہمارا خیر خواہ کوئی ہے ہی نہیں؟ جنھوں نے توانائی کے متبادل ذرائع کو تصرف میں نہ لاکر توانائی کا بحران پیدا کیا جو شدید لوڈشیڈنگ کے دنوں میں بھی اپنے پالتو جانوروں تک کو ائیر کنڈیشن میں رکھنے سے باز نہیں آتے جو اپنی اور اپنے جانوروں کی بجلی کا بل غریب عوام کے پیسوں سے ادا کرتے ہیں انہیں قوم سے بجلی بچانے کی اپیل کرتے ہوئے دیکھ کر کیا یہ محسوس نہیں ہوتا کہ جیسے لوڈشیڈنگ کا دکھ ان سے زیادہ کسی کو ہے ہی نہیں؟ جو لوگ آٹے کی سمگلنگ کرواتے ہیں جنھوں نے عوام کے منہ سے روکھی سوکھی

روٹی کا لقمہ تک چھین لیا ہے وہ پریس کانفرنسوں میں کتنی معصومیت سے قوم کا درد بانٹ رہے ہوتے ہیں؟ جو رمضان المبارک میں مصنوعی مہنگائی کو نہیں روکتے وہ کتنے عجز وانکسار کے ساتھ تسبیح ہاتھ میں اٹھائے افطار پارٹیوں میں شرکت کرتے دکھائی دیتے ہیں؟ جنہوں نے 6 مئی کو کراچی میں سرِ عام خون کی ہولی کھیلی تھی اور کتنے ہی مظلوموں کے لہو سے اپنے ہاتھ رنگ لیے تھے وہ بعد میں کیسے درد بھرے انداز اور گلوگیر آواز میں خدا کو حاضر ناظر جان کر ساری دنیا کے سامنے یہ کہہ رہے تھے کہ ظلم تو دراصل ان کے ساتھ ہوا جس کے لیے وہ محشر کے روز ظالموں کا گریبان پکڑیں گے اور اس روز انہیں انصاف ضرور ملے گا؟

میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ ہمارے حکمران اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے ''طاقت اور فریب'' پر جتنا وقت، روپیہ اور توانائی خرچ کرتے ہیں اتنا اگر عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کریں تو کیا اس سے بھی ان کے اقتدار کو طول نہیں ملے گا؟ مجھے یہ خیال بھی دامن گیر رہتا ہے کہ اقتدار چاہے جتنا بھی لمبا ہو جائے لیکن وہ رہتا تو چار ہی دن کا ہے کہ اس سے زیادہ تو انسان کی زندگی ہی نہیں ہوتی؟ ہمارے حکمرانوں کو اتنی سی بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ اقتدار چار دن کے بجائے دو دن کا ہی ہو لیکن اس کے بعد لوگ عزت سے نام لیا کریں یہ اچھا ہے یا پھر یہ کہ اقتدار دو دن کے بجائے چار دن کا ہو لیکن لوگ نفرت وحقارت سے یاد کیا کریں؟

روزنامہ جناح، 2009

بارش چین سے کیوں نہیں مانگتے؟

کوئی زیادہ پرانی بات نہیں جب چین میں خشک سالی آتی تھی تو وہاں کے لوگ اپنے عبادت خانوں میں رورو کر گڑگڑا گڑگڑا کر بارش کی دعائیں مانگتے تھے یا اپنے روکھے سوکھے کھیتوں میں جمع ہوکر بارش کا رقص کیا کرتے تھے، کیونکہ انکا عقیدہ یہ تھا کہ خدا اُسی سرزمین پر بارش نہیں برساتا جس کے باسیوں سے وہ ناراض ہوتا ہے اور اُسے راضی کرنے کے انہیں یہی دو طریقے آتے تھے لیکن اکثر نہ دعائیں باریاب ہوتی تھیں نہ ہی رقص کو شرفِ قبولیت ملتا تھا جسکی وجہ مذہبی پیشواؤں کے مطابق لوگوں کی حد سے گزری ہوئی بداعمالیاں ہوتی تھیں، کبھی کبھار بارش ہو بھی جاتی جس کا سبب دعاؤں اور رقص کے خلوص کو قرار دیا جاتا تھا۔

پھر چین میں انقلاب آ گیا، جہالت و قدامت کے بادل چھٹ گئے، علم و آگہی کا سورج طلوع ہو گیا اور تخلیق و تجدید کی راہیں روشن ہو گئیں۔ دیگر شعبوں کی طرح موسموں پر بھی ریسرچ کا پروگرام شروع کر دیا گیا اور جلد ہی اس حقیقت کا کھوج لگا لیا گیا کہ سمندروں سے آبی بخارات کی شکل میں اٹھنے والی نمی تو ہر وقت آسمان میں موجود رہتی ہے جو برستی اس لیے نہیں کہ ہلکی ہوتی ہے اور ہواؤں کے ساتھ اُڑتی رہتی ہے، سو اگر کوئی ایسا طریقہ تلاش کر لیا جائے جو نمی کے قطروں کو ہلکا نہ رہنے دے تو اس کے پاس برسنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہے گا۔ کچھ ہی عرصے میں وہ طریقہ بھی دریافت کر لیا گیا جو یہ ہے کہ تقریباً ایک سگریٹ کے سائز کی سلور آئیوڈائڈ سٹک (Silver Iodide Stick) ایک راکٹ کے ذریعے فضا میں فائر کر دی جاتی ہے، راکٹ اس بلندی پر پہنچ کر پھٹتا ہے جہاں آبی بخارات موجود ہوتے ہیں، سلور آئیوڈائڈ سٹک پگھل کر ذرات میں تبدیل ہو جاتی ہے، ان ذرات کو فضا کی نمی خود بخود جذب کر لیتی ہے کیونکہ انہیں جذب کرنا اسکی فطرت میں شامل ہے جسکے بعد وہ اتنی بھاری ہو جاتی ہے کہ ہوائیں اسکا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہو جاتی ہیں اور وہ بارش کی صورت برس پڑتی ہے۔ اگر بادل اس اونچائی پر موجود ہوں جس تک رسائی حاصل کرنے کے

لیے راکٹ کی ضرورت نہ ہوتو سلور آئیوڈائڈ سٹک فائر کرنے کے لیے اینٹی ایئر کرافٹ گن استعمال کی جاتی ہے، اور اگر بادل اس سے بھی نیچے ہوں تو یہ مقصد جہاز کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد ساری دنیا نے دیکھا کہ چینی سائنسدانوں نے جب چاہا جہاں چاہا بارش کو برسنے پر مجبور کر دیا۔ فروری 2009 ہی کی مثال لے لیجئے جب چین کے سات صوبوں میں خشک سالی آئی ہوئی تھی جس سے 10.7 ملین ہیکٹر پر پھیلی فصلیں تباہ ہوسکتی تھیں جن پر 40 لاکھ سے زائد لوگوں کا دارومدار تھا، یہی نہیں بلکہ 20 لاکھ سے زیادہ لائیو سٹاک کے مراکز بھی شدید خطرے میں گھِرے ہوئے تھے۔ اس خشک سالی سے بالخصوص گندم کی فصل بڑی بری طرح متاثر ہوسکتی تھی جس کا گڑھ ہیبئ (Hebei) کا صوبہ ہے، چنانچہ 409 موسمی راکٹ فائر کیے گئے اور دو روز میں 5 ملی میٹر تک بارش برسائی گئی جس کے لیے کسی کو رونے گڑگڑانے کی ضرورت پڑی نہ ہی رقص کرنے کی۔

چین کے سائنسدانوں نے موسمی ریسرچ کا آغاز اپنی زراعت کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے کیا جو چینی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی جیسی حیثیت رکھتی تھی اور جسے خشک سالی کے علاوہ ژالہ باری کے طوفانوں سے بھی بڑا خطرہ لاحق تھا جن کے دوران بڑے بڑے اولے فصلوں اور سبزیوں پر اسطرح گرتے تھے جسطرح انسانوں پر گولہ بارود گرتا ہے۔ کیا معلوم آپ نے کبھی یہ منظر دیکھا ہے یا نہیں لیکن میں اپنے گاؤں میں کئی مرتبہ فصلوں کو ژالہ باری کے ہاتھوں تہس نہس ہوتے ہوئے دیکھ چکا ہوں، یہ منظر کسی کسان کے لیے قیامت سے کم نہیں ہوتا جسے تبدیل کرنے کے لیے چینی سائنسدانوں نے جو راکٹ بنایا ہے اسے ''ویدر موڈیفیکیشن راکٹ'' (Weather Modification Rocket) کہتے ہیں۔ یہ راکٹ اس وقت فائر کیا جاتا ہے جب مختلف علاقوں میں نصب موسمی ریڈار ژالہ باری کے طوفان کی اطلاع دیتے ہیں اور طوفان ٹل جاتا ہے۔

موسمی راکٹوں کا استعمال وسیع پیمانے پر لگی آگ پہ قابو پانے(یعنی Fire Fighting)اور سردیوں میں دریاؤں اور دیگر پانی کے ذخائر کو بھرنے کے لیے بھی کیا جاتا ہے۔مثال کے طور پر 2006میں برسائی جانے والی بارشوں سے پانی کے ذخائر میں10 سے13 فیصد اضافہ ہوا۔کئی مرتبہ موسمی راکٹ فضا میں موجود گرد وغبار کی اُس تہہ کو زمین بوس کرنے لیے بھی فائر کیے جاتے ہیں جو طرح طرح کے امراض کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔مثلاً بیجنگ کی فضا میں فائر کی گئی163 سلور آئیوڈائڈ سٹکس جنہوں نے فضا کو جراثیم سے پاک کرنے کے لیے 11 گھنٹے تک (بارش تو بارش)اتنی برفباری کروائی کہ گاڑیوں اور ریلوں کی آمدورفت کے ساتھ ساتھ جہازوں کی پروازیں بھی متاثر ہوئیں۔ایک مرتبہ(2004 میں)تو موسمی راکٹ کا استعمال محض گرمی کی شدت میں کمی کرنے اور لوگوں کو ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکے مہیا کرنے کے لیے بھی کیا گیا۔

موسمی راکٹوں کے ذریعے 1999 سے 2006 تک کُل 250ارب ٹن بارش برسائی جا چکی ہے اور یہ پانی کی اتنی بڑی مقدار ہے کہ جس سے کئی دریاؤں کو''الف سے ی تک'' بھرا جا سکتا ہے۔چین کا موسمی پروگرام دنیا میں سب سے بڑا ہے جو32000 سے زائد انسانوں،تقریباً7000 اینٹی ایئر کرافٹ گنوں،5000 کے لگ بھگ سپیشل راکٹوں اور 30جہازوں پر مشتمل ہے،اس کا سالانہ بجٹ 60 سے 90 ملین امریکی ڈالر ہوتا ہے۔اس پروگرام کے تحت عام کسانوں کو بھی راکٹ فائر کرنے کی تربیت دی جاتی ہے بالکل ویسے ہی جیسے ہمارے یہاں ہیلتھ ورکرز کو تیار کیا جاتا ہے،ان کسانوں کی ماہوار تنخواہ100 امریکی ڈالر کے قریب ہوتی ہے اور ایک کسان کو سال بھر میں اوسطاً40 راکٹ فائر کرنے پڑتے ہیں۔

چین کے موسمی پروگرام کا خیال اس لیے آ گیا کہ ان دنوں ہم بھی خشک سالی کا شکار ہیں، ہماری فصلوں اور صحت کو بھی شدید خطرات لاحق ہو چکے ہیں اور ہم بھی بارش کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔کاش ہم یہ سمجھ سکیں کہ جو چیز قدرت نے انسان کے ہاتھ میں دے رکھی

ہو،اسے حاصل کرنے کی دعا قرآنِ کریم میں بیان کردہ مثال کے مطابق ایسے ہی ہے کہ جیسے کوئی پیاسا چشمے کے سامنے کھڑا (ہاتھ بڑھا کر پانی پینے کے بجائے) ہاتھ اٹھائے یہ تمنا کررہا ہو کہ پانی خودبخود اس کے منہ میں چلا جائے۔ کاش اس بارش کے حصول کی دعائیں مانگنے کے بجائے جو قانونِ قدرت کے تحت ہمارے لیے مسخر کردی گئی ہے، ہمیں چینیوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا ہو اور ہم سلور آئیوڈائڈ کے راکٹ فائر کرکے بادلوں کو برسنے پر مجبور کرسکیں؟ بفرضِ محال اپنا موسمی پراگرام ترتیب دینے میں این آر او یا سترویں ترمیم یا کوئی شرعی حجت آڑے آتی ہے تو کیا چین سے امداد نہیں لی جاسکتی؟ ہم ہرایرے غیرے سے کیا کچھ نہیں مانگتے پھرتے تو چین جیسے دیرینہ دوست سے بارش کے چند راکٹ مانگنے میں امر مانع ہے؟

روزنامہ جناح، 18/1/2010

بھگت رام اور صبغت اللہ

آج آپ کو دو ایسے پڑوسیوں کی سبق آموز کہانی سناتے ہیں جو ایک دوسرے کی دشمنی میں ایسے مگن تھے کہ اپنے بچوں کی صحت اور تعلیم تک کا ہوش نہیں تھا۔ ایک کا نام بھگت رام تھا اور دوسرے کا صبغت اللہ۔ دونوں ہی بڑے مذہبی تھے۔ ایک کٹر ہندو اور ایک کٹر مسلمان۔ دونوں اپنے اپنے مذہب کو بین الاقوامی بھائی چارے کا علمبردار قرار دیتے تھے لیکن دونوں ہی کی رائے میں انکی دشمنی کی بنیادی وجہ مذہب سے انکی گہری وابستگی تھی۔ دونوں کے خیال میں انکے مذہب کا مقصد ایک پرامن وخوشحال معاشرے کا قیام تھا جسکے بنیادی عناصر صحت، تعلیم اور مساوات ہوتے ہیں لیکن دونوں ہی کا زیادہ تر وقت ایک دوسرے سے دشمنی نبھانے اور اسلحہ جمع کرنے میں گزرتا تھا۔ جو وقت بچتا تھا اس میں شادیاں کر کے بچے پیدا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی دھن اور اولاد کی کثرت کے باعث انہیں اکثر و بیشتر مانگ تانگ کر گزارا کرنا پڑتا تھا جبکہ دونوں ہی کی مذہبی تعلیمات کے مطابق کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا ایک ناپسندیدہ فعل تھا۔ بھیک میں ملنے والی رقم کو وہ قرض کا نام دیتے تھے تاکہ انکی خودداری اور غیرت مندی پر کوئی حرف نہ آئے۔ قرض سمیت بھی انکی آمدن انکے اخراجات سے کم تھی جسکی وجہ سے وہ اپنے بچوں کو ہسپتال بھیجتے تھے نہ سکول۔ کئی بار تو اسلحہ و بارود پر اٹھنے والے اخراجات اسقدر بڑھ جاتے کہ انکے بچوں کو بھوکا رہنا پڑتا۔ بھگت رام کے مالی حالات نسبتاً کم خراب تھے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اسکے بچے صحت و تعلیم کے اعتبار سے بہتر تھے۔ اسکا مطلب تو یہ تھا کہ وہ اسلحے کی دوڑ میں صبغت اللہ سے آگے تھا اور ایک روز تو وہ کہیں سے ایک میزائل بھی خرید لایا جس پر صبغت اللہ نے یہ تاریخی اعلان کیا کہ ''بھگت رام نے اپنے بچوں کو گھاس کھلا کھلا کر میزائل حاصل کر لیا ہے تو مجھے بھی یہ میزائل حاصل کرنا ہے اور میں یہ میزائل حاصل کر کے رہوں گا، اس کے لئے چاہے میرے بچوں کو پتھر ہی کیوں نہ کھانے پڑیں'' اور پھر اپنے بچوں کو پتھر کھلا کھلا کر اس نے بھی میزائل حاصل کر ہی لیا۔ اس روز بھگت رام بہت اداس تھا

بالکل ویسے ہی جیسے کبھی صبغت اللہ بھی تھا۔

سمجھانے والوں نے بہت سمجھایا کہ اگر مقابلہ ہی کرنا ہے تو کسی اور میدان میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ سوچنے کے بجائے کہ کس نے کس کے راستے میں کتنے کانٹے بچھائے یہ بھی تو سوچا جا سکتا ہے کہ کس نے کس کے راستے سے کتنے کانٹے صاف کئے۔ اسلحہ و بارود کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کے بجائے صحت و تعلیم کے میدان میں بھی تو ایک دوسرے پر سبقت لینے کی جدوجہد کی جا سکتی ہے۔ بھکاریوں کی روش اپنانے کے بجائے خود انحصاری و خودمختاری کی راہ پر بھی تو چلا جا سکتا ہے۔ یہ دیکھنے کے بجائے کہ کون تخریب و تنزلی کی دلدل میں کتنا دھنسا، یہ بھی تو دیکھا جا سکتا ہے کون تعمیر و ترقی کے افق پر کتنا ابھرا۔ اپنا نہیں تو اپنے بچوں ہی کا کچھ خیال کرو جنکا مستقبل تمہاری عداوت کی آگ میں جل کر راکھ ہو رہا ہے۔ کیا تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ اگر تمہاری دشمنی نہ رہی تو تمہیں اسلحہ و بارود پر اٹھنے والی اس خطیر رقم کی ضرورت بھی نہیں رہے گی جس کے لئے تمہیں نہ صرف اپنے بچوں کا پیٹ کاٹنا پڑتا ہے بلکہ بھیک بھی مانگنی پڑتی ہے۔ تمہاری آمدن کا بیشتر حصہ تمہارے بچوں کی صحت و تعلیم پر خرچ ہوا تو تم اپنی آنے والی نسلوں کے لئے وہ پرامن و خوشحال معاشرہ قائم کر سکو گے جسکا خواب تمہارے بزرگ دیکھا کرتے تھے اور جس کا ذکر اپنے اپنے مذہب کا پرچار کرتے ہوئے اکثر تمہاری زبان پر رہتا ہے۔ لیکن بھگت رام اور صبغت اللہ کچھ سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھے۔ انہیں تو نفرت و تعصب کے رستوں پر چلنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ دونوں میں سے کوئی ایک بھی اپنی روش سے ایک قدم پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ تباہی کی طرف بڑھتے چلے گئے اور پھر ایک روز پتہ چلا کہ بھگت رام کے گھر ایڈز اور صبغت اللہ کے گھر 'ملٹی ڈرگ رزسٹنٹ ٹی بی' نے گھر کر لیا ہے۔ یہ دونوں ہی لاعلاج بیماریاں ہیں جو بھوک، ننگ، جہالت، کرپشن، گھٹن اور ذہنی دباؤ میں پلنے والے انکے بچوں سے ہوتی ہوئی ان دونوں تک بھی پہنچ چکی تھیں۔ بھگت رام اور صبغت اللہ کی موت یقینی تھی لیکن انہیں ایک دوسرے کو مارنے کے لئے ان بندوقوں اور میزائلوں کی ضرورت

نہیں تھی جو وہ ایک دوسرے کو مارنے کے لئے اکٹھے کرتے رہے۔ وہ بہت پچھتائے لیکن اب ان کے پاس سسک سسک کر دم توڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

پاکستان اور ہندوستان کا حال بھی کیا بھگت رام اور صبغت اللہ جیسا ہی نہیں کہ ہر دو مما لک اپنے بجٹ کا بیشتر حصہ اسلحہ و بارود کی خریداری پر خرچ کرتے ہیں اور بڑے فخر کے ساتھ تھوڑے عرصے کے بعد کسی نئے میزائل کے کامیاب تجربے کا اعلان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اسکی رینج پچھلے والے سے زیادہ ہے جبکہ پاکستان کی 65.5 فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے رہتی ہے اور ہندوستان کے 75 فیصد لوگوں کی یومیہ آمدن دو ڈالر سے کم ہے، دونوں ملکوں کی نصف سے زیادہ آبادی کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں،، دونوں کو آلودگی اور حفظانِ صحت کے اعتبار سے آنکھیں بند کر کے دنیا کے بدترین مما لک میں شمار کیا جا سکتا ہے اور دونوں میں تعلیم کی سہولیات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس پر ستم یہ کہ آبادی میں اضافے کے اعتبار سے دنیا کے خطرناک ترین مما لک کی فہرست میں پاکستان تیسرے اور ہندوستان دوسرے نمبر پر ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستان میں 70 کروڑ لوگوں کی عمر 35 سال سے کم ہے جبکہ پاکستان کی نصف آبادی 18 سال سے کم عمر افراد پر مشتمل ہے، یہ لوگ آنے والے دنوں میں آبادی کو کہاں پہنچا دیں گے اس کا احاطہ کوئی مشکل بات نہیں اور اسکے بعد ہر دو مما لک میں بھوک، ننگ اور بیماری کا کیا عالم ہو گا اس کا اندازہ بھی بڑی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔

بھارت اور پاکستان بھی کم و بیش اسی راستے پر رواں دواں ہیں جس پر بھگت رام اور صبغت اللہ چلتے رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دونوں بھی خود بخود اپنے انجام کو پہنچ جائیں، انہیں بھی ایک دوسرے پر وہ ہتھیار استعمال کرنے کا موقع ہی نہ ملے جو انہوں نے اپنے شہریوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر ایک دوسرے کے خلاف خریدے اور ان کے پاس بھی پچھتانے اور سسک سسک کر دم توڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔

روزنامہ خبریں، 28/4/2008

تراب خان بمقابلہ محکمہ زراعت

کسی چیز کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ اس چیز کا ایک سرکاری محکمہ قائم کر دیا جائے۔ یہ زریں قول میرے عزیز دوست بلال اکبر قریشی کا ہے جس کی تائید میں وہ یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ ایک زمانہ وہ تھا جب ہمارے علاقے میں آلو گھر گھر کی فصل تھی اور ایک زمانہ یہ ہے کہ وہاں آلو کا ڈائریکٹر تو ہے لیکن آلو کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ محکمہ زراعت میں آلو کا ڈائریکٹر ہوتا ہے یا نہیں لیکن مجھے یہ ضرور معلوم ہے کہ آزاد کشمیر سے اگر زراعت کا نام ونشان مٹا تو وہ محکمہ زراعت ہی کے ہاتھوں مٹے گا۔

محکمہ زراعت کا بنیادی کام ریسرچ کے ذریعے مختلف علاقہ جات کی مناسبت سے فصلوں، پھلوں اور سبزیوں کی مختلف اقسام تخلیق کرنا، ان اقسام سے کسانوں کو متعارف کروانا، ان کے بیج کھیتوں تک پہنچانا اور زمین کی منصوبہ بندی و تیاری سے لے کر پیداوار کے حصول تک کسانوں کی معاونت و راہنمائی کرنا ہے (زمین کی منصوبہ بندی سے مراد اس بات کا تعین ہے کہ کون سی زمین کس قسم کی کاشت کے لئے موزوں ہے)۔ ریسرچ کے کام کے لئے محکمہ زراعت آزاد کشمیر میں پورے کا پورا ایک شعبہ موجود ہے جس میں تعینات لوگ ریسرچ الاؤنس تو حاصل کرتے ہیں لیکن ریسرچ کا کام نہیں کرتے۔ خود ریسرچ کرنا تو دور کی بات، اس شعبے کو تو دوسروں کی ریسرچ سے فائدہ اٹھانے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا، مثلاً فیصل آباد ریسرچ سٹیشن کی تخلیق کردہ گندم کی جو قسم ''انقلاب 96'' ایک مرتبہ آزاد کشمیر کے بارانی علاقوں میں زرعی انقلاب برپا کرنے کے لئے استعمال کی گئی وہ دراصل آبپاشی والے علاقوں کے لئے تخلیق کی گئی تھی۔ پشاور کی تخلیق کردہ مکئی کی ایک قسم مظفرآباد کے ایک نواحی گاؤں میں بیجنے کا مشورہ ایک بار غلطی سے صحیح بھی ثابت ہو گیا لیکن محکمہ زراعت کے اتنے اہلکار پہلے خود مکئی کی یہ پیدوار دیکھنے آئے اور بعد میں اتنے مہمانوں کو یہ پیداوار دکھانے لائے کہ

کاشتکار میزبان نے ان بِن بلائے مہمانوں سے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ یہ ساری کی ساری مکئی اپنے ساتھ ہی لے جائیں، خود بھی جتنا چاہے دیکھیں اور مہمانوں کو بھی جتنا جی چاہے دکھائیں لیکن آئندہ میرے پاس نہ آئیں کیونکہ میں ایک غریب آدمی ہوں اور آپ لوگوں کو کھانا کھلا کھلا کر اور چائے پلا پلا کر تنگ آ چکا ہوں۔ بیچارے کسان اور کریں بھی کیا کہ ان سے دیسی مرغے، دیسی انڈے اور دیسی گھی کھا کھا کر بھی محکمہ زراعت کے اہلکاران انکے لئے پردیسی کے پردیسی ہی رہتے ہیں۔ بیج اور کھاد کی فراہمی بھی وقت پر نہیں کی جاتی جس سے کتنا نقصان ہوتا ہوگا اس کا اندازہ اسی سے لگا لیجئے کہ گندم و مکئی کی بیجائی میں صرف ایک دن کی تاخیر سے فی کنال پیداوار میں 10 سے 20 کلو کا فرق پڑ جاتا ہے۔

محکمہ زراعت کی ''کارکردگی'' کسانوں کی اہلیت کو لے ڈوبتی ہے جس سے انکے دل ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ حوصلہ ہار کر زراعت کو ترک کرنے پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ محکمہ زراعت کے غیر پیشہ ورانہ رویّے کی وجہ سے آزاد کشمیر میں زراعت کا پیشہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے لیکن اس پر سوچنے کا وقت کسی ذمہ دار کے پاس ہے ہی نہیں۔ حکومتیں دن رات مسئلہ کشمیر اُجاگر کرنے میں مصروف رہتی ہیں اور سرکاری افسران کو ''سسٹم کی خرابی'' پر گفتگو سے فرصت نہیں ملتی۔

زراعت کے بین الاقوامی ماہرین نے آزاد کشمیر کو سبزیات کے بیجوں کی پیداوار کے لئے موزوں ترین علاقہ قرار دیا ہوا ہے جس کا عملی مظاہرہ مانسہرہ کے ایک کسان تراب خان نے گڑھی دوپٹہ (ضلع مظفرآباد) میں 400 کنال پر پھیلے ہوئے اپنے سبزی فارم میں پیش کیا۔ انہوں نے گوبھی کا ایسا عمدہ بیج تیار کیا کہ صرف تین کنال کی پیداوار تین لاکھ روپے میں فروخت ہوئی لیکن محکمہ زراعت پھر بھی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ اس علاقے میں گوبھی پیدا ہو سکتی ہے جہاں تراب خان نے پیدا کی۔ محکمہ زراعت کے پھل و سبزیات کے ایک ماہر نے تو چھ لاکھ روپۓ کی گوبھی کے تیار کھیتوں میں کھڑے ہو کر بھی تراب خان سے یہی کہا کہ بھئی یہ گوبھی یہاں کیوں

لگائی ہوئی ہے، یہ تو یہاں ہو ہی نہیں سکتی؟

مانسہرہ کی گوبھی اور آلو پاکستان بھر میں مشہور ہیں لیکن تراب خان کی 10 کلو گوبھی اسلام آباد سبزی منڈی میں مانسہرہ کی گوبھی سے 50 روپے مہنگی بِکی اور 50 کلو آلو لاہور کی سبزی منڈی میں مانسہرہ کے آلو سے 200 روپئے مہنگا فروخت ہوا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنے فارم میں ایسا اعلیٰ تمباکو کاشت کیا جو پورے ملک میں اول ٹھہرایا گیا اور پاکستان ٹوبیکو کمپنی نے انہیں 50 ہزار روپئے کی کھاد تحفے میں دی۔ وہ کہتے ہیں کہ صوبہ سرحد کی حکومت کو ہر سال تمباکو کی فصل سے 70 کروڑ روپئے کا ٹیکس حاصل ہوتا ہے تو آزاد کشمیر کو کیوں حاصل نہیں ہو سکتا؟ تراب خان مظفر آباد کی آب و ہوا کو تمباکو اور پتی کی کاشت کے لیے انتہائی موزوں جبکہ میر پور کی فضا کو آم کے لیے نہایت سازگار قرار دیتے ہیں لیکن محکمہ زراعت اس سے غافل دکھائی دیتا ہے، اگر ایسا نہیں ہوتا تو ہر دو اضلاع میں دریا اور نہر کے کنارے واقع بے شمار اراضی بنجر کیوں پڑی ہوتی؟

ایک زرعی نمائش میں تراب خان کے فارم کی 11 سبزیوں کو اول انعام کے لیے منتخب کیا گیا جنھیں دیکھ کر، تقریب کے مہمانِ خصوصی صدرِ آزاد کشمیر (وقت) جنرل محمد انور نے کہا کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ ایسی سبزیاں آزاد کشمیر میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ انہوں نے تراب خان کو بطورِ خصوصی اپنے دفتر بلوایا جہاں لے جانے سے پہلے محکمہ زراعت کے وزیر، سیکریٹری اور ڈائریکٹر جنرل نے تراب خان کی منت سماجت کی کہ ہماری آبرو رکھنے کے لیے اپنی سبزیوں کی پیداوار میں محکمہ زراعت کے کردار کی تعریف کرنا اور انہوں نے ایسا ہی کیا لیکن 5 سال گزرنے کے باوجود انعام کے 40 ہزار روپئے، دوائیاں چھڑکنے کی جنریٹر والی مشین، کھاد اور گرین ہاؤس کی پلاسٹک شیٹ ملنا تو دور کی بات انہیں تعریفی اسناد تک نہ دی گئیں۔

تراب خان کے سبزی فارم نے زلزلے کے دنوں میں بھی بڑی گراں قدر خدمات انجام دیں جب گرد و نواح کا تمام علاقہ تمام دنیا سے کٹ کر خوراک کی شدید قلت کا شکار

تھا، اسکے باوجود عالمی ادارہ برائے خوراک وزراعت نے زلزلہ زدہ علاقوں میں مفت تقسیم کے لیے جو کھادیں اور بیج بھجوائے وہ بلیک ہوتے رہے لیکن انکی ہوا بھی تراب کو نہ لگنے دی گئی۔ محکمہ زراعت کو تراب ایک آنکھ بھی نہیں بھاتے کیونکہ انکی وجہ سے اسکا پول کھل جاتا ہے۔

تراب خان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے کہ انہوں نے وسائل کی کمی کے باوجود تن تنہا وہ سب کچھ کر دکھایا جو وسائل کی کثرت کے باوجود پورے کا پورا محکمہ زراعت بھی نہیں کر سکا۔ تراب خان کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ انہوں نے اپنے سبزی فارم کے قیام میں محکمہ زراعت کا تعاون حاصل کرنے سے گریز کیا ورنہ وہ زراعت کے پیشے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر کب کے واپس مانسہرہ جا چکے ہوتے۔

روزنامہ خبریں، 13/2/2007

کیا قیامت 2012 میں ہو گی؟

(قسط اول)

مایا تہذیب 3000 سال پرانی ہے جو اُن بارانی جنگلوں اور پہاڑوں میں بسی ہوئی تھی جہاں آجکل میکسیکو، گوئٹے مالا، ہنڈوراس اور بیلاز کے علاقے آباد ہیں۔ اس تہذیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے عروج کے دور (250-900AD) میں ریاضی اور فلکیات پر بڑی دسترس رکھتی تھی۔ مثال کے طور پر وہ لوگ اُس زمانے میں بھی سورج گرہن اور چاند گرہن کا پتہ پہلے سے ہی لگا لیا کرتے تھے جیسے آج کل لگا لیا جاتا ہے، انہوں نے شمسی سال اور قمری مہینے کی جو لمبائی معلوم کی تھی وہ بالترتیب 365.2420 اور 29.53086 ہے جبکہ موجودہ دور میں جدید ترین سائنسی آلات سے دریافت کی جانے والی یہ لمبائی 365.2422 اور 29.53059 ہے، گویا اُن کی اور ہماری پیمائش میں صرف 0.0002 اور 0.00027 کا فرق ہے۔ فلکیات میں جن آلہ جات کا استعمال کیا جاتا تھا وہ پتھر سے تیار کیے جاتے تھے، انہی کے ذریعے نظامِ شمسی کا مطالعہ کیا گیا اور وہ کیلنڈر ترتیب دیا گیا جو ان دنوں دنیا بھر میں زیرِ بحث ہے کیونکہ اس کے مطابق 21 دسمبر 2012 میں زمین اپنے انجام کو پہنچ جائے گا جسے قیامت سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اس حوالے سے بنائی جانے والی ایک فلم بھی عالمگیر شہرت حاصل کر چکی ہے جس میں آج سے دو برس بعد کا متوقع منظر نامہ پیش کیا گیا ہے جو دیکھنے والوں کے بقول دل دہلا دیتا ہے، بالخصوص ان لوگوں کی تو نیند ہی اڑ جاتی ہے جو مایا کیلنڈر کی تاریخ سے واقفیت رکھتے ہیں اور اس میں درج قیامت کے وقوع پزیر ہونے کی سائنسی وجوہات مختلف ویب سائٹس پر پڑھتے ہیں۔

ریاضی کی ایک لیکچرر انتہائی پریشانی کے عالم میں کہہ رہی تھیں کہ اگر زمین اپنا محور تبدیل کر دے تو کچھ عجب نہیں کہ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اُڑنے لگیں؟ ہم سب جانتے ہیں کہ زمین بیک وقت سورج کے گرد بھی گھومتی ہے اور اپنے محور کے گرد بھی، سورج کے گرد

ایک چکر کاٹنے میں 365 دن لگتے ہیں جس سے موسم بنتے ہیں اور اپنے محور کے گرد ایک چکر کاٹنے میں 24 گھنٹے لگتے ہیں جس سے دن رات بنتے ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ سورج ہماری کہکشاں کے وسط میں آ جائے گا جس سے نظام شمسی میں بڑے گھمبیر واقعات رونما ہونگے، انہی میں سے ایک واقعہ مختلف سیاروں کے محور کی تبدیلی کا ہوگا جو 26 ہزار سال میں ایک مرتبہ ضرور ظہور پزیر ہوتا ہے، یہ عمل نیپچون میں شروع ہو چکا ہے یا ہونے والا ہے جس کے بعد پلوٹو کا نمبر آئے گا اور اس کے تین مہینے بعد زمین کی باری آ جائے گی۔ پلوٹو میں اس عمل کا آغاز ہوتے ہی آسمان پر ایک سرخ دھبا نمودار ہونا شروع ہو جائے گا جو بڑھتے بڑھتے جب اتنا بڑا ہو جائے گا کہ کسی سائنسی آلے کے بغیر بھی دکھائی دینے لگے گا تو اس کے ٹھیک 6 ہفتے بعد زمین بھی اپنا محور تبدیل کر دے گی، اور وہ اسطرح کہ پہلے زمین تین روز کے لیے بالکل ساکت ہو جائے گی یعنی اس کی گردش تھم جائے گی اور پھر ایک گھنٹے کے اندر اسکے محور میں 90 ڈگری کی تبدیلی واقع ہوگی یعنی خطِ استوا کچھ اسطرح اپنی موجودہ جگہ سے ہٹ جائے گا کہ جہاں اب نارتھ پول ہے وہاں ساؤتھ پول ہوگا اور جہاں ساؤتھ پول ہے وہاں نارتھ پول، اس تبدیلی کے دوران زمین میں واقع ہر شے الٹ پلٹ جائے گی، جہاں خشکی ہے وہاں پانی ہوگا اور جہاں پانی ہے وہاں خشکی۔ ہوائیں 200 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے لگیں گی جن سے بڑے وسیع پیمانے کے سونامی اور طوفان جنم لیں گے، زمین پر جتنے بھی آتش فشاں ہیں سب کے سب لاوا اگلنے لگیں گے، پہاڑ فی الواقعہ روئی کے گالوں کی طرح اُڑیں گے اور سمندروں کے نیچے موجود آتش فشاؤں کے پھٹنے سے پانیوں میں آگ بھڑک اٹھے گی۔ اس ایک گھنٹے کے اندر اندر کرہ ارض کی دو تہائی آبادی بڑے ہی اذیت ناک طریقے سے موت کے گھاٹ اتر جائے گی، جو ایک تہائی بچے گی اس کا 20 فیصد اگلے 6 مہینوں میں سسک سسک کر دم توڑ دے گا کیونکہ آتش فشاؤں کے پھٹنے سے زمین پر راکھ کی اتنی موٹی تہہ جم جائے گی کہ لوگ نصف برس تک سورج سے مکمل طور پر محروم رہیں گے، انسانوں کی موجودہ آبادی کا صرف

10 فیصد حصہ باقی رہے گا جو 60 کروڑ کے لگ بھگ بنتا ہے۔ یہ قیامت کی گھڑی بعض لوگوں کے خیال میں طوفانِ نوح کی طرح رونما ہوگی جس کے بعد ہر طرف پانی ہی پانی دکھائی دے گا۔

کئی ویب سائٹس کے مطابق اس ہولناک دن کی تصدیق ناسا نے بھی کر دی ہے جس سے بچنے کے لیے ناسا کے سائنسدان پہلے تو مریخ پر جانے کی منصوبہ بندی کرتے رہے لیکن اس میں ناکامی کے بعد وہ ایک ایسا خلائی سٹیشن تیار کر رہے ہیں جو زمین کے محور کی تبدیلی کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تاکہ اس میں موجود لوگ ممکنہ خطرے سے محفوظ رہیں، خلائی تحقیق میں مہارت رکھنے والی دیگر قومیں بھی اس دن سے بچنے کے لیے اقدامات کر رہی ہیں مثال کے طور پر روس نے ''یامن تاؤ'' نام کا ایک زیرِ زمین شہر تعمیر کر لیا ہے جس میں 60000 لوگوں کے رہنے کی گنجائش موجود ہے اور جہاں ضرورت کے مطابق 6 مہینے سے زیادہ کی خوراک بھی ذخیرہ کی جا سکتی ہے تاکہ زمین کے محور میں 90 ڈگری تبدیلی والے قیامت خیز گھنٹے کے بعد اُس نصف برس سے بھی محفوظ رہا جا سکے جب سورج کی دھوپ زمین تک نہیں پہنچ سکے گی، اسی طرح کے شہر یورپی ممالک میں بھی تعمیر کیے جا رہے ہیں۔

''خوفِ خدا'' رکھنے والے کئی لوگ اس قسم کے ایس ایم ایس اور ای میل بھیج رہے ہیں کہ 21 دسمبر 2012 کو جمعۃ المبارک کے علاوہ اسلامی کیلنڈر کے حساب سے 10 محرم بھی ہوگا، اس دن کے بارے میں کی جانے والی پیش گوئیوں کی حقیقت کیا ہے؟ یہ سوال مجھ سے میرے کئی قارئین پوچھ چکے ہیں جس پر شروع شروع میں تو میں نے کوئی توجہ نہیں دی لیکن جب کئی سیدھے سادے اور معصوم لوگوں کو بے حد پریشان دیکھ کر یہ ڈر لگنے لگا کہ کہیں انہیں ''ڈپریشن'' ہی نہ ہو جائے، تو سوچا کہ اس سوال کا جواب سنجیدگی سے دینے کی کوشش کرنی چاہیے لیکن اس سے پہلے ضروری تھا کہ سوال کا درست ادراک کر لیا جائے چنانچہ آج کے کالم میں سوال کا جائزہ لگانے کی سعی کی ہے، جواب اگلے کالم میں عرض کروں گا۔

روزنامہ جناح، 12/1/2010

کیا قیامت 2012 میں ہو گی؟

(قسط 2)

سولہویں صدی کا معالج اور ماہرِ فلکیات ناسٹرا ڈیمس (Nostradamus) طاعون کے علاج کا ماہر تھا لیکن اس کا اپنا کنبہ اسی وبا سے ہلاک ہو گیا جس کے بعد اس نے غالبًا ڈپریشن کا شکار ہو کر ڈاکٹری چھوڑ دی اور دنیا بھر کے حکمرانوں کو خط لکھ لکھ کر مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات سے خبردار کرنا شروع کر دیا۔ کسی ماہرِ نفسیات سے پوچھ کر دیکھیے کہ کیا ڈپریشن میں انسان کسی پریشانی یا پشیمانی کے باعث ایک ان دیکھے خوف میں مبتلا ہو کر دوسروں کو بھی ڈرانا نہیں شروع کر سکتا؟ بہرطور ناسٹرا ڈیمس پر ''وہ شخص جس نے آنے والا کل دیکھا'' (The man who saw tomorrow) کے نام سے دستاویزی فلم بنائی گئی جو ہمارے بچپن کے دنوں میں بہت مشہور ہوئی تھی، اس شخص نے جو پیش گوئیاں کیں انہیں کئی لوگ زبردستی سچ ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں مثلاً نائن الیون کا واقعہ جس میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر تباہ ہوا، اس تباہی کو ناسٹر ڈیمس کی اس پیش گوئی سے تعبیر کیا جاتا ہے جس میں اس نے کسی بڑے شہر کے نیست و نابود ہونے کا عندیہ دیا اور اس کے فوراً بعد جنگِ عظیم سوئم کی وارننگ دی تھی۔ تو کیا کوئی شہر ''زمین بوس'' ہوا؟ نائن الیون کے واقعہ میں تو صرف ایک عمارت گری تھی؟ اور تیسری جنگِ عظیم بھی کہاں ہوئی؟ ناسٹراڈیمس نے 2006 میں ایک ایسے عالمگیر حکمران (جسے بش بتایا گیا) کے قتل کی پیش گوئی بھی کی تھی جس کے باعث دنیا میں بھوک ننگ اور بدامنی پھیلے گی، 2006 گزر گیا لیکن بش نہ گزرا تو کہا جانے لگا کہ ناسٹراڈیمس کی پیش گوئیاں اس کی بتائی ہوئی تاریخ سے ایک دو سال پہلے یا بعد میں پوری ہوا کرتی ہیں لیکن تین چار سال گزرنے کے بعد بھی کیا بش زندہ نہیں؟

قیامت کی پیش گوئی بھی کوئی نئی بات نہیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب (اُس وقت تک کی) سب سے بڑی خلائی لیبارٹری ''سکائی لیب'' زمین پر گرنے والی تھی تو میں سکول میں

پڑھتا تھا اور دن بھر مختلف ''بزرگوں اور سائنسدانوں'' کے حوالے سے یہی سنتے اور ڈرتے رہتے تھے کہ قیامت آنے والی ہے لیکن 11 جولائی 1979 کو سکائی لیب کے گرنے سے بھی حشر برپا نہ ہوسکا کیونکہ اس کا بیشتر حصہ سمندر برد ہوگیا اور جو خشکی تک پہنچا وہ بھی غیر آباد علاقوں میں گرا۔ میں تو 21 دسمبر 2012 کی متوقع قیامت کو بھی سکائی لیب والی قیامت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا اور یقین رکھتا ہوں کہ یہ کالم پڑھنے کے بعد آپ بھی ایسا ہی کریں گے۔

سب سے پہلے تو آیئے اس ''حقیقت'' پر کہ ناسا نے اس ''قیامت'' کی تصدیق کر دی ہے، تو بات یہ ہے کہ میں نے ناسا کی سرکاری ویب سائٹ خود دیکھی (آپ بھی دیکھ سکتے ہیں)، مجھے تو وہاں ایسی کوئی تصدیق دیکھنے کو نہیں ملی البتہ یہ ضرور پتہ چلا کہ ناسا نے 2010-2020 کی دہائی کو مریخ تک رسائی حاصل کرنے کے حوالے سے اہم ترین قرار دیا ہے نیز 2020 میں چاند پر ایک مرتبہ پھر قدم رکھنے کا پروگرام طے کیا گیا ہے جس کے لیے مزید رقم بھی مانگی گئی ہے اور اس مطالبے کا جائزہ لینے اور یہ طے کرنے کے لیے کہ ایک مرتبہ پھر چاند پر جانا فائدہ مند بھی ہے یا نہیں، صدر اوبامہ نے ریٹائرڈ خلائی منتظم نارمن آر آگسٹائن کی سربراہی میں ''ہیومن سپیس فلائٹ پلان کمیٹی'' بھی تشکیل دے دی ہے۔ اگر ناسا نے اس پیش گوئی کی تائید کی ہو کہ 2012 میں قیامت آنے والی ہے تو کیا 2020 میں چاند پر جانے اور مریخ تک رسائی کی تحقیق کو فیصلہ کُن مرحلے تک پہنچانے کا ٹارگٹ مقرر کیا جا سکتا ہے؟ رہی یہ بچگانہ بات کہ ناسا کے سائنسدان چپکے چپکے ہی ایک ایسا خلائی سٹیشن بنا رہے ہوں جس میں وہ متوقع قیامت سے محفوظ رہیں گے، تو میں اسے اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ اس پر کوئی تبصرہ کیا جائے؟

اب آیئے 2012 کی قیامت سے بچنے کے لیے بننے والے شہروں کی طرف۔ کچھ شک نہیں کہ روس میں ''یامن تاؤ'' نامی پہاڑ کے نیچے ایک شہر تعمیر کیا گیا جس میں ساٹھ ہزار لوگوں کے رہنے کی جگہ موجود ہے لیکن وہ تو سرد جنگ کے دنوں میں ایٹمی جنگ سے بچاؤ کی

خاطر بنایا گیا تھا، اسی لیے تو اس کی چھت اسطرح کی تیار کی گئی ہے کہ نصف درجن ایٹم بم بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ جہاں تک یورپ، کینڈا وغیرہ کی زیرِ زمین تعمیرات کا تعلق ہے تو انہیں بنائے جانے کے مقاصد شدید سردی اور برفباری سے بچنا اور پرانے شہروں کو اپنی اصلی حالت میں قائم رکھنا ہے تا کہ ان میں موجود یادگاریں محفوظ رہ سکیں جو عظیم ثقافتی ورثہ اور سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہیں۔ بفرضِ محال ان زیرِ زمین تعمیرات کا مقصد 2012 کی قیامت سے بچاؤ ہی تصور کرلیا جائے تو کیا چانداور مریخ کو پایاب کرنے والوں سے اس حماقت کی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اس تباہی سے بچنے کے لیے جو زمین کے محور میں 90 ڈگری تبدیلی کی وجہ سے ہو گی، زمین کے اندر گھس جائیں؟ زمین کی سطح پر تو پھر بھی بچنے کا کوئی امکان ہوسکتا ہے لیکن زمین کے اندر رہ کر کیا زمین کے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں سے بچنا اور بھی ناممکن نہیں ہوگا؟

ان اعداد وشمار پر بھی ذرا غور کیجئے کہ ''دنیا کی دو تہائی آبادی ایک گھنٹے کے اندر دم توڑ دے گی جو بچے گی اس کا 20 فیصد اگلے چھ مہینوں میں ختم ہو جائے گا اور باقی رہے گا دنیا کی آبادی کا صرف 10 فیصد حصہ یعنی 60 کروڑ لوگ''۔ گویا دنیا کی آبادی چھ ارب تصور کی گئی ہے (جو دراصل ساڑھے چھ ارب سے بھی زیادہ ہے، بہرطور) اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے گھنٹے میں چار ارب لوگ لقمہءاجل بن جائیں گے اسکے چھ مہینے بعد دو ارب کا 20 فیصد یعنی 40 کروڑ مر جائیں گے تو باقی بچنے والوں کی تعداد تو ایک ارب ساٹھ کروڑ بنتی ہے؟ بفرضِ محال کل آبادی کے 20 فیصد کو بھی مار دیا جائے تو بھی بچنے والوں کی تعداد 60 کروڑ نہیں بن سکتی بلکہ 80 کروڑ بنتی ہے؟

جہاں تک مایا تہذیب کا تعلق ہے تو وہ ریاضی اور فلکیات حوالے سے ہی معروف نہیں بلکہ کنواری لڑکیوں کو دیوتاؤں کے بھینٹ چڑھانے کے حوالے سے بھی مشہور ہے، ایسے جاہل لوگوں کی پیش گوئیوں پر کان دھرنا دانشمندی نہیں۔ مایا کیلنڈر کو آسمانی صحیفہ قرار دے دیا جائے تو بھی وہ 2012 میں وقت کے ختم ہونے کا اعلان نہیں کرتا بلکہ ایک cycle پورا ہونے کی

اطلاع دیتا ہے بالکل ویسے ہی جیسے رات کے 12 بجے ایک دن اور 31 دسمبر کو ایک سال ختم ہوتا ہے جسکے بعد ایک نیا دن اور ایک نیا سال شروع ہوتا ہے لیکن اسکے اوقات یا دنوں کی ترتیب وہی پرانی ہوتی ہے؟ کیا کوئی ذی شعور یہ سوچ سکتا ہے کہ رات 12 بجے کے بعد وقت ختم ہو جائے گا کیونکہ 13 نہیں بجا کرتے یا یہ سوچ سکتا ہے 31 دسمبر کے بعد کچھ باقی نہیں رہے گا کیونکہ 32 دسمبر کبھی نہیں آتا؟

آخر میں 2012 کے لندن اولمپکس ذہن میں لائیے اور سوچیے کہ ان کی تیاری کیا اس لیے زور وشور سے کی جا رہی ہے کہ یہ قیامت سے پہلے کے آخری اولمپکس ہیں؟ اگر 2012 میں قیامت ہی آنی ہے تو کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ برطانیہ کی حکومت بے شمار دولت اور محنت ان کھیلوں پر سرف کرنے کے بجائے ان زیرِ زمین شہروں یا خلائی سٹیشنوں پر خرچ کرے جو روزِ حشر سے بچا سکتے ہیں؟

یہ بات صرف خدا ہی کہہ سکتا ہے کہ قیامت فلاں سال فلاں مہینے اور فلاں تاریخ کو آ سکتی ہے اور خدا نے ایسا کچھ نہیں کہا البتہ اُس نے یہ ضرور کہا ہے کہ جب قیامت آئے گی تو کوئی اسکی لپیٹ سے بچ نہیں سکے گا چاہے وہ پاتال میں ہی کیوں نہ چلا جائے۔

روزنامہ جناح، 13/1/2010

امکان

نہ زمانے کی آنکھ نے ایسا بھیانک منظر دیکھا تھا نہ ہی وقت کی کوکھ سے ایسے الم ناک لمحے نے کبھی جنم لیا تھا۔ 6 اگست 1947 کو جاپانی اوقات کے مطابق صبح کے ٹھیک سوا آٹھ بجے تھے، 'اینولا گے' نامی بی 29 بمبار طیارے کے ذریعے امریکہ نے جاپان کی ساتویں بڑے شہر ہیروشیما پر ''لٹل بوائے'' (Little boy) نامی ایٹم بم گرادیا، جو زمین کی سطح سے 1900 فٹ کی بلندی پر اتنی قوت سے پھٹا جتنی قوت سے 15000 ٹن بارود ایک ساتھ پھٹتا ہے اور 90 فیصد عمارتیں ملیا میٹ ہوگئیں۔ اس منظر نے ''اینولا گے'' کے پائلٹ (پال ڈبلیو ٹبت) تک کو لرزا کر رکھ دیا اور اس کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے کہ ''اے خدا! یہ ہم نے کیا کر دیا''۔ ہیروشیما پگھل گیا لیکن امریکی حکومت کا دل نہیں پگھلا اور تین دن بعد یعنی 9 اگست کو ٹھیک گیارہ بجکر دومنٹ پر 'باکس کار' نامی بی 29 بمبار طیارے کے ذریعے امریکہ نے جاپان کے دوسرے شہر ناگاساکی پر 'فیٹ مین'' (Fat man) نامی دوسرا ایٹم بم داغ دیا جو زمین کی سطح سے 1800 فٹ کی بلندی پر اتنی قوت سے پھٹا جتنی قوت سے 22 ہزار ٹن بارود ایک ساتھ پھٹتا ہے اور 39 فیصد عمارتیں زمین بوس ہوگئیں۔

ایٹم بموں کے پھٹنے سے جو روشنی پیدا ہوئی اس نے درجہ حرارت کو ستر ہزار فارن ہیٹ تک بڑھادیا اور اسکے ساتھ ہی ہوائیں ایک ہزار پانچ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے لگیں۔ پہلے دھماکے سے ایک لاکھ 40 ہزار اور دوسرے سے 80 ہزار لوگ بڑے ہی اذیت ناک طریقے سے موقع پر ہی ہلاک ہو گئے جبکہ ہزاروں زخمی بعد ازاں سسک سسک کر دم توڑ گئے۔ زخمیوں کی تعداد شمار سے باہر ہے کیونکہ تابکاری کے اثرات آج بھی لوگوں کو گھائل کر رہے ہیں، اسی لئے تو ہیروشیما اور ناگاساکی کی زمین نصف صدی کے بعد بھی، بانجھ ہے۔ وہاں کوئی فصل نہیں اگتی اور آج بھی کئی بچے پیدائشی طور پر معذور ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر دل دہل جاتا ہے۔

ایٹم بم نوع انسانی کی بدترین دشمنوں میں سے ایک ہے لیکن افسوس کہ جنہوں نے اسے بنالیا ہے وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور جنہوں نے نہیں بنایا وہ دن رات اسے بنانے کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔کوئی یہ بھی نہیں سوچتا کہ جس ترقی یافتہ دنیا کے مزے ہم لوٹ رہے ہیں اسے موجودہ حالت تک آنے میں تو کروڑوں برس لگ گئے لیکن ایٹمی جنگ کی صورت میں پرانی حالت تک جانے میں چند لمحے بھی نہیں لگیں گے۔کل کے ایٹم بم کی لائی ہوئی تباہی کو ذہن میں رکھیے اور سوچیے کہ آج کا ایٹم بم (جو کل کے ایٹم بم سے کہیں زیادہ طاقتور ہے) کتنی بربادی لاسکتا ہے؟

کاش انسان اپنے وسائل اسلحہ و بارود پر ضائع کرنے کے بجائے دنیا کے طول وعرض میں پھیلی ناانصافی، لاقانونیت اور کرپشن کے خاتمے پر خرچ کرے تاکہ انسانیت غربت اور جہالت کے بے رحم چنگل سے آزاد ہو کے اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر سکے۔کاش ہم یہ جان سکیں کہ ایٹم بم ہماری کتنی روشن تاریخ کا کتنا تاریک باب ہے، کتنے تہذیب یافتہ دور کی کتنی بدتہذیب ایجاد ہے۔کاش تمام ایٹم بم بلاتخصیص تلف کر دیے جائیں کیونکہ جب تک کسی ایک کے پاس بھی ایٹم بم ہے، دوسروں کو اس سے باز نہیں رکھا جاسکتا۔یہ سوچ کر سانس رکنے لگتی ہے کہ اگر ایٹمی جنگ چھڑ گئی تو دنیا کس حال کو پہنچ جائے گی؟''امکان'' کے عنوان سے ایٹمی دھماکوں پر کہی اپنی ایک نظم یاد آ رہی ہے جس پر آج کا کالم اپنے انجام کو پہنچتا ہے کہ

ممکن ہے پربت سے آتے بادل راہ بدل جائیں
ممکن ہے کہ اپنے سائے اپنی دھوپ میں جل جائیں
صدیوں کی خاموش مسافت ایک گھڑی کے پیچھے ہو
شہر کی ساری نقل مکانی ایک جھڑی کے پیچھے ہو
جیون بھر کی پیاس اشکوں کی ایک لڑی کے پیچھے ہو
ہوسکتا ہے قہر کی دھوپ بھری ہو ٹھنڈی چھاؤں میں

ہو سکتا ہے موت کی ممتا پوشیدہ ہو ماؤں میں
ہو سکتا ہے مہلک زہر گھلا ہو صاف ہواؤں میں
ہو سکتا ہے آگ بھڑک اُٹھے گھنگور گھٹاؤں میں
ہو سکتا ہے ہو تیزاب کی بارش اپنے گاؤں میں
ممکن ہے نفرت کی آگ میں پیار کے منظر جل جائیں
ممکن ہے اَن دیکھے ہاتھ ہمارے پھول مسل جائیں
ممکن ہے ہو جائیں موم چٹانیں سنگ پگھل جائیں
ممکن ہے اک اشک میں اپنے سات سمندر ڈھل جائیں
ہر رستہ ہر قافلہ اک مرجھائی کلی کے پیچھے ہو
آدم کا ہر ایک سفر اک بند گلی کے پیچھے ہو
ممکن ہے کہ اپنا یہ اندیشہ بھی ناممکن ہو
ممکن ہے نفرت کی شب میں پیار کا قصہ ممکن ہو
ممکن ہے ظلمت کے دور میں نور کا چرچا ممکن ہو
ممکن ہے شاداب ہو دھرتی دشت میں دریا ممکن ہو
ممکن ہے تصویر میں گزرے وقت کا چہرہ ممکن ہو
ممکن ہے ادراک کے پنچھی صدیوں دور نکل جائیں
ممکن ہے جلتے صحرا میں سرد ہوائیں چل جائیں
ممکن ہے گرنے سے پہلے آدم زاد سنبھل جائیں

روزنامہ خبریں، 9/8/2007

غربت سے نجات کیونکر ممکن ہے

یہ ضروری نہیں کہ جس ملک کے پاس قدرتی وسائل زیادہ ہوں وہ امیر اور جسکے پاس کم ہوں وہ غریب ہو۔ ہم قدرتی وسائل سے مالا مال ہیں جبکہ جاپان کے پاس جو تھوڑا سا رقبہ ہے اس میں بھی 80 فیصد پہاڑ ہیں جہاں فصلیں اگائی جا سکتی ہیں نہ مال مویشی پالے جا سکتے ہیں، ہمارے برعکس جاپان اپنے کارخانوں میں استعمال ہونے والا خام مال بھی دوسرے ممالک سے خریدتا ہے لیکن ہم ایک بھوکا ننگا ملک ہیں جبکہ وہ دنیا کے مضبوط ترین معاشی ممالک میں سے ایک ہے۔ ایک اور مثال سوئٹزرلینڈ کی ہے جہاں کوکا (cocoa) کا پودا (جس سے چاکلیٹ بنتا ہے) پیدا ہی نہیں ہوتا لیکن وہاں دنیا کا بہترین چاکلیٹ تیار کیا جاتا ہے۔ اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کس ملک کی عمر کتنی ہے۔ ہندوستان اور مصر دو ہزار سال کے ہو کر بھی مفلسی اور پسماندگی کی چکی میں پس رہے ہیں جبکہ کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ ڈیڑھ ڈیڑھ سو سال کے ہو کر بھی امیر اور ترقی یافتہ ہیں۔ امیر اور غریب ممالک کے مینجمنٹ ایگزیکٹوز کی ذہانت و صلاحیت میں بھی ترقی یافتہ قوموں کے اپنے منتظمین کے بقول کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ رنگ و نسل کی بھی اگر کوئی اہمیت ہوتی تو ایشیا کے پسماندہ ممالک سے نکمّے لوگ، یورپ کے امیر ممالک میں جا کر کارآمد نہ بن پاتے۔

امیر اور غریب قوموں میں فرق دراصل رویّے کا ہوتا ہے جو وسائل، عمر، ذہانت، رنگ، نسل وغیرہ سے نہیں بنتا بلکہ تعلیم، تربیت اور ثقافت سے بنتا ہے۔ ماہرین نے ترقی یافتہ قوموں کے عمومی رویّے کا تجزیہ کیا تو پتہ چلا کہ اس کی بنیاد 9 چیزوں پر قائم ہوتی ہے۔ پہلی ضابطہء اخلاق، دوسری عزتِ نفس و خودداری، تیسری احساسِ ذمہ داری، چوتھی قانون کا احترام، پانچویں دوسروں کے حقوق کی پاسداری، چھٹی کام سے محبت، ساتویں بچت اور خرچ کا سلیقہ، آٹھویں کوئی بڑا کام کرنے کی لگن اور نویں وقت کی پابندی۔

ہم غریب اس لیے ہیں کہ ہماری اکثریت ضابطہء اخلاق کی پابندی نہیں کرتی۔ کیا

ہمارے حکمران ملک ،قوم اور آئین سے وفاداری کا حلف اٹھا کر بے وفائی نہیں کرتے ؟ کیا ہمارے جج آئین کے بجائے پی سی او کے تحت حلف نہیں اٹھاتے ؟ کیا ہمارے افسران و اہلکاران سرکاری اثاثوں کی حفاظت ویسے ہی کرتے ہیں جیسے اپنی املاک کی کرتے ہیں؟ کیا ہمارا میڈیا ''کمرشلائز'' نہیں ہو چکا؟ کیا ہمارے ڈاکٹر مرضی کی فیس لے کر بھی مریض کو وہ مسکراہٹ اور توجہ دیتے ہیں جو ویسے بھی دینی چاہیے؟ کیا ہمارے اساتذہ اپنے شاگردوں کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتے ہیں؟ کیا ہمارے دکاندار زیادہ قیمت میں کم کوالٹی کی اشیاءفروخت نہیں کرتے ؟ کیا ہم اپنے وطن کا خیال ایسے ہی رکھتے ہیں جیسے اپنے گھر کا رکھتے ہیں؟ ہم غریب اس لیے ہیں کہ ہماری اکثریت عزتِ نفس وخودداری سے محروم ہے۔ہم میں کتنے لوگ ایسے ہونگے جوصداقت وامانت کی راہ پر چلتے ہیں، کتنے خود احتسابی کے عمل سے گزرتے ہیں، کتنے اپنے وسائل کے مطابق زندگی گزارنے میں سنجیدہ ہیں اور کتنوں کو حلال کی کمائی سے اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پالنے کی لگن ہے؟ ہم غریب اس لیے ہیں کہ ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں۔ہم میں کتنے لوگ اس بات کا دعوی وثوق سے کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے فرائض احسن طریقے سے انجام دے رہے ہیں؟ ہم غریب اس لیے ہیں کہ ہمیں قانون کا احترام چھو کر بھی نہیں گزرا۔کیا دنیا میں کوئی اور ملک بھی ایسا ہوگا جہاں فوج کا سربراہ اعلی عدلیہ کے 60 ججوں کو اپنے عہدوں سے برطرف کر کے معصوم ومعذور بچوں سمیت قید کر لے؟ کیا کہیں اور ایسی کوئی مثال ملتی ہے کہ آئین کو پامال کرنے والے آمر کو ایک جمہوری حکومت میں ''سلامی'' پیش کی جائے اور آئین کی پاسداری کرنے والے ججوں کو رُسوا کیا جائے؟ کیا ہم قانون توڑنے میں فخر محسوس نہیں کرتے ؟ کیا ہمارے یہاں جو جتنے بڑے عہدے پر فائز ہے وہ خود کو قانون سے اتنا ہی مبرا نہیں سمجھتا؟ کیا ہماری حکومتیں عدالتوں کو تابعِ فرمان رکھنے کی خواہشمند نہیں ہوتیں؟ کیا ہمارے حکمران عدالتوں اور عدالتی فیصلوں کا احترام کرتے ہیں؟ ہم غریب اس لیے ہیں کہ انتہا درجے کے خودغرض ہیں اور وہ سب کچھ بھی اپنے لیے سمیٹ لینا چاہتے

ہیں جس پر دوسروں کا حق ہے؟ ہم غریب اس لیے ہیں کہ ''وقت گزاری'' ہمارا قومی نصب العین ہے اور ہم پرلے درجے کے کام چور ہیں۔ اور تو اور کسی محنت کش سے بھی تھوڑی دیر کے لیے نگاہ ہٹا لی جائے تو وہ محنت سے جی چرانے لگتا ہے۔ ہم غریب اس لیے ہیں کہ ہمیں جہاں خرچ کرنا ہوتا ہے وہاں بچاتے ہیں اور جہاں بچانا ہوتا ہے وہاں خرچ کرتے ہیں؟ بھکاری کو تو پچاس سو کا نوٹ بھی خوشی سے دے دیتے ہیں لیکن ایک اخبار فروش سے چند سکّوں کا اخبار خریدتے ہوئے جان جاتی ہے؟ ہم غریب اس لیے ہیں کہ لکیر کے فقیر ہیں، کسی کو کوئی نیا اور بڑا کام کرنے کی لگن نہیں؟ بلکہ ہمارا حال تو یہ ہے کہ میرے بچپن کے ایک کلاس فیلو عطا اللہ جیسا کوئی بچہ بڑا ہو کر سائنسدان بننے اور نیوٹن جیسا کوئی کام کرنے کا ارادہ ظاہر کرے تو (اساتذہ سمیت) سارا سکول اس پر ہنسنے لگتا ہے۔ اپنے تعلیمی اداروں کا سروے کر کے دیکھیے، آپ کو شاید ہی کوئی بچہ ایسا ملے جو کچھ ''ایجاد'' کرنے کا خواب بھی دیکھتا ہو۔ ہم غریب اس لیے ہیں کہ ہمیں وقت کی قدر و قیمت کا احساس نہیں۔ کیا ہم کہیں بھی وقت پر پہنچتے ہیں بلکہ ہمارے یہاں تو جسکا جتنا بڑا رتبہ ہوتا ہے وہ اتنی ہی دیر سے پہنچتا ہے۔ کیا ہمارے دفاتر کے سربراہان بالعموم سب سے لیٹ نہیں آتے؟ کیا ہمارے یہاں عام طور پر تقاریب طے شدہ وقت سے کہیں بعد شروع نہیں ہوتیں؟

اگر ہم امیر اور ترقی یافتہ قوم بننا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے رویّے میں تبدیلی لانی ہوگی اور اپنے کردار کی بنیادان 9 چیزوں پر استوار کرنی ہوگی جو ہماری غربت اور پسماندگی کی اصل وجہ ہیں بصورت دیگر ہمیں اپنے عبرت ناک انجام سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

روزنامہ جناح، 16/02/2010

ایک عید کے دو چاند

انسان نے چاند پر قدم رکھا تو ایک عالم صاحب نے یہ علمی اعتراض اٹھایا تھا کہ چاند پر اتنی جگہ ہی کہاں ہوتی ہے کہ جس پہ انسان کھڑا ہو سکے۔ موصوف زندہ ہوتے تو یہ جان کر حال کیا ہوتا کہ اب انسان مرّیخ پر قدم رکھنے والا ہے جو اتنا چھوٹا ہے کہ نظر بھی نہیں آتا؟

علامہ احسان الٰہی ظہیر نے کیا معلوم کس بات پر یہ کہا تھا کہ جنرل ضیاالحق نے ایسے لوگوں کو چاند دیکھنے پر مامور کر دیا ہے جنہیں سورج بھی دکھائی نہیں دیتا، لیکن یہ بات بھی کیا خوب نہیں کہ چاند کے وجود کو اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک ننگی آنکھ سے نہ دیکھ لیا جائے؟ یہ تو کیا ایسے ہی نہیں ہوا کہ کوئی طلوعِ صبح کو ماننے سے اس لیے انکار کر دے کہ آسمان بری طرح ابر آلود ہے اور کالے کالے بادلوں نے سورج کو چھپا رکھا ہے؟ کچھ شک نہیں کہ حضورؐ کے زمانے میں چاند کو ننگی آنکھ سے ہی دیکھا جاتا تھا لیکن اسکی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان وقتوں میں اس کام کا اس سے باوثوق ذریعہ کوئی اور تھا ہی نہیں، بالکل ایسے ہی جیسے اُس زمانے میں ڈاک بھیجنے کے لیے گھوڑوں اور اونٹوں سے استفادہ کیا جاتا تھا، تو اس کا مطلب کیا یہ لیا جا سکتا ہے کہ گاڑیوں اور جہازوں کے ذریعے خطوط بھیجنا حرام ہے؟ سائنسی آنکھ سے دکھائی دینے والے چاند کو نہ ماننے والے، کیا اپنے موبائل پر ایس ایم ایس کے ذریعے موصول ہونے والے پیغام کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کرتے؟ اگر چاند کے نکلنے کا یقین اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک اسے ننگی آنکھ سے نہ دیکھ لیا جائے تو پھر گردے میں پیدا ہونے والی پتھری، پھیپھڑوں میں پڑنے والے پانی یا خون میں ہونے والی انفیکشن کا یقین اسے ننگی آنکھ سے دیکھے بغیر کیوں کر لیا جاتا ہے؟ چاند دیکھنے کے لیے ننگی آنکھ لازمی ہے تو آپریشن کے لیے ننگا ہاتھ کیوں لازمی نہیں؟ ماہرینِ فلکیات کے آلات حرام ہیں تو ماہرینِ سرجری کے آلات کیوں حرام نہیں؟ اگر چاند کو 1400 سال پرانے طریقے سے دیکھنا ضروری ہے تو دانت کا علاج 1400 سال پرانے طریقے سے کرنا کیوں ضروری نہیں؟ اگر طِب کے

بارے میں طبیب کی رائے پر مولوی صاحب کی رائے کو ترجیح نہیں دی جاسکتی تو فلکیات کے بارے میں ماہرِ فلکیات کی رائے پر کیسے دی جاسکتی ہے؟

کتنی حیرت کی بات ہے کہ رویتِ ہلال کمیٹی کے اراکین ایک طرف تو چاند کو دیکھنے کے لیے دوربین کا استعمال کرتے ہیں لیکن دوسری طرف ننگی آنکھ پر ان سائنسی ایجادات کی فوقیت تسلیم کرنے کو تیار نہیں جنکی رسائی دوبین سے کہیں زیادہ ہے؟ کیا انہیں یہ معلوم نہیں کہ دوبین بھی تو سائنس ہی کی ایک ایجاد ہے؟ ایک عالم صاحب تو رویتِ حلال کمیٹی کے فاضل اراکین سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے جب انہوں نے نظر کی عینک پہن کر یہ فتوی صادر فرمایا کہ دوربین سے چاند کو دیکھنا حرام ہے؟ یہ ہیں ہمارے صاحبانِ علم جنہیں یہ تک معلوم نہیں کہ نظر کی عینک دراصل دوربین ہی کی ایک شکل ہوتی ہے؟ ان لوگوں کو کوئی کیسے سمجھائے کہ جن دنوں چاند کو ننگی آنکھ سے دیکھا جاتا تھا اس زمانے میں قرآن کو بھی ننگی آنکھ سے ہی پڑھا جاتا تھا، تو پھر جن لوگوں کی نظر کمزور ہے اگر وہ عینک لگا کر قرآن کو پڑھیں تو کیا یہ حرام ہوگا؟ یہ بات بھی سمجھ سے بالا تر ہے کہ رویتِ ہلال کمیٹی کے اجلاس بند کمرے میں کیوں منعقد کیے جاتے ہیں، چاند نظر آنے کا اعلان نہ ہوا، ایٹم بم کے کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم کا معاملہ ہوا جسے کھلے عام زیرِ بحث نہیں لایا جاسکتا؟ آخر لوگوں کو بھی تو کچھ پتہ چلے کہ بند کمرے میں ایسے کونسے ''علمی و دینی'' امور زیر بحث آتے ہیں جن کے باعث عید کا چاند ہر سال ایک معمہ بن کر رہ جاتا ہے؟

تین برس پہلے صوبہ سرحد کی رویتِ ہلال کمیٹی نے 38 شہادتوں کے ساتھ عید کے چاند کو اتوار کی رات دیکھا تھا، مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی کو یہ سوموار کی رات بھی نظر نہیں آیا تھا جب مولانا فضل الرحمٰن نے اسے ڈیرہ اسماعیل خان میں دیکھ کر مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین مفتی منیب الرحمٰن کی برطرفی کا مطالبہ پیش کیا تھا، مفتی صاحب نے اپنے حق میں یہ دلیل پیش کی تھی کہ علماء کرام کے فیصلے پر تنقید کرنا گناہ ہوتا ہے۔ دو برس پہلے بھی مالاکنڈ وغیرہ کے علاقوں میں بھٹکتے رہنے کے باعث عید کے چاند کو صوبہ سرحد سے وفاقی دارالحکومت تک

پہنچنے میں پورے دو دن لگ گئے تھے۔گذشتہ برس بھی مفتی منیب الرحمٰن صاحب کے پہلے اعلان سے جو اس رات کیا گیا جب باقی دنیا عید منا رہی تھی، یہی لگ رہا تھا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی لیکن پھر اچانک یہ پتہ چلا کہ وہ چاند جو رویتِ ہلال کمیٹی کے کسی ممبر کو (دور بین کے ذریعے بھی) آسمان میں دکھائی نہیں دیا تھا، بند کمرے میں ننگی آنکھ سے نظر آ گیا ہے اور موجودہ سال بھی عید کا چاند متنازعہ کا متنازعہ ہی رہا جس کے باعث اے این پی نے مفتی منیب کی رویتِ ہلال کمیٹی کی جگہ ایک نئی کمیٹی قائم کیے جانے کا مطالبہ کیا اور مفتی صاحب نے اپنی صفائی میں فرمایا کہ اسلامی معاملات میں ایک سیکیولر جماعت کو رائے زنی کا کوئی حق نہیں دیا جا سکتا؟ یہ ہے ہمارے ''ہلالِ عید'' کی گذشتہ چار سالہ تاریخ جس سے ''وحدتِ امتِ مسلمانانِ پاکستان'' کی ساری تاریخ کا اندازہ بڑی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے؟

ذرا سوچیے کہ ہم جس عید کی نماز میں ''امتِ مسلمہ کی یکجہتی'' دعائیں مانگتے ہیں اس کے چاند پر بھی متفق نہیں ہوتے اور ان کافروں کو پچھاڑنے کے خواب دیکھتے ہیں جن کی یکجہتی کا عالم یہ ہے کہ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ایک کرسمس دو الگ الگ روز منانے کا خیال بھی کبھی کسی کو نہیں آیا؟ اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ جن لوگوں کے لیے اکیسویں صدی میں بھی، چاند کا نظر آنا ایک حل نہ ہونے والا مسئلہ بن چکا ہو، وہ کوئی اور الجھن کیا سلجھائیں گے؟ ایسے لوگوں کا کیا بنے گا جو یہ تو جانتے ہیں کہ ہلالِ عید والی انکی پریس کانفرنس، سیٹلائٹ کے ذریعے ساری دنیا میں براہِ راست دیکھی جا رہی ہے لیکن یہ نہیں جانتے کہ سائنس نے اسقدر ترقی کر لی ہے کہ اجرامِ فلکی کی سینکڑوں سال بعد والی نقل و حرکت کا علم بھی شک و شبے سے بالا تر ہو چکا ہے؟ ہم بھی کیا لوگ ہیں جو سورج کے کیلنڈر کو تو مانتے ہیں لیکن چاند کے کیلنڈر کو نہیں مانتے؟ اگر اس حقیقت سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ اگلے سال یکم دسمبر کو کونسا دن ہوگا تو اس سچائی کو کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے کہ شعبان کا چاند کب طلوع ہونا ہے؟ دیگر شعبوں کی طرح ہم نے سائنس کے ساتھ بھی منافقانہ رویہ اپنایا ہوا ہے جو کسی طرح بھی سودمند نہیں ہو سکتا، کیا منافق کو

دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت میں بھی پست ترین درجے کا حقدار قرار نہیں دیا گیا؟ اگر سائنس اتنی ہی بری چیز ہے تو اسکی دیگر ایجادات کے استعمال سے بھی کیوں گریز نہیں کیا جاتا؟ اور بری چیز نہیں تو پھر جس طرح مختلف بیماریوں کی تشخیص میں سائنسی آنکھ کو ننگی آنکھ پر ترجیح دی جاتی ہے ویسے ہی چاند کے معاملے میں بھی کیوں نہیں دی جاتی؟ سیدھی سی بات ہے کہ یا ماہرینِ فلکیات کا م مفتیانِ کرام سے نہ لیا جائے یا میڈیکل لیبارٹریوں میں بھی مولانا حضرات کو تعینات کر دیا جائے تا کہ عید کے چاند کی طرح مختلف بیماریوں کا پتہ بھی اسلامی طریقے سے لگوایا جا سکے؟ لیکن اس سب سے قطعِ نظر کیا آپ نے کبھی یہ سوچا کہ ہمیں چاند ٹھیک سے دکھائی بھی نہیں دیتا لیکن ہم ان لوگوں کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہتے ہیں جنہیں اسے چھو کر آئے ہوئے بھی نصف صدی ہونے والی ہے۔

روزنامہ جناح، 29/9/2009

تمام مسائل کا حل

یہ بات کون نہیں جانتا کہ آج کا مسلمان طرح طرح کے مسائل میں الجھ کر اپنی تاریخ کے بدترین دور سے گزر رہا ہے لیکن کیا کسی کو ان مسائل کی وجہ اور حل کے بارے میں بھی کچھ معلوم ہے؟ یہ تو سبھی بتاتے ہیں کہ ہمارے زوال کی وجہ یہ ہے کہ ہم اچھے مسلمان نہیں رہے لیکن کوئی یہ بھی بتا سکتا ہے کہ اچھا مسلمان کہتے کسے ہیں؟

عام طور پر اچھا مسلمان اسے سمجھا جاتا ہے جو اللہ کا ہر حکم دیکھے سنے (یعنی سوچے سمجھے) بغیر ماننے کو تیار ہو لیکن قرآن کہتا ہے کہ ''مومنین وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے خدا کی آیات بھی پیش کی جائیں تو وہ ان پر بھی اندھے اور بہرے بن کر نہیں گرتے'' (73/الفرقان)۔

ذرا سوچیے کہ اگر ''الف'' ''ب'' کے برابر بھی ہو اور ''ت'' کے بھی، تو کیا ''ب'' اور ''ت'' بھی برابر نہیں ہوں گے؟ قرآن میں ایک مقام پر آیا ہے کہ ''خدا کے نزدیک بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے'' (22/الانفال) اور دوسرے مقام پر آیا ہے کہ ''خدا کے نزدیک بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے'' (55/الانفال)۔ کیا اس سے یہی مطلب نہیں نکلتا کہ خدا کے نزدیک ''عقل سے کام نہ لینا'' یا ''ایمان نہ لانا'' ایک ہی بات ہے؟

بات یہ ہے کہ خدا نے انسان کو صاحبِ ارادہ و اختیار بنایا اور عقل دی تاکہ وہ اپنے فیصلے سوچ سمجھ کر سکے اور ان فیصلوں کے لئے بجا طور پر ذمہ دار بھی ٹھہرایا جا سکے۔ قرآن کہتا ہے ''خدا نے انسان کو دیکھنے سننے (یعنی سوچنے سمجھنے) کی صلاحیت دی اور اسے درست راستہ دکھا دیا۔ اب انسان کا جی چاہے تو اس راستے کو اختیار کر لے اور اس کا جی چاہے تو اس راستے سے انکار کر دے'' (2،3 / الدھر)۔

حیوان کو صاحبِ ارادہ و اختیار نہیں بنایا گیا اور عقل نہیں دی گئی کہ جسے اپنے فیصلے خود

کرنے کا اختیار ہی حاصل نہیں اسے عقل کی کیا ضرورت؟ قرآن کے بقول ''یفعلون مایومرون'' انہیں جو کچھ حکم دیا جاتا ہے وہ اس کی تعمیل کرتے ہیں (50 / النحل) ''وھم لا یستکبرون'' اورانہیں اس بات کا اختیار ہی نہیں دیا گیا کہ وہ من مانی کریں اوراحکام الٰہی سے سر کشی برتیں (49 / النحل)۔

انسان اورحیوان میں بنیادی فرق ہی عقل کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو انسان عقل سے کام نہیں لیتا اسے قرآن حیوان بلکہ حیوان سے بھی بدتر قرار دیتا ہے کہ حیوان کم از کم اپنے جبلّی تقاضوں کو تو پورا کرتا ہے ۔قرآن کہتا ہے کہ ''اکثر انسان جہنمی ہیں کہ انہیں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی گئی پھر بھی یہ نہ سوچتے ہیں نہ سمجھتے ہیں ۔انہیں دیکھنے سننے کی صلاحیت دی گئی پھر بھی یہ نہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں۔ یہ (لوگ انسان نہیں) حیوان ہیں بلکہ حیوانوں سے بھی بھٹکے ہوئے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو غفلت کی زندگی گزار رہے ہیں'' (179 / الاعراف، 44 / الفرقان) ''جب ان لوگوں کو جہنم میں ڈالا جائے گا تو یہ کہیں گے کہ اگر ہم عقل سے کام لیتے تو آج جہنم میں نہیں ہوتے'' (10 / الملک)۔قرآن اسلئے نازل کیا گیا کہ لوگ عقل وفکر سے کام لے سکیں (29/ ص، 3/الزخرف وغیرہ) قرآن میں حقائق کو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے تا کہ لوگ عقل وفکر سے کام لیں اور ان حقائق کو سمجھیں (242/البقرۃ، 118/ال عمران، 151/الانعام، 2/یوسف، 67/النحل وغیرہ) قرآن میں خدا مثالوں سے بات واضح کرتا ہے اوراسے اہل عقل وفکر ہی سمجھ سکتے ہیں (43/العنکبوت، 58,59/الروم) قرآن نازل ہی اہل عقل وفکر کیلئے کیا گیا (3/ حم السجدۃ، 52/ابراھیم)

قرآن کہتا ہے کہ عقل وفکر سے کام لیا کرو (44/البقرۃ، 65/ال عمران، 32/الانعام، 169/الاعراف، 16/یونس، 51/ ھود، 109/یوسف وغیرہ) قرآن پرغور وفکر کیا کرو (82/النساء) اپنے آپ پرغور وفکر کیا کرو (8/الروم) تخلیق انسانی پرغور وفکر کیا کرو (20,21/الروم، 67/المومن وغیرہ) مظاہر فطرت پرغور وفکر کیا کرو (164/البقرۃ،

190/ال عمران، 99/الانعام، 185/الاعراف، 5,6,67/یوسف، 3,4/الرعد وغیرہ)۔

حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے جب عقل کو پیدا کیا تو اس سے فرمایا کہ میں نے کوئی مخلوق تجھ سے بہتر، افضل اور خوبصورت پیدا نہیں کی۔ میں تیرے سبب لوں گا، تیرے سبب دوں گا، تیرے سبب پہنچانا جاؤں گا، تیرے سبب ناراض ہوں گا، تیرے سبب ثواب ہوگا اور تجھ پر ہی عذاب ہوگا'' (مشکوۃ۔کتاب الاذان) ''آدمی نمازی، روزہ دار، زکوۃ دینے والا، حج اور عمرہ کرنے والا ہوتا ہے (یہاں تک کہ آپؐ نے سارے نیک کام گنائے) لیکن قیامت میں اسے اس کی عقل کے مطابق ہی جزادی جائے گی'' (مشکوۃ۔کتاب الاذان)۔

قرآن کی رو سے عقل اور ایمان ایک دوسرے کے لئے اسطرح لازم وملزوم ہیں جس طرح آنکھ اور اجالا۔ اجالا وہی دیکھ سکتا ہے جسکی آنکھ کھلی ہو اور ایمان وہی لاسکتا ہے جو عقل سے کام لیتا ہو۔ ایک آیت کا یہی ایک ٹکڑا دیکھ لیجئے کہ ''اے عقل وفکر سے کام لینے والو یعنی وہ لوگوں جو ایمان لائے ہو'' (10 / الطلاق)، کیا اس سے بھی یہ حقیقت بالکل واضع نہیں ہو جاتی کہ اہل ایمان تو عقل استعمال کرنے والے لوگ ہی ہو سکتے ہیں؟

قرآن کی رو سے ایمان ہوتا ہی وہی ہے جو سوچ سمجھ کر لایا جائے۔ اسی لیے قرآن وراثت میں ملنے والے اسلام کو تسلیم نہیں کرتا اور پیدائشی مسلمانوں سے بھی یہ کہتے ہوئے ایمان کا تقاضا کرتا ہے کہ ''اے ایمان والو! ایمان لاؤ خدا پر اور اسکے رسولؐ پر اور قرآن پر اور اس سے پہلے نازل کی گئی سب کتابوں پر'' (136/النساء)۔ اس آیت میں ظاہر ہے کہ خدا نے ''اے ایمان والو'' کہہ کر ان لوگوں کو مخاطب کیا ہے جو نام کے مسلمان تو ہیں لیکن کام کے نہیں (ورنہ جو ایمان لا چکا ہو اس سے دوبارہ ایمان کے تقاضے کا کیا مطلب؟) یعنی یہ لوگ اسلیے مسلمان ہیں کہ انکے باپ دادا مسلمان تھے۔ اسطرح کے مسلمانوں اور ان غیر مسلموں میں کیا فرق ہے جو اسلئے غیر مسلم ہیں کہ انکے باپ دادا غیر مسلم تھے؟

قرآن پیدائشی مسلمانوں اور پیدائشی غیر مسلموں کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ ''وہ لوگ جو ایمان لائے یا جو یہودی ہیں یا جو عیسائی ہیں یا جو صابی ہیں ان میں سے جو کوئی بھی خدا اور آخرت پر ایمان لائے گا اور اچھے کام کرے گا اسکا صلہ اسکے رب کے پاس ہوگا اور اسکے لیے نہ کوئی خوف ہوگا نہ کوئی حزن'' (62/البقرۃ)۔فکر و تدبّر اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ہے اسی لیے تو خدا کہتا ہے کہ اے محمدؐ انہیں کہہ دو کہ میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں اور وہ ایک بات یہ ہے کہ تم غور و فکر کیا کرو (46/سباء)۔قرآن میں صلوۃ سے بھی زیادہ غور و فکر کی تلقین کی گئی۔سات سو کے قریب آیات ایسی ہیں جن میں صلوۃ قائم کرنے کی تاکید کی گئی جبکہ ساڑھے سات سو کے لگ بھگ ایسی ہیں جن میں عقل کے استعمال پر زور دیا گیا۔''اقیم الصلوۃ'' سے صلوٰۃ فرض ہوگئی تو ''ثم تتفکرو'' سے غور و فکر کیوں فرض نہیں ہوئی؟

اس بات میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ قرآن میں سب سے زیادہ زور عقل کے استعمال پر دیا گیا،قرآن کی رو سے فکر و تدبّر مسلمان کا اولین فریضہ ہے اور یہی اسکے تمام مسائل کا حل بھی ہے۔

روزنامہ جناح،19/7/2008

لوڈشیڈنگ سے بچنے کا واحد طریقہ

لوڈ شیڈ نگ کی بات چلتی ہے تو انگریزی زبان کی ایک کہاوت یاد آجاتی ہے کہ خرگوش کو اُسی وقت مارا جاسکتا ہے جب وہ دکھائی دے۔حکومت گزشتہ دو برس سے ہماری بجلی کی ضروریات اوراسکی پیداوار میں پائے جانے والے فرق کو مٹانے کے لیے ''سرگرمِ عمل'' تو ہے لیکن کیا اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اس فرق کو مٹایا کیسے جاسکتا ہے؟ اگر معلوم ہوتا تو کیا بجلی کی کمی پہلے دو ہزار میگاواٹ سے بڑھکر تین ہزار میگاواٹ اور اب پانچ ہزار میگاواٹ تک جا پہنچتی جبکہ اس کمی پر قابو پانے کے لیے حکومت گزشتہ دو برس سے جو''ہنگامی اقدامات'' کررہی ہے ان کی بنا پر ہمارے بجلی و پانی کے وزیر نے جو''پیش گوئی'' کی تھی اس کے مطابق تو ابھی تک لوڈ شیڈ نگ کا خاتمہ ہو چکا ہونا چاہیے تھا؟ اگر ہمارے ہنگامی اقدامات درست ہوتے تو توانائی کے بحران میں تھوڑی بہت ہی سہی لیکن کچھ کمی تو ضرور آتی لیکن یہ تو سنگین تر سے سنگین ترین ہوتا چلا جارہا ہے؟

کیا آپ یقین کرسکتے ہیں کہ توانائی کے جس بحران پر قابو پانے کے لیے بے شمار دولت خرچ کر کے بھی ہاتھ کچھ نہیں آرہا اس کا ایک آسان اور آزمودہ حل ایسا بھی ہے جس پر حکومت کا ایک روپیہ بھی خرچ نہیں ہوگا اور ہم توانائی میں خودکفیل ہو جائیں گے وہ بھی کچھ اسطرح کہ بجلی نہ صرف بہت سستی ہوجائے گی بلکہ اس کے مہنگا ہونے کا امکان بھی نہ ہونے کے برابر رہ جائے گا۔ یہ میں نہیں کہتا بلکہ ''رینیوایبل انرجی سسٹم'' کے ماہر میرے عزیز دوست شفیق خان کہتے ہیں کہ توانائی کے بحران پر قابو پانے کے لیے پہیہ ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس حوالے سے یورپی ممالک میں عملی طور پر پہلے ہی بہت کام ہو چکا ہے جس سے استفادہ کرنے کے لیے بھی نیوٹن یا آئنسٹائن کے دماغ کی حاجت نہیں۔ہمیں کرنا صرف یہ ہوگا کہ رینیوایبل توانائی کے ذرائع (یعنی پانی، سورج اور ہوا) سے بجلی کی مائکرو جنریشن کرنی ہوگی (یعنی ہمیں میگاواٹز کے بجائے کلوواٹز میں بجلی پیدا کرنی ہوگی)، وہ بھی گلی گلی محلے محلے میں، جیسا کہ جرمنی اور سپین میں کیا گیا جہاں کی حکومتوں نے صرف اتنا کیا کہ لوگوں کو انفرادی سطح پر بجلی پیدا کرنے کی اجازت

دے دی اور ایک پالیسی (''فیڈ اِن ٹیرف'') بنا کر ان سے زائد از ضرورت بجلی خرید کیے جانے کے نرخ مقرر کر دیے، لوگوں نے ایسے میٹر لگوا لیے جن کے ذریعے ہر مہینے ذاتی تصرف میں آنے والی بجلی کے ساتھ ساتھ گرڈ پر منتقل ہونے والی بجلی کا حساب بھی رکھا جا سکتا ہے۔ یہ بات یوں بھی سمجھی جا سکتی ہے کہ اگر حکومتِ پاکستان توانائی کے بحران سے نمٹنے میں ''سنجیدہ'' ہو جاتی ہے اور (جرمنی اور سپین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے) ''فیڈ ان ٹیرف'' کا نفاذ عمل میں لے آتی ہے تو میں بجلی پیدا کرنے کا لائسنس حاصل کر کے تقریباً آٹھ لاکھ روپے کی مالیت سے نصب ہونے والا ایک شمسی مائکرو جنریشن پلانٹ اپنے گھر کی چھت پر لگوا لوں گا جہاں سارا دن دھوپ لگتی رہتی ہے، یہ پلانٹ ایک وقت میں تین کلو واٹ بجلی پیدا کرنے کی استطاعت رکھتا ہے اور اتنی بجلی ظاہر ہے کہ میری ضرورت سے زیادہ ہوگی، فالتو بجلی حکومت مجھ سے خرید کر آگے فروخت کر دیا کرے گی، میں نے اپنے یہاں جو میٹر لگوایا ہوگا وہ دو طرف چلنے کی صلاحیت سے آراستہ ہوگا (جب بجلی ذاتی تصرف میں آئے گی تو ایک طرف چلے گا اور جب گرڈ پر منتقل ہوگی تو دوسری طرف)، جو بجلی گرڈ پر منتقل ہوگی اس کی قیمت حکومت مجھے مقرر کردہ نرخ کے مطابق مہینے کے مہینے ادا کر دیا کرے گی۔ اسی پالیسی کے تحت پانی اور ہوا سے بھی وسیع پیمانے پر استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ پانی سے بجلی پیدا کرنے کے لیے عمومی سے بہاؤ (0.0002m/s) یا (صرف آدھا میٹر) نشیب کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ ہوا سے پیدا کرنے کے لیے 3-5m/s کی رفتار بھی کافی ہوتی ہے۔

ذرا سوچیے کہ ہم کتنے بدقسمت اور گئے گزرے لوگ ہیں کہ یورپ کے ایسے ممالک میں بھی سورج سے بجلی پیدا کی جاتی ہے جہاں دھوپ اتنی نایاب ہے کہ گورے صرف دھوپ لگانے کے لیے بھی دوسرے ممالک کا رخ کرتے ہیں لیکن ہم دھوپ کی انمول دولت سے مالا مال ہو کر بھی توانائی سے محروم ہیں، ہمارے یہاں دنیا کی دوسری بڑی چوٹی ''کے ٹو'' موجود ہے جہاں سے ندی نالوں اور دریاؤں کے خزانے وافر مقدار میں دن رات پوری شد و مد کے ساتھ

جاری وساری رہتے ہیں لیکن ہمیں ان سے توانائی حاصل کرنے کا آسان سا ہنر بھی نہ آسکا، نہ ہی ہم اپنے ''گرم پانیوں'' سے اٹھنے والی جان دار ہوا کو توانائی میں ڈھالنے کا سیدھا سا طریقہ سیکھ سکے؟

بجلی کی پیداوار کے لیے دھوپ پانی اور ہوا کو پٹرول، گیس وغیرہ پر ترجیح دینا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے ''انرجی سیکیورٹی'' متاثر نہیں ہوتی ہے بصورتِ دیگر اگر ہم مشرقِ وسطی یا وسط ایشیا یا ایران یا کسی بھی دوسرے ملک سے پٹرول یا گیس خریدیں گے تو اسکے مرعونِ منت ہوکر اپنی آزادی کھو بیٹھیں گے کیونکہ وہ کسی وقت بھی اس سپلائی کو بند کرنے کی دھمکی دے سکتا ہے بالکل ویسے ہی جیسے روس نے یورپ کی خارجہ پالیسی پر اثر انداز ہونے کے لیے ایک مرتبہ گیس سپلائی بند کرنے کی دھمکی دی تھی، نیز پٹرول گیس وغیرہ کے ذخائر کو تو ایک نہ ایک روز ختم بھی ہونا ہوتا ہے لیکن ہوا، پانی اور سورج تو ختم ہونے والے نہیں؟ توانائی کے رنیوایبل ذخائر میں ترقی یافتہ ممالک کی دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان سے ماحولیاتی آلودگی پر قابو پانے میں مدد ملتی ہے جو بڑے ہی خطرناک مسئلے کی شکل اختیار کر چکی ہے لیکن ان ذخائر سے استفادہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مائکرو جنریشن کی حوصلہ افزائی کی جائے جس کے لیے (جیسا کہ پہلے بھی بتایا) کوئی پیسہ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بس ایک پالیسی لاگو کرنے کی دیر ہے (جو کسی یورپی ملک سے درآمد بھی کی جا سکتی ہے) جو لاگو کر دی گئی تو شفیق خان کے بقول وہ دن آنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی جب ہم جرمنی اور سپین کی طرح توانائی میں اتنے خود کفیل ہو جائیں کہ کوئی نیا فرد بجلی پیدا کرنے کی اجازت مانگے تو معذرت کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔ ''سی این جی'' کی مثال ہمارے سامنے ہے جو سرکاری سیکٹر تک محدود رہی تو دس سال کے دوران چند سو گاڑیوں سے زیادہ کو اس پر منتقل نہ کیا جا سکا لیکن نجی سیکٹر کو انفرادی سطح پر گیس اسٹیشن لگانے کی اجازت دی گئی تو پاکستان سی این جی سے چلنے والی 25 لاکھ گاڑیوں کے ساتھ دنیا میں پہلے نمبر پر آ گیا۔ ایک مثال الیکٹرانک میڈیا کی بھی ہے، کسے معلوم نہیں کہ

پرائیویٹ ٹی وی چینلوں نے چند برس کے اندر ہی پاکستان میں آگہی،شعور و بیداری کا جو انقلاب برپا کر دیا ہے وہ سرکاری چینل سے ایک ہزار سال میں بھی برپا نہیں ہوسکتا تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شفیق خان کی بات جو مجھ ایسے عام سے آدمی کو بھی سمجھ آ گئی (یقیناً آپ کو بھی آ گئی ہو گی) بڑے بڑے فارن کوالیفائڈ حکمرانوں اور اعلی سرکاری افسروں کو کیوں سمجھ نہیں آتی؟ تو اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہوسکتی ہے کہ مائکرو جنریشن کی اجازت دینے کے بعد بجلی پر سے اس مافیا کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی جو منہ مانگے داموں بجلی فروخت کرتا ہے اور جس سے کمیشن کے نام پر بھاری رشوت وصول کی جاتی ہے۔

یہ بات اچھی طرح پلے باندھ لیجئے کہ بجلی کے بحران پر قابو پانے کا واحد طریقہ توانائی کے رینیوایبل وسائل سے مائکرو جنریشن ہے جس سے استفادہ نہ کیا گیا تو وہ دن دور نہیں جب زراعت کے برباد ہونے اور ایک ایک کر کے ہمارے کارخانوں کے بند ہونے سے بے روزگاری کا وہ سیلاب اُمڈ آئے گا جو ہماری رہی سہی قومی یکجہتی کو بھی بہا کر لے جائے گا اور دہشت گردی کی آگ بجھنے کے بجائے ایک ایسے الاؤ کی شکل اختیار کر لے گی جو حال کے ساتھ ساتھ ہمارے مستقبل کو بھی جلا کر راکھ کر دے گی۔

کاش ہم توانائی کے بحران پر قابو پانے کے ''ہنگامی اقدامات'' کرنے سے پہلے یہ تو جان لیں کہ اس بحران پر قابو پایا کیسے جاسکتا ہے؟ کاش ہم خرگوش پر گولیاں چلانے سے پہلے یہ تو دیکھ لیں کہ خرگوش ہے کہاں؟

روزنامہ جناح،1/4/2010

مسلمان اور سائنس

مشتاق احمد یوسفی نے کہا تھا کہ ہم نے جتنا وقت اپنے بچوں کو سائنس پر مسلمانوں کے احسانات پڑھانے میں لگا دیا اتنا سائنس پڑھانے میں لگا دیتے تو یہ مسلمانوں اور سائنس دونوں پر احسان ہوتا؟ اور میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ ہم جس طرح سائنس پر اپنے احسان یاد کرتے رہتے ہیں، کاش اسی طرح وہ احسان بھی یاد کرلیا کرتے جو سائنس نے ہم پر کیے؟

سائنس کا یہی احسان کیا کم ہے کہ اس سے ہماری زمین کی پیداوار حیرت انگیز حد تک بڑھ گئی، صنعتی انقلاب کے بعد زمین کے وسائل تو وہی رہے لیکن ان وسائل سے حاصل ہونے والی آمدن میں 8 گنا اضافہ ہوا۔ اس اضافے کی وجہ علم کی ترقی اور اس ترقی کے نتیجہ میں ہونے والی سائنسی ایجادات کے سوا کچھ نہیں۔ اگر نارمن بورلاگ کی تحقیق گندم اور مکئی کی پیداوار کو بڑھانے کا سبب نہ بنتی تو دنیا یقینی طور پر خوراک کی قلت کا شکار ہوتی اور دنیا میں تو مسلمان بھی رہتے ہیں۔ اپنے اسی کارنامے پر نارمن کو نوبل انعام سے نوازا گیا۔ نوبل انعام ان ''تر دماغ'' لوگوں کو دیا جاتا ہے جو ہر تعصب سے بالاتر ہو کر مختلف شعبہ جات میں اپنی ایجادات کے ذریعے تمام نوعِ انسانی کی بہتری کا سامان کرتے ہیں۔ الیگزنڈر فلیمنگ مسلمان نہیں تھے لیکن اپنی ایجاد کردہ پینسلین کو منظرِ عام پر لاتے ہوئے انہوں نے یہ شرط عائد نہیں کی کہ اسے مسلمان استعمال نہیں کر سکتے۔ پینسلین تو دنیا کے ہر کونے میں ہر رنگ، نسل اور مذہب کے لوگوں کے یکساں طور پر دستیاب ہے۔ اسی بیش قیمت ایجاد نے فلیمنگ کو نوبل انعام دلوایا۔

نوبل انعام کی بات چلی ہے تو یہ بھی جان لیجئے کہ اس عظیم اعزاز کی 108 سالہ تاریخ میں صرف ایک مسلم سائنسدان (احمد زیویل) کیمسٹری میں اسے حاصل کر سکے (ایک نے فزکس میں بھی حاصل کیا لیکن انہیں ہم مسلمان مانتے ہی نہیں) اس کے علاوہ کوئی مسلمان، سائنس کا کوئی نوبل انعام حاصل نہیں کر سکا جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مسلمان سائنس پر اپنے تمام تر احسانات کے باوجود کس حد تک سائنس کی خدمت کر سکے یا اس کے

ذریعے بنی نوع انسان کے لیے کہاں تک مفید ثابت ہوئے؟

مسلمانوں کی سائنس سے دوری کی بنیادی وجہ ملوکیت، سرمایہ پرستی اور مذہبی پیشوایت ہے۔ وہ اس طرح کہ ان استحصالی ٹولوں کی بقا جہالت اور قدامت میں مضمر ہوتی ہے اور جہاں سائنس آباد ہو وہاں جہالت اور قدامت کا آسیب آباد نہیں ہوسکتا۔ اسلام اور سائنس کو دو متضاد چیزیں قرار دیتے ہوئے کم از کم اتنا ضرور سوچ لینا چاہیے کہ اگر حضورؐ آج ہم میں موجود ہوتے تو کیا ہل کو ٹریکٹر یا ہاتھ کی سلائی کو سلائی مشین پر ترجیح دیتے؟ یا کیا وہ اس سائنس کو برا بھلا کہتے جس کی ایجاد کردہ ادویات وطبی آلات نوعِ انسانی کے لیے ایسی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں کہ اب ان کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی محال ہو گیا ہے؟ جو لوگ سائنس کے غلط استعمال کی وجہ سے اس کے خلاف ہیں وہ کاش اتنی سی بات سمجھ سکیں کہ کوئی چیز بھی بذاتِ خود اچھی یا بری نہیں ہوتی بلکہ اس کا استعمال اسے اچھا یا برا بنا دیتا ہے۔ انٹرنیٹ پر گندی چیزیں دیکھی جائیں تو یقیناً یہ اچھی چیز نہیں لیکن اگر اس کا استعمال اچھے مقاصد کے لیے کیا جائے تو کیا یہ ایک بہترین ایجاد نہیں؟ انٹرنیٹ نے کیا دنیا بھر کے علوم وفنون آپ کی دسترس میں نہیں کر دیے؟ آپ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے کوئی بھی تحقیق کر سکتے ہیں، دنیا بھر کی کوئی بھی کتاب چند لمحوں میں آپ کی نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے لیکن اس بات کا انحصار آپ کی مرضی پر ہے کہ آپ کونسی کتاب پڑھتے ہیں؟ انٹرنیٹ پر ایک سے ایک اچھی چیز دستیاب ہے لیکن اگر آپ کو گندی فلمیں اور بیہودہ تصاویر ہی دیکھنے کا شوق ہو تو اس میں بے چارے انٹرنیٹ کا کیا قصور؟ بالکل ویسے ہی جیسے بندوق ظلم کی حمایت میں اٹھائی جائے تو شر اور ظلم کے خلاف اٹھائی جائے تو خیر ہوتی ہے، مارفین کا ٹیکہ شدید درد میں مبتلا مریض کو لگایا جائے تو یہ ایک اچھا کام ہے لیکن نشہ کرنے کے لیے لگایا جائے تو برا کام ہے؟

سائنس سے ہماری دشمنی اتنی بڑھ چکی ہے کہ دشمنی کی وجہ کہیں پیچھے ہی رہ گئی ہے، مجھے تو پورا یقین ہے کہ اگر سائنس کا کوئی ایک غلط استعمال بھی باقی نہ رہے تو بھی ہم ناچ نہ جانے

آنگن ٹیڑھا کے مصداق اسے برا بھلا ہی کہتے رہیں؟ ایک ''عالم'' صاحب سے سوال کیا کہ سائنس اتنی ہی بری ہے تو ''مجاہدین'' جدید سے جدید سائنسی اسلحہ کیوں استعمال کرتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ کفار کے مقابلے میں اس کا استعمال جائز ہوتا ہے۔ پوچھا کہ کفار کے مقابلے میں سائنسی ہتھیار جائز ہوتے ہیں تو سائنس کیوں جائز نہیں ہوتی؟ تو کوئی جواب نہ بن پڑا، اسی دوران ان کے موبائل کی گھنٹی بجی اور انہوں نے کفار کے خلاف بات کرنے کے بجائے کسی سے اپنے عزیز کی ملازمت کی سفارش شروع کر دی، میں بے اختیار مسکرانے لگا اور انہوں نے ناراض ہو کر محفل برخاست کر دی۔ یہ واقعہ ایک دوست کو سنایا تو وہ بولے کہ شکر کرو حضرت صاحب نے تمھارے خلاف فتوی صادر نہیں کیا ورنہ ہماری تاریخ یہی ہے کہ جب کسی کے سوال کا جواب ہمارے پاس نہ ہو تو اسے کافر قرار دے دیتے ہیں؟ اور میں نے کہا کہ کافر تو خیر ہم نے ان لوگوں کو بھی قرار دیا جن کی مثالیں سائنس پر مسلمانوں کے احسانات گنواتے ہوئے بڑے فخر سے پیش کرتے ہیں۔ راضی، ابنِ سینا، ابنِ رشد، خوارزمی وغیرہ وغیرہ ان سب کے سب پر کیا اپنے اپنے وقت میں بلا تامل کفر کے فتوے نہیں داغے گئے؟ سر سید نے سائنس کی تعلیم پر زور دیا اور اس کی تائید میں قرآن کریم سے مثالیں پیش کیں تو ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا؟ کوئی ان کا قصور پوچھتا تو جواب ملتا کہ یہ ''نیچری'' ہے (یعنی Nature کے مطالعہ کی تلقین و تاکید کرتا ہے)۔ بھیڑ چال کے عادی عام لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ''نیچری'' کہتے کسے ہیں، پھر بھی اس لفظ نے کیا ہمارے معاشرے میں ایک گناہِ عظیم کی حیثیت اختیار نہیں کر لی؟ تاریخِ اسلام میں شاید ہی کوئی سوچنے سمجھنے والا انسان ایسا ہو جس کے خلاف کفر کے فتوے نہ لگائے گئے ہوں؟

سائنس سے دوری کے باعث مسلمانوں کی پیداواری صلاحیت پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں، ان کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی آبادی دنیا کی کُل آبادی کا 25 فیصد ہے لیکن دنیا کی کُل پیداوار کا صرف 5 فیصد مسلمان ممالک سے پیدا ہو رہا

ہے۔سائنس پیداوار میں کس طرح اضافہ کرتی ہے اسے بڑی ہی غیر مبہم اور سیدھی قسم کی بے شمار مثالوں سے باآسانی سمجھا جا سکتا ہے مثلاً یہ کہ اگر دو کسانوں کے پاس ایک ہی جتنی زمین ہو جو زرخیز بھی ایک ہی جیسی ہو لیکن ایک کسان زمین کی منصوبہ بندی سے تیاری تک سائنسی ایجادات سے استفادہ کرے جبکہ دوسرے کا انحصار قدیم طریقوں پر ہو تو کس کی فصل بہتر ہو گی؟ کیا ایک ہل میں جُتے دو بیل اتنی صفائی ستھرائی کے ساتھ زمین کو بیجائی کے لیے تیار کر سکتے ہیں جسطرح ایک ٹریکٹر کر سکتا ہے؟ یہ بات یوں بھی پوچھی جا سکتی ہے کہ کیا ہاتھ سے کپڑے سینے والا درزی سلائی مشین استعمال کرنے والے حریف کا مقابلہ کر سکتا ہے؟

سائنس سے مسلمانوں کی دوری اس مثال سے بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ''یو این ڈی پی'' کی رپورٹ کے مطابق مشرقِ وسطی میں ساڑھے تین ہزار کے لگ بھگ ہمہ وقتی ریسرچ سکالر ہیں جبکہ مشرقِ وسطی جتنی آبادی کے حامل امریکہ میں ان سکالروں کی تعداد 12 لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔یہ ہے ہمارا حال جسے ہم بدلنا بھی نہیں چاہتے اور امریکہ کے ساتھ برسرِ پیکار بھی رہنا چاہتے ہیں۔

ہمارا المیہ یہ نہیں کہ ہم گدھے پر سوار ہیں اور ہمارا مقابلہ جن لوگوں کے ساتھ ہے وہ بہترین قسم کی گاڑیوں اور جہازوں پر بیٹھے ہوئے ہیں، ہمارا المیہ تو یہ ہے کہ ہم گدھے کی سواری پر بھی مصر ہیں اور گاڑیوں اور جہازوں پر سفر کرنے والوں کے ساتھ مقابلے پر بھی بضد ہیں۔

روزنامہ جناح،20/8/2009

ہمیں زیرو اِنگ کی ضرورت ہے

میرے چاروں نشانے خطا ہو گئے تو نشانہ بازی سکھانے پر مامور حوالدار حمید نے بندوق میرے ہاتھ سے لے کر خود فائرنگ شروع کر دی لیکن ان کی کوئی گولی بھی ٹارگٹ کو نہ چھو سکی جبکہ وہ بڑے ہی اچھے نشانہ باز تھے (میرا نشانہ بھی کچھ برا نہیں تھا)۔ وہ بولے کہ صاحب مجھے لگتا ہے کہ ہماری بندوق ٹھیک نہیں ورنہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کا کوئی نشانہ تو ٹھیک لگتا؟ اسے ''زیرو اِنگ'' کی ضرورت ہے (زیرو اِنگ اس عمل کو کہتے ہیں جس میں بندوق کا نشانہ درست کیا جاتا ہے) اور پھر وہ بندوق زیرو اِنگ کے لیے بھیج دی گئی، زیرو اِنگ کے بعد میرا نشانہ بھی ٹھیک ٹھیک لگنے لگا اور حوالدار حمید کا بھی۔

یہ واقعہ ہماری فوجی ٹریننگ کے دنوں کا ہے جس کی یاد عین اس وقت آئی جب میں عید کی نماز کے بعد مولوی صاحب کی دعائیں سن رہا تھا، ''اے خدا کفار کو نیست و نابود کر دے، اے خدا عالمِ اسلام کو متحد کر دے، اے خدا ہماری ساری بلائیں دور کر دے وغیرہ وغیرہ''۔ کیا یہ دعائیں کم و بیش ایک ہزار سال سے نہیں مانگی جا رہیں اور مانگنے والوں میں کیا ایک سے ایک ''پرہیز گار'' بندہ شامل نہیں؟ لیکن کفار نیست و نابود ہوئے نہ عالمِ اسلام متحد ہوا، نہ ہی ہماری ساری بلائیں دور ہوئیں؟ ہمارا ہر نشانہ غلط لگ رہا ہے لیکن پھر بھی ہم یہ جاننے اور ماننے کو تیار نہیں کہ ہمیں زیرو اِنگ کی ضرورت ہے۔

ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ آج کے مخصوص حالات کو ذہن میں رکھو (جبکہ غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر لوگ کبھی اپنے بچوں کو فروخت کر دیتے ہیں کبھی انہیں مار کر خودکشی کر لیتے ہیں اور کبھی یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو محض روٹی کے چند ٹکڑوں کی خاطر دہشت گردی کی آگ کا ایندھن بننے کے لیے کسی مدرسے میں داخل کروا دیا) اور بتاؤ کہ اگر آج حضور اکرمؐ ہم میں بنفسِ نفیس موجود ہوتے اور ان سے رہنمائی لی جاتی کہ ہم بکرا خریدیں یا ان پیسوں سے کسی غریب بچے کی تعلیم کا اہتمام کر دیا کریں کہ آج ایک درمیانے درجے کے

بکرے کی جتنی قیمت ہے اتنی ہی ایک درمیانے درجے کے سکول کی سال بھر کی فیس بھی ہے؟ تو کیا وہ بکرا خریدنے کی ہدایت کرتے جس کا گوشت کسی غریب کو اس سے زیادہ کیا دے سکتا ہے کہ وہ ایک دو مرتبہ پیٹ بھر کر کھانا کھا لے؟ یا ہر سال کسی غریب بچے کی فیس جمع کروانے کا حکم دیتے جس سے پڑھ لکھ کر وہ اپنے پورے کنبے کو غربت کے بے رحم چنگل سے آزاد کرا سکے اور ہمیشہ پیٹ بھر کر کھانا کھلائے؟ میں تو اس کے سوا کوئی جواب نہ دے سکا کہ حضورؐ بچے کی فیس جمع کروانے کا حکم دیتے۔ وہ بولا کہ میرے خیال میں تو آجکل کسی غریب بچے کو تعلیم دلوانا بکرا ذبح کروانے سے بڑی قربانی ہے۔ اُس نے ایک مفلس مگر ذہین بچے کو ایک نجی سکول میں داخل کروا رکھا ہے جس کی تعلیم پر ہر سال تقریباً بارہ سے پندرہ ہزار روپے کے اخراجات اٹھتے ہیں اور اتنے میں ہی ایک بکرا بھی آتا ہے۔ کہتا ہے کہ اگر توفیق ہوئی تو اس بچے کی کفالت اس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک اس کی تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی اور وہ برسرِ روزگار نہیں ہو جاتا، اس کے بعد کسی دوسرے مستحق بچے کو سکول میں داخل کروا دوں گا۔

میرے دوست کے سوال اور اس کی قربانی سے کیا معلوم آپ پر کیا اثر ہوا لیکن مجھے تو یوں لگا جیسے میں ایک دم بیدار ہو گیا ہوں، میرے ذہن میں ہجیرہ، آزاد کشمیر کا وہ غار گھومنے لگا جو ایک طرف سے بالکل بند تھا اور دوسری طرف سے بالکل کھُلا۔ اس غار میں ایک شخص اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہی غار اس کا بیڈ روم بھی تھا، ڈرائنگ روم بھی اور کچن بھی۔ جب میں وہاں گیا، پتھروں کے بنائے ہوئے چولہے پر ایک ہانڈی میں کچھ پک رہا تھا، آگ لکڑیوں سے جلائی گئی تھی، دھوئیں کے اخراج کا مناسب بندوبست نہ ہونے کے باعث پورا غار دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ میں وہاں چند منٹ ہی گزار پایا تھا کہ یوں لگا جیسے دم گھٹنے گھٹ جائے گا اور میں باہر نکل آیا۔ غار جہاں واقع ہے اسی پہاڑ کے اوپر سے گزرنے والی سڑک کے پار ایک مسجد بھی واقع ہے، اتفاق سے اس روز جمعہ تھا اور مولوی صاحب اپنے خطبے میں فرما رہے تھے کہ اہلِ ثروت نمازیوں کے تعاون سے مسجد کے ہال میں تو کارپٹ ڈال دیا

گیا ہے اب برامدے میں ڈالنا ہے جس کے لیے مذید چندے کی ضرورت ہے، اور مجھے علامہ اقبال کا یہ عظیم شعر یاد آیا جس میں خدائے بزرگ و برتر نے کہا کہ

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سِلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

مجھے ساری دنیا کے مسلمانوں سے یہ پوچھنا ہے کہ جس مسجد کے پڑوس میں دو بھوکے ننگے بچے اپنے والدین سمیت آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی ایک غار میں رہنے پر مجبور ہوں، اس میں بیش قیمت قالین بچھانے سے کیا خدا خوش ہوسکتا ہے۔ کاش ہم یہ جان سکیں کہ ہماری عبادت بے نتیجہ اور دعا کھوکھلی ہو چکی ہے، ہر دو میں اثر پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم نام کے نہیں بلکہ کام کے مسلمان بنیں، قرآنِ کریم کو چلوں اور وظیفوں میں استعمال کرنے کے بجائے اس کی روح کو سمجھ کر اس کے پیغام پر عمل پیرا ہو جائیں، کاش ہم یہ مان سکیں کہ ہماری بندوق کا نشانہ ہی خراب ہو چکا ہے جسے ٹھیک کیے بغیر اچھے سے اچھا نشانہ باز بھی ٹارگٹ کو ہِٹ نہیں کرسکتا اور ہمارے پاس کوئی حوالدار حمید بھی نہیں جو ہمیں بتا سکے کہ ہمیں زیرو اِنگ کی ضرورت ہے۔

روزنامہ جناح، 2/12/2009

دو مرتبہ تشریف رکھیں

پطرس بخاری ایک فائل میں کھوئے ہوئے تھے۔ ایک صاحب بِلا اجازت ان کے دفتر میں داخل ہوئے اور بلند آواز میں ''اسلام علیکم'' کہہ کر انہیں اپنی جانب متوجہ کیا۔ پطرس نے سر اُٹھا کر پہلے ''واعلیکم السلام'' کہا اور پھر یہ کہہ کر کہ ''تشریف رکھیے'' دوبارہ اپنے کام میں منہمک ہو گئے۔ لیکن وہ صاحب ''تشریف رکھ کر'' انکے فارغ ہونے کا انتظار کرنے کے بجائے رعب دار آواز میں بولے کہ شاہ صاحب! آپ نے غالبًا مجھے پہچانا نہیں، میں اس علاقے کا کمشنر ہوں؟ پطرس نے دوبارہ سر اُٹھا کر مسکراتے ہوئے انہیں دیکھا اور کہا۔ اچھا! آپ کمشنر ہیں، تو پھر دو مرتبہ تشریف رکھیں۔

یہ واقعہ کم وبیش پچاس برس پرانا ہے اور اس نصف صدی میں انسان نے چاند کو چھولیا، مریخ تک رسائی حاصل کر لی، پلوٹو کو رخصت کر کے نظامِ شمسی تک کو تبدیل کر دیا، صدیوں کی مسافت دنوں میں طے کرنے کے نت نئے طریقے سیکھ لیے، انٹرنیٹ اور موبائل کے ذریعے دنیا کو مٹھی میں سمیٹ لیا اور نجانے کیا کیا ایجاد کر کے کہاں سے کہاں آ گیا لیکن ہمارے سرکاری افسروں کی دو مرتبہ تشریف رکھنے کی عادت اب بھی وہیں کی وہیں ہے۔

ایک سرکاری افسر جمعے کی نماز کے لئے سرکاری گاڑی میں تشریف لائے۔ گاڑی کی لمبائی چوڑائی سے معلوم ہو رہا تھا کہ موصوف کسی بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ گاڑی مسجد کے قریب سڑک کے کنارے روک دی گئی تا کہ صاحب کو اتار کر پارکنگ کے لئے لے جائی جا سکے۔ گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے ڈرائیور نے انجن اس لئے بند نہیں کیا کہ جب تک صاحب گاڑی میں ہیں 'اے سی' چلتا رہے۔ صاحب کا دروازہ کھولنے سے پہلے ڈرائیور نے ہاتھ میں اٹھائی ہوئی چھتری کھول لی کہ کہیں صاحب کو دھوپ نہ لگ جائے۔ گاڑی کے دروازے سے مسجد کے دروازے تک ڈرائیور اپنے صاحب پر چھتری کی چھاؤں کیے خود دھوپ میں چلتا اور جلتا رہا۔ صاحب جوتے اتار کر مسجد میں داخل ہوئے تو ڈرائیور انکے جوتے اُٹھا کر واپس گاڑی

کی طرف روانہ ہو گیا اور صاحب مسجد سے باہر نکلے تو ڈرائیور ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے میں انکے جوتے اُٹھائے انکے انتظار میں کھڑا تھا تا کہ وہ جس شان سے نماز پڑھنے گئے اسی سے واپس بھی آ سکیں۔

اس مسجد میں میرے ساتھ برطانیہ کا میرا ایک دوست بھی نماز پڑھنے گیا ہوا تھا (جو ہماری تاریخ پر گہری نظر رکھتا ہے)، واپسی پر میں نے اُس سے پوچھا کہ کیا ایسے لوگوں سے 'کام' کی توقع کی جا سکتی ہے جو اپنی گاڑی کا دروازہ بھی خود نہیں کھولتے ؟ اور کیا ایسے لوگ وطنِ عزیز کو پسماندگی کی دھوپ سے بچا سکتے ہیں جو خود اتنے پسماندہ ہیں کہ اپنے سر پر چھاؤں کرنے والی چھتری بھی دوسروں سے اُٹھواتے ہیں؟ وہ مسکراتے ہوئے بولا کہ ''ان لوگوں کا 'کام' ہی 'کام نہ کرنا' ہے۔ انہیں ایجاد کرتے وقت انگریزوں نے اس بات کا خصوصی خیال رکھا کہ انہیں ایسی روایات کا اسیر بنا دیا جائے جو برصغیر کو غیر ترقی یافتہ رکھ کر یہاں کے کئی کروڑ لوگوں پر چند ہزار انگریزوں کا تسلط قائم رکھ سکیں۔ انگریز چلے گئے تو ان کی جگہ ہمیں محکوم رکھنے کا فریضہ افسر شاہی نے انجام دینا شروع کر دیا، سو انگریزوں کی باقیات اور ہماری پسماندگی اب بھی قائم دائم ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا برطانیہ میں بھی ایسا ہوتا ہے؟ وہ بولا کہ برطانیہ ایک ترقی یافتہ ملک ہے جہاں 'کام کرنے والوں' کی عزت ہوتی ہے۔ 'کام نہ کروانے والوں' کی عزت تو پسماندہ ممالک میں ہوا کرتی ہے۔ انگریز برصغیر میں تو دو مرتبہ تشریف رکھنے والے افسرانِ کرام چھوڑ گئے لیکن انکے اپنے ملک میں افسری کا حق صرف ایک مرتبہ تشریف رکھنے والوں کو حاصل ہے۔ میرا دوست کہتا ہے کہ دو مرتبہ تشریف رکھنے والے افسر ہمارے ملک کو کبھی آگے نہیں بڑھنے دیں گے کیونکہ ترقی یافتہ پاکستان میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہو گی۔

میرے دوست نے تو خیر گہری بات کہہ دی لیکن اگر گہری بات نہ بھی کہی جائے تو بھی سرکاری افسروں کو کام کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے جبکہ انہیں کام کرنے کی بھی اتنی ہی تنخواہ ملتی ہے جتنی کام نہ کرنے کی ملتی ہے۔ سرکاری افسروں کا کام نہ کرنا ہمارے معاشرے میں ایک

ضرب المثل کی صورت زبان زدِعام ہو چکا ہے۔مثلاً ایک ورکشاپ میں استاد مکینک اپنے شاگردوں پران الفاظ میں برس رہا تھا کہ" کام نہیں کرو گے تو اس ورکشاپ میں بھی نہیں رہو گے، میں نے تمھیں کام کرنے کے لئے رکھا ہے، افسری کرنے کے لئے نہیں رکھا"۔

میرے ایک دوست کی اس بات پر ہوسکتا ہے آپ یقین نہ کریں کہ ایک افسر صاحب تو اپنے پیچھے والی دیوار پر لگی گھڑی پہ وقت دیکھنے کے لیے بھی چپڑاسی کو بلاتے ہیں، لیکن میں ضرور یقین کرتا ہوں کیونکہ 15 برس سے زیادہ عرصہ سرکاری ملازمت کر چکا ہوں اور ایسے کئی واقعات کا چشم دید گواہ ہوں۔مثلاً مستعفی ہونے سے پہلے میں جس محکمے میں ڈائریکٹر کے فرائض انجام دے رہا تھا وہاں پولیس اور آرمی کے افسران بھی ہوا کرتے تھے، میرے ایک باوردی ساتھی ڈائریکٹر جب گھر سے چلتے تو ان کا گھریلو ملازم فون کر کے دفتری ملازم سے کہتا کہ" صاحب نکل گئے ہیں" جس کا مطلب یہ ہوتا کہ اب تم دفتر کے دروازے پر انکے استقبال کے لیے کھڑے ہو جاؤ اور وہ ایسا ہی کرتا، پھر جب صاحب کی گاڑی آ کر رکتی تو وہ فوراً آگے بڑھکر دروازہ کھولتا، صاحب باہر نکلتے اور وہ انکی ٹوپی اور بلٹ اٹھا کر ان کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا اس جگہ تک آتا جہاں صبح کا درس ہوا کرتا تھا اور پھر جب چیئرمین کے آنے کا وقت ہوتا تو چپڑاسی بڑے ادب کے ساتھ ٹوپی اور بیلٹ ان کے آگے کر دیتا اور وہ دونوں چیزیں پہن لیا کرتے، اس پر اکثر یہ خیال دامن گیر ہوتا کہ خدا جانے وہ اپنے سر پر ٹوپی بھی خود کیوں رکھتے ہیں، چپڑاسی سے کیوں نہیں رکھواتے؟

دو مرتبہ تشریف رکھنے والے افسروں نے افسری اور کام کو دو متضاد چیزیں بنا کر رکھ دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ خسارے میں چلنے والے سرکاری محکمے پرائیویٹ سیکٹر میں منتقلی کے بعد فائدے میں چلنے لگتے ہیں اور اسی لئے میرے پیارے دوست بلال اکبر قریشی نے یہ خوبصورت بات کہی تھی (جو پہلے بھی لکھ چکا ہوں) کہ کسی چیز کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس چیز کا ایک سرکاری محکمہ قائم کر دیا جائے اور اسکی تائید میں یہ دلیل پیش کی کہ

ایک زمانہ وہ تھا کہ ان کے گاؤں میں آلو گھر گھر کی فصل تھا اور ایک زمانہ یہ ہے کہ وہاں آلو کا ڈائریکٹر تو ہے لیکن آلو کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملتا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ افسر شاہی میں رائج ان روایات کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیا جائے جو انگریزوں نے ہمیں پسماندہ رکھنے اور ہم پر اپنا تسلط جمانے کے لئے بنائی تھیں بصورت دیگر وہ دن دور نہیں کہ جب ہمارے ملک میں دو مرتبہ تشریف رکھنے والے افسر تو ملیں گے لیکن جس چیز کے وہ افسر ہونگے اسکا دور دور تک کہیں کوئی نشان نہیں ملے گا۔

روزنامہ خبریں، 4/9/2006

ہر فتنے کی جڑ

صنعتی انقلاب سب سے پہلے برطانیہ میں آیا اور اس سے کس حد تک استفادہ کیا گیا اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ 1775 میں دنیا کا آدھا لوہا اور سوتی سامان برطانیہ میں تیار کیا جاتا تھا۔ برطانیہ کی تجارت دیگر یورپی ممالک کے مقابلے میں دگنی ہوا کرتی تھی جس کے طفیل جلد ہی یہاں خام مال کی ضرورت اس قدر بڑھ گئی کہ کئی ''انگریز'' مفکرین اور ادیبوں نے برطانوی حکمرانوں کو (خام مال کی دولت سے مالا مال) ان پسماندہ ممالک پر اپنا تسلط جمانے کا باقاعدہ مشورہ دینا شروع کر دیا جو (اپنی لاعلمی کے طفیل) قدرتی وسائل کی اہمیت سے آگاہ نہیں تھے یا ان سے استفادہ نہیں کر رہے تھے۔ اس مشورے کی دو وجوہات اور بھی تھیں، ایک یہ کہ برطانیہ کے کارخانے اپنی ملکی ضروریات سے زیادہ سامان تیار کرنے لگے تھے جس کی کھپت کے لیے ''مارکیٹ'' کو وسعت دیے جانے کی ضرورت تھی اور دوسری یہ کہ مشینوں کی فراوانی اور آبادی میں اضافے نے بے روزگاری میں اضافہ کر دیا تھا اور (مناسب قسم کے) دوسرے علاقوں میں برطانوی لوگوں کی آبادکاری سے اس مسئلے کو بھی حل کیا جا سکتا تھا۔

چنانچہ برطانیہ نے فوجی طاقت کے بل بوتے پر مالٹا، سنگاپور، جبرالٹر، برِصغیر، جنوبی افریقہ، ہوڈیشیا وغیرہ جیسے ممالک پر قبضہ کرنا شروع کر دیا (جنوبی افریقہ اور ہوڈیشیا میں ہیرے اور سونے کی کانوں کے علاوہ وہ زرخیز زمین بھی ہتھیا لی گئی جہاں گوروں کو بڑے اچھے طریقے سے آباد کیا جا سکتا تھا)۔ اسی کو ''سامراجیت'' کہتے ہیں جس سے مراد کسی ملک وقوم کا دوسرے ممالک واقوام پر غاصبانہ قبضہ ہے تاکہ ان کے وسائل کو زبردستی ہڑپ کر کے وہاں کے لوگوں کی زندگی کو بدتر اور اپنے باشندوں کی زندگی کو بہتر بنایا جا سکے۔

برطانیہ کے بعد دیگر بڑے بڑے یورپی صنعتی ممالک (فرانس، جرمنی اور اٹلی) نے بھی سامراجیت کو اپنا لیا اور ایک وقت ایسا آیا کہ یورپی ممالک اپنی آبادی سے دگنی آبادی اور اپنے

رقبے سے 20 گنا زیادہ رقبے پر قابض ہو گئے، غیر یورپی لوگوں کو غلام بنا دیا گیا اور ان کے قدرتی وسائل کو اس بے دردی سے لوٹا گیا کہ ایتھوپیا جیسے علاقے تو تا حال روٹی کے ایک ایک نوالے کو ترس رہے ہیں۔ یورپی ممالک کے بعد جاپان، روس اور امریکہ میں بھی صنعتی انقلاب نے کروٹ لی، ان ممالک نے بھی سامراج کی شکل اختیار کر لی جس سے چین اور وسط ایشیا جیسے علاقوں میں بھی لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔

سامراجیت کی دوڑ میں سامراج ممالک کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے تو ان میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ مثال کے طور پر جرمنی نے افریقہ اور ایشیا کی ان ''مارکیٹوں'' پر قبضہ کر لیا جو پہلے فرانس اور برطانیہ کے زیرِ تسلط تھیں، چین کے علاقے منچوریا پر روس کی نگاہیں جمی ہوئی تھیں لیکن اس پر جاپان قابض ہو گیا، چین پر تو ایک وقت ایسا بھی آیا جب برطانیہ فرانس اور امریکہ اسے آپس میں تقسیم کرنے والے تھے لیکن قوم پرست چینیوں نے بادشاہت کا خاتمہ کر دیا جو سامراج کے ہاتھوں میں کھیل رہی تھی، ترکی کو بھی مل بانٹ کر کھانے کی سکیم بنائی گئی جو اس لیے ناکام ہوئی کہ روسی سامراج یورپی سامراج کی مخالفت پر اتر آیا اور اس کی امداد سے ترکی نے (مصطفیٰ کمال اتاترک کی قیادت میں) اٹلی کو میدانِ جنگ سے مار بھگایا، وغیرہ وغیرہ۔ سامراجیت ہی کی بدولت دنیا دو عالمگیر جنگوں کا پیش خیمہ بنی اور نوعِ انسانی کی تقدیر پر وہ شرمناک دھبے لگے جو قیامت تک نہیں مٹ سکتے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد بین الاقوامی تعلقاتِ عامہ یکسر تبدیل ہو گئے، دنیا طاقت کے دو ستونوں کے گرد گھومنے لگی ایک امریکہ اور دوسرا روس، تمام ممالک بالواسطہ یا بلاواسطہ امریکی سامراج یا روسی سامراج کے نرغے میں آ گئے اور دنیا کے وسائل پر قبضے کی ایک ایسی کشمکش کا آغاز ہو گیا جسے ''سرد جنگ'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس جنگ کو دو معاشی نظاموں کی جنگ بھی قرار دیا جاتا ہے، سرمایہ دارانہ نظام جس کے تحت دولت چند ہاتھوں میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور کمیونزم جس کی رو سے دولت کو تمام طبقوں میں مساوی طور پر گردش کرتے رہنا

چاہیے (اول الزکر ذرائعِ پیداوار کو ذاتی ملکیت میں رکھنے کی اجازت دیتا ہے لیکن ثانی الذکر قومی تحویل کا قائل ہے)۔سرد جنگ سوویت یونین کے ٹوٹنے تک جاری وساری رہی اور اس دوران ہر دو سامراجی قوتوں نے دیگر ممالک پر اپنا اثر رسوخ جما کران کی قومی و بین الاقوامی پالیسی کو اپنی گرفت میں لیے رکھا جس سے سامراجیت کو ایک نئ جہت ملی لیکن سرد جنگ کے خاتمے پر امریکہ بین الاقوامی منظر نامے پر واحد بڑی طاقت کی حیثیت سے ابھرا، اس کی ترجیحات تبدیل ہوگئیں اور سامراجیت نے ایک اور روپ دھارلیا۔اس کے بعد جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے ساری دنیا کے سامنے ہے،کون نہیں جانتا کہ امریکہ تمام دنیا کو اپنے ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کر رہا ہے؟ کتنے ممالک ایسے ہونگے جن کے وسائل امریکہ کی گرفت میں نہیں؟''دہشت گردی کی عالمی جنگ'' کے نام پر کسے معلوم نہیں کہ امریکہ تمام یورپ کی معیشت کو کنٹرول کر رہا ہے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ امریکہ نے کس طرح پہلے عراق کے قدرتی وسائل ہتھیائے اور اب وسط ایشیا، پاکستان اور افغانستان پر نگاہیں جمائے ہوئے ہے جہاں قدرتی وسائل کے نئے اور وسیع ترین ذخائر دریافت کیے جا چکے ہیں؟ سرد جنگ سے پہلے دنیا دو سامراجی قوتوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنی ہوئی تھی لیکن سرد جنگ کے بعد کم وبیش ساری دنیا پر امریکہ کی سامراجیت قائم ہو چکی ہے۔

سامراجیت کا اولین شکار وہ ممالک ہوا کرتے ہیں جہاں جہالت اور قدامت کا راج ہوتا ہے،اسلاف پرستی اور مذہبی انتہا پسندی عروج پر ہوتی ہے،لوگ بین الاقوامی حالاتِ حاضرہ سے لاتعلق ہو کر معمولی اور گھٹیا نوعیت کی گتھیاں سلجھانے میں الجھ جاتے ہیں، اجتماعیت کے بجائے انفرادیت کا راج چلتا ہے،قومی زندگی کے رگ وریشے میں کرپشن کا زہر لہو کی طرح گردش کرتا ہے،حکمران اپنے قومی اختیارات کا استعمال ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے کرتے ہیں (کوئی کسی کا کام کرتے ہوئے یہ نہیں سوچتا کہ اس سے ملک وقوم کو کیا فائدہ ہوگا بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کام کے کرنے میں اسے کیا مفاد حاصل ہوسکتا ہے)، میرٹ نام کی کوئی شے کہیں

دکھائی نہیں دیتی، تجدید اور ایجاد کی راہیں مسدود کر دی جاتی ہیں، سائنس وٹیکنالوجی کا پیڑ اپنی جڑوں تک سوکھ جاتا ہے، عوام کو بالعموم اور اشرافیہ کو بالخصوص وہ کھانے اور پہننے کی عادت پڑ جاتی ہے جو اپنے کھیتوں میں نہیں اُگتا اور اپنے کارخانوں میں نہیں بنتا۔ مثال کے طور پر سامراجیت کو سب سے زیادہ استحکام افریقہ اور ایشیا میں نصیب ہوا اور اس بلا نے اپنے پنجے انہی ممالک کی گردن پر گاڑے جو جہالت وقدامت سے اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اسی بلا نے ہمیں بھی دبوچ رکھا ہے لیکن اس سے رہائی کی جدوجہد تو دور کنار ہماری اکثریت کو تو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ اس نے ہمیں دبوچ کیوں رکھا ہے اور اس سے رہائی حاصل کیسے کی جا سکتی ہے؟

کیا ہمارا خیال یہ ہے کہ کترینہ جیسی قیامت خیز قدرتی آفت کے دوران بھی نظم وضبط کا حیرت انگیز مظاہرہ کرنے والی قوم اچانک لوگوں کی ایک ایسی بھیڑ سے ڈرنے لگی ہے جو حالتِ امن میں بھی قطار تک بنانا نہیں جانتی؟ کیا ہم سمجھتے ہیں کہ امریکہ جیسی ایٹمی وسائنسی طاقت کو اس ''مومنِ بے تیغ'' سے خطرہ لاحق ہو گیا ہے جسے اس نے خود پیدا کیا تھا تا کہ اس کے ہاتھ میں ''تیغ'' دے کر اسے اسلام کے نام پر روس کے خلاف استعمال کر سکے؟ یا ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ سوویت یونین کی شکست کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کا سرخیل (جس کا مذہب ہی روپئے پیسے کا حساب کتاب ہے) ''جہادیوں'' کی تیاری پر کی جانے والی اپنی اربوں کھربوں ڈالر کی ''انوسٹمنٹ'' سے غافل ہو گیا؟ یا ہمیں اس خوش فہمی نے گھیر رکھا ہے کہ امریکہ نے اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے اصنام کو بھگوان بننے کی اجازت دے دی ہے؟

خدا جانے ہمیں اس آسان سی حقیقت کا ادراک کب ہو گا کہ امریکی سامراجیت کا مقابلہ کرنے سے پہلے ہمیں اپنا مقابلہ کرنا ہو گا جس کی پہلی منزل اپنی غلطی تسلیم کرنا ہے جو ہم جیسے ''عقلِ کل'' قسم کے لوگوں کے لیے یقیناً ایک بڑا ہی مشکل کام ہے لیکن کیا کیا جائے کہ اس مرحلے سے گزرنا ضروری ہے؟ کاش ہم یہ جان سکیں کہ ہم نے روس کے ساتھ لڑ کر اسلام کی کوئی خدمت نہیں کی نہ ہی امریکہ عیسائیت کی ترویج کے لیے ہمارے یہاں آیا ہوا ہے، معاملہ

پہلے بھی معاشی ترجیحات ہی کا تھا اور اب بھی معاشی ترجیحات ہی کا ہے، آلہ ءکار پہلے بھی مذہب ہی کو بنایا گیا اور اب بھی مذہب ہی کو بنایا جا رہا ہے؟ کاش ہم یہ مان سکیں کہ ہم ہمیشہ وہی کچھ بن جاتے ہیں جو امریکی سامراج ہمیں بنانا چاہتا ہے اور اس کی وجہ صرف اور صرف ہماری اپنی جہالت اور قدامت ہے، جی ہاں وہی جہالت اور قدامت جس پر (اور تو اور) ہمارے کئی ''مفکرین'' بھی، فخر تک کرنے سے گریز نہیں کرتے؟ ہمیں اپنے موجودہ رویے پر فوراً نظرثانی کر لینی چاہیے بصورتِ دیگر کچھ عجب نہیں کہ ایک روز ہمارا حال بھی افریقہ کے کسی اجڑے پجڑے سامراجیت زدہ ملک جیسا ہو اور ہم بھی روکھی سوکھی روٹی کے ایک ایک لقمے کے لیے ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگ جائیں؟

روزنامہ جناح، 28/10/2009

خاموش خدمت گار

ذرا سنجیدگی سے سوچیے کہ اگر فضا میں کوئی بڑی ہی زہریلی گیس بھر جائے اور ہمارا دم گُھٹنے لگے، ہمیں پیاس تڑپا رہی ہو لیکن پینے کے لئے سمندروں کا کڑوا پانی ہی دستیاب ہو جسے ٹھنڈے میٹھے چشموں میں ڈھالنے والی مٹی ناپید ہو جائے، کھیت کھلیان اور سرسبز و شاداب چراہگاہیں خواب ہو کر رہ جائیں، مال مویشی چرند پرند سسک سسک کر دم توڑ رہے ہوں، زمین پر سخت پتھروں اور سنگلاخ چٹانوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دے، ویرانی و وحشت ہمارا مقدر بن جائے تو کیا زندگی موت سے بدتر نہ ہو۔ یقین مانیے کہ یہ سب کچھ ہوسکتا ہے اگر وہ خاموش خدمت گار ہم پر اپنی شفقت و محبت کی چھاؤں نہ کیے ہوئے ہوں جنہیں عرف عام میں درخت کہا جاتا ہے۔

درخت ہی تو ہیں جو فضا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ اور زمین سے پانی چوس کر سورج کی روشنی اور اپنے اندر پائے جانے والے سبز مادے ''کلوروفل'' کی مدد سے اپنے لئے گلوکوز اور ہمارے لئے آکسیجن پیدا کرتے ہیں۔ اس عمل کو (Photosynthesis) 'ضیائی تالیف' کہتے ہیں جسکے دوران درخت ایک طرف تو فضا کو کاربن ڈائی آکسائیڈ سے پاک کر رہے ہوتے ہیں جسکی موجودگی میں دم گھٹنے لگتا ہے اور دوسری طرف فضا کو آکسیجن سپلائی کر رہے ہوتے ہیں جس کی غیر موجودگی میں سانس رک جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ درختوں کی کمی سے گلوبل وارمنگ میں بھی اضافہ ہوتا ہے جو کاربن کی بہتات سے پیدا ہوتی ہے آج کی دنیا کو درپیش سنگین ترین خطرات میں سے ایک ہے۔

درختوں ہی پر گرنے کی وجہ سے بارش بھی آہستہ آہستہ زمین تک پہنچتی اور اس میں جذب ہوتی ہے ورنہ یہ سطح سے ہی تیرتی ہوئی واپس سمندروں میں چلی جائے۔ بارش کے کڑوے پانی کو جو زرخیز مٹی ایک بے مثال فلٹر کی طرح تمام کثافتوں سے پاک کرتی ہے وہ بھی پتوں اور شاخوں سے بنی ہوتی ہے جنہیں دکھائی نہ دینے والے جانداروں نے گلایا سڑایا ہوتا

ہے،اسی مٹی کے ذریعے یہ پانی زمین کی تہہ میں بھی اتر تا ہے جہاں صحت بخش معدنیات اور جڑی بوٹیوں کی آمیزش اسے انتہائی زود ہضم بنا دیتی ہے اور پھر یہ چشموں کی صورت پہاڑوں کے سینوں سے باہر ابل پڑتا ہے۔

درخت زمین کے کٹاؤ کو بھی روکتے ہیں جس سے ہمارے ڈیموں کی زندگی بڑھتی ہے اور انکی استطاعت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔وہ اسطرح کہ جتنے زیادہ درخت ہونگے اتنی ہی کم مٹی دریاؤں کے پانیوں میں مل کر ڈیموں تک پہنچے گی جو گہرائی میں کمی کا باعث بنتی ہے اور جسے صاف کرنے کا کوئی طریقہ تا حال دریافت نہیں کیا جا سکا۔کھیت کھلیان اور سرسبز و شاداب چراگاہیں بھی پتوں اور شاخوں سے بننے والی زرخیز مٹی سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ مال مویشی چرند پرند بھی درختوں ہی کی بدولت زندہ ہیں۔الغرض زندگی کی تمام تر توانائی و رعنائی درختوں ہی کے دم سے قائم دائم ہے۔

کسی ملک کی سلامتی کے لئے اسکے 25% رقبے کا درختوں پر مشتمل ہونا ضروری ہوتا ہے جبکہ (فاریسٹ انسٹی ٹیوٹ پشاور اور بین الاقوامی اداروں کے اعداد و شمار کے مطابق) پاکستان کے جنگلات کا رقبہ ہمارے کل رقبے کا 4.8% ہے لیکن اس 4.224 ملین ہیکٹر رقبے میں سڑکوں کے کناروں اور فارموں کی اراضی میں لگے درختوں کا 482,000 ہیکٹر اور متفرق شجر کاری کا 155,000 ہیکٹر رقبہ بھی شامل ہے جو جنگلات کی کسی بھی قانونی تعریف پر پورا نہیں اترتا اور اسے نکال کر ہمارے جنگلات کا رقبہ 3.587 ملین ہیکٹر باقی رہ جاتا ہے جو ہمارے کل رقبے کا 4.1% ہے۔ بفرضِ محال پاکستانی جنگلات کا رقبہ 4.224 ملین ہیکٹر ہی شمار کیا جائے اور اس میں آزاد کشمیر کے جنگلات بھی شامل کر دیئے جائیں تو بھی فی کس جنگل 0.037 ہیکٹر بنتا ہے جو دینا کے فی کس جنگل ایک ہیکٹر سے کہیں کم ہے۔جنگلات کے تناسب سے دنیا کو چار درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے،ہم آخری درجے میں شامل ہے اور ان ممالک میں بھی شمار کیے جاتے ہیں جن کے

جنگلات میں 1981 سے 1990 تک 4.3% کمی واقع ہوئی۔

ہمارے جنگلات بڑی ہی خطرناک صورتحال سے دوچار ہیں لیکن ہمیں اس کی پرواہ ہوتی تو کیا ''ٹمبر مافیا'' کومحکمہ مال اورمحکمہ جنگلات کی ملی بھگت سے اربوں کھربوں روپے کے سرکاری جنگل ذاتی ملکیت میں بدلنے کی اجازت دیتے؟ ہمارے اونچے اونچے علاقوں مثلاً ناران، کاغان، وادئ نیلم وغیرہ کے جنگلات کے قرب و جوار میں آباد ایک کنبہ ہر سال پانچ لاکھ سے ساڑھے سات لاکھ روپے کی 200 سے 300 مکعب فٹ دیودار کی لکڑی اس لئے جلا دیتا ہے کہ اسکے پاس سردیاں گزارنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں لیکن آج تک اسے پچاس ساٹھ من کیکر یا جلانے والی کوئی دوسری لکڑی فراہم نہیں کی جاسکی جس کی مالیت چند ہزار روپے سے زیادہ نہیں۔ نہ ہی ان لوگوں کو جنگلوں سے دور آباد کرنے کا کوئی پروگرام ترتیب دیا جاسکا جسکے بغیر (ماہرین کے خیال میں) جنگلوں کر بچانا ایک ناممکن سی بات ہے۔

خانہ بدوش چرواہے بھی جنگلوں کو بہت نقصان پہنچا رہے ہیں، اس لئے کہ وطن عزیز میں جانوروں کی نسبت چراہ گائیں بہت کم ہو چکی ہیں اور انہیں اپنے جانوروں کو چرائی کے لئے اکثر و بیشتر جنگلوں میں ہی لے جانا پڑتا ہے جہاں انکے جانور ہر سال لاکھوں بیش قیمت پودے کھا لیتے ہیں یا کچل دیتے ہیں لیکن اس سلسلے میں بھی کوئی منصوبہ سامنے نہیں آسکا۔

ہماری منصوبہ بندی وحکمت عملی کا حال یہ ہے کہ گریڈ-5 کے ایک ملازم کو ایسے سینکڑوں بلکہ ہزاروں درختوں کی رکھوالی سونپ دی جاتی ہے جن میں سے ایک درخت کی مالیت بھی اس کی تنخواہ سے ہزاروں گنا زیادہ ہے۔ مثلاً وادئ نیلم میں ایک فارسٹ گارڈ کے زیرنگرانی 1800 ایکڑ جنگل ہوتا ہے۔ ایک ایکڑ میں کم ازکم 24 تیار درخت ہوتے ہیں اور ایک تیار درخت میں 400 مکعب فٹ کے لگ بھگ لکڑی ہوتی ہے۔ یعنی ایک گارڈ 43200 تیار درختوں کا رکھوالا ہوتا ہے، اگر یہ درخت دیودار کے ہوں (جیسا کہ وادئ نیلم میں ہے) تو انکی مالیت (بے کار لکڑی یعنی) ''ویسٹیج'' نکال کر تقریباً 25 ارب روپے بنتی ہے جس میں ان

درختوں کی مالیت بھی شامل کر لی جائے جو ابھی تیار نہیں ہوئے تو سوچیے کہ یہ کہاں سے کہاں چلی جائے گی جبکہ فارسٹ گارڈ کی تنخواہ 6 سے 10 ہزار روپے ماہوار ہوتی ہے۔

اور ہماری اہلیت کا عالم یہ کہ کہ لاکھوں روپے خرچ کرنے کے باوجود لوگوں میں یہ بنیادی شعور بھی پیدا نہیں کیا جا سکا کہ درخت ہیں تو سب کچھ ہے، درخت نہیں تو کچھ بھی نہیں اور درخت پر کلہاڑی مارنا دراصل اپنے آپ پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔

درختوں کی کمی سے مسائل پیدا ہوتے ہیں ان سے نمٹنے کے لئے تو ہم دل کھول کر وقت، توانائی اور پیسہ خرچ کرتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ درختوں کی کمی کو پورا نہیں کرتے۔ اگر ہم اپنی ساری زندگی میں ایک پودے کو بھی پروان چڑھانے میں کامیاب ہو جائیں تو یقین مانیے کہ دنیا کے مستقبل سمیت اپنی عاقبت بھی سنوار سکتے ہیں۔

درخت 36 کروڑ سال سے دن رات بڑی خاموشی کے ساتھ ہمارے لیے وہ خدمات انجام دے رہے ہیں جو کوئی اور نہ دے رہا ہے نہ ہی دے سکتا ہے، کیا ہمیں اپنے ان خاموش خدمت گاروں کے لیے کوئی خدمت انجام نہیں دینی چاہیے؟

کاٹتے کیوں ہو ان درختوں کو
سانس لیتے ہو جن کی چھاؤں میں
ان درختوں سے اور پیار کرو
ان کو شامل کرو وفاؤں میں

روزنامہ خبریں، 12/10/2006

حجِ اکبر

اس کی زندگی کا واحد مقصد حج تھا لیکن وہ بہت غریب تھا۔ حج کے پیسے جمع کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا، پھر بھی اس کی لگن اُسے ہمت نہ ہارنے دیتی تھی۔ اُس نے محنت مزدوری کے اوقات بھی بڑھا دیے اور اپنا پیٹ بھی کاٹنا شروع کر دیا۔ چھ کے بجائے بارہ گھنٹے کا کام اور چار کے بجائے دو روٹیاں اسکا معمول بن گیا۔ وہ تھکن اور بھوک سے نڈھال ہو کر گھر لوٹتا لیکن جب اسکی نگاہ اپنے کمرے میں لگی خانہ کعبہ کی تصویروں پر پڑتی تو تھکن کا احساس باقی رہتا نہ بھوک کا۔ انہی تصویروں کو دیکھتے دیکھتے اسکا دن طلوع بھی ہوتا تھا اور غروب بھی۔ رات کو سوئے ہوئے بھی وہ خانۂ خدا ہی کے خواب دیکھتا رہتا تھا۔ پانچ وقت کا نمازی تو وہ تھا ہی لیکن جب سے اس نے یہ سن لیا تھا کہ تہجد کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے، یہ نماز بھی اسکی زندگی کا لازمی جزو بن گئی تھی۔ ہر نماز کے بعد وہ یہی ایک دعا مانگتا تھا کہ اے خدا مجھے حج کی سعادت نصیب فرما دے۔

اسے جب بھی پتہ چلتا کہ آس پاس کا کوئی شخص حج پر جا رہا ہے تو اسے ضرور ملتا اور کہتا کہ آپ بڑے خوش نصیب ہیں، یہ عنایت کسی کسی پر ہی ہوا کرتی ہے، اسی عنایت کے صدقے خانۂ خدا کے سامنے کھڑے ہو کر خدا سے میری باریابی کی دعا بھی مانگنا، میں ساری زندگی آپ کا احسان مند رہوں گا، کہیں آپ مجھے بھول تو نہیں جائیں گے؟ پھر جب اسے یہ جواب ملتا کہ تمھیں کوئی کیسے بھول سکتا ہے تو اسکی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ نم آنکھوں سے ہی وہ حج سے واپس آنے والوں کو خوش آمدید بھی کہتا اور جب اسے یہ بتایا جاتا کہ خانۂ خدا کے روبرو اسکی باریابی کے لیے بطورِ خصوصی دعا مانگی گئی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا۔

آخر کار اس نے اتنی رقم اکٹھی کر ہی لی کہ جس سے وہ حج کر سکے۔ یہ اس کی زندگی کا خوشگوار ترین دن تھا جسکا بیشتر حصہ اس نے جائے نماز پر رو رو کر گزار دیا۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ یہ خوش خبری سنانے اس غریب پڑوسن کے پاس گیا جو اس کے حج کی دعائیں مانگتی رہتی تھی

اور اسکا حوصلہ بھی بڑھاتی تھی تو اسے پتہ چلا کہ بڑھیا کا واحد سہارا اسکا اکلوتا بیٹا شدید بیمار ہے۔ ڈاکٹر نے فوری آپریشن کے لئے کہا ہے اور بیچاری بڑھیا کے پاس آپریشن تو دور کی بات، دوا دارو کے پیسے بھی نہیں۔ یہ جان کر کہ بروقت آپریشن نہ ہونے کی صورت میں بچے کی جان جاسکتی ہے یا وہ معذور ہوسکتا ہے، اس شخص نے حج کے لئے اکٹھی کی ہوئی زندگی بھر کی خون پسینے کی کمائی بڑھیا کے ہاتھ پر رکھ دی جبکہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اتنی رقم وہ دوبارہ اکٹھی نہیں کر سکے گا۔ وہ شخص حج تو نہیں کرسکا لیکن حج پر نہ جا کر اس نے جو قربانی دی وہ ''حجِ اکبر'' کے نام سے ایک عرصہ تک نصاب کی کتب میں شامل رہی جسے غالبًا ضیاالحق صاحب کے ''جہادی'' دورِ اسلام میں حذف کر دیا گیا۔

یہ کہانی اس روز اچانک یاد آ گئی جب ایک دوست نے بتایا کہ اسکے والد صاحب کسی بیماری کی وجہ سے اپنی جگہ اسے حج پر بھیجنا چاہتے تھے۔ میرا دوست اسی روز گاؤں سے واپس آیا تھا جہاں قیام کے دوران وہ اپنے ملازم بشیر کی زخمی بیٹی کو دیکھنے اس کے گھر گیا تو اس کی کچی چھت شدید بارش کے باعث بری طرح ٹپک رہی تھی۔ بشیر کا بڑا بیٹا جسکی عمر بارہ تیرا سال سے زیادہ نہیں تھی، سر پر سیمنٹ کا خالی بیگ اوڑھے اپنے ننھے ننھے پیروں سے چھت کو دبا دبا کر ان سوراخوں کو بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں سے پانی گھر کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ گھر ایک ہی کمرے پر مشتمل تھا جس میں ایک طرف دو چارپائیاں رکھی تھیں اور دوسری طرف چولہا اور کھانے پکانے کے برتن پڑے تھے۔ سوراخ بند کر کے بشیر کا بڑا بیٹا نیچے آیا اور چولہے کے آگے بیٹھ کر ہاتھ گرم کرنے اور کپڑے سکھانے لگا لیکن ابھی ہاتھ گرم ہوئے تھے نہ کپڑے سوکھے تھے کہ کچی چھت دوسری جگہ سے ٹپکنے لگی۔ ماں کی مدد سے زخمی بہن کی چارپائی کو نئی جگہ منتقل کر کے وہ ایک بار پھر چھت کی طرف لپکا جبکہ ماں چھوٹے بیٹے کی مدد سے کمرے کے ٹپکنے والے حصے سے سامان اٹھا اٹھا کر دوسری جگہ رکھنے لگی۔

یہ آنکھوں دیکھا حال اپنے والد کو سنا کر میرے دوست نے ان سے کہا کہ بشیر اپنے

بیوی بچوں کے ساتھ ہوتو اور بات ہولیکن وہ تو ہمارے پاس رہتا ہے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ گاؤں میں کس قیامت کی سردی پڑتی ہے۔ برف باری میں جب اسکی چھت ٹپکتی ہوگی تو اس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کا کیا حال ہوتا ہوگا؟ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ حج کے پیسوں سے بشیر کو ٹین کی چھت ڈلوا دیں؟ وہ بولے کہ بیٹا حج تو فرض ہے؟ میرے دوست نے پوچھا کہ کیا اپنے پڑوسی یا اپنے ملازم کی دیکھ بھال فرض نہیں؟ کیا آپ کو حجِ اکبر کی وہ کہانی یاد نہیں جو بحثیت استاد ایک عرصے تک آپ اپنے طالب علموں کو پڑھاتے رہے؟ مجھے بھی تو یہ کہانی آپ ہی نے پڑھائی تھی۔ کیا آپ حجِ اکبر سے محروم رہنا چاہتے ہیں؟ وہ بولے کہ بیٹا پہلے میں مولوی صاحب سے مشورہ کروں گا پھر تمہاری بات کا جواب دوں گا۔ میرے دوست نے کہا کہ مولوی صاحب سے کیوں پوچھیں گے؟ کیا آپ کو قرآنِ کریم نہیں آتا یا آپ حضور اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ سے ناآشنا ہیں؟ اگر حضرت انسؓ کی چھت ٹپک رہی ہوتی اور ان کے بچوں کا حال بشیر کے بچوں جیسا ہوتا تو کیا نبی اکرمؐ انہیں اس حال میں چھوڑ کر حج پر چلے جاتے؟ اگر حضورؐ آج ہم میں موجود ہوتے تو کیا آپ کو حج کا مشورہ دیتے یا بشیر کے کچے گھر پر ٹین کے چھت ڈلوانے کا؟ وہ بولے کہ اچھا بیٹا میں تمھاری بات پر غور کروں گا جس سے میرے دوست کو یقین ہو گیا کہ وہ بشیر کو ٹین کی چھت ڈلوا دیں گے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اپنی جگہ اپنے چھوٹے بھائی کو حج پر بھیج دیا۔

اس واقعے سے کئی ضروری سوالات جنم لیتے ہیں جن میں سے چند ایک کے جوابات کے لیے اپنے قارئین کرام کو زحمت دے رہا ہوں۔ نبیِ آخرلزماںؐ کی سیرت طیبہ کس سے پوشیدہ ہے، انسانیت کے اس سنہرے ترین باب کو ذہن میں رکھیے اور بتایئے کہ کیا یہ جائز ہے کہ ایک طرف توجح پر لاکھوں کروڑوں روپئے خرچ کیے جائیں اور دوسری طرف لاکھوں کروڑوں لوگ ایک ایک روٹی کو ترس رہے ہوں؟ کیا کسی ایسے شخص کا حج قبول ہوسکتا ہے جسکا ملک اپنی تاریخ کے بدترین معاشی بحران سے گزر رہا ہو اور غربت و بھوک کے مارے

ہم وطن مسلمان بھائی اپنے جگر کے ٹکڑوں تک کو مارنے اور خودکشی کرنے پر مجبور ہوں؟ خدا کے بارے میں کیا ہم یہ نہیں جانتے کہ وہ حقوق اللہ تو معاف بھی کر دیتا ہے لیکن حقوق العباد معاف نہیں کرتا؟ عاقبت سنوارنے کی دھن نے کیا ہمیں اس فرض کی پکار سے غافل نہیں کر دیا جسے ادا کیے بغیر عاقبت سنور ہی نہیں سکتی؟ آج کل ہمیں حج کرنا چاہیے یا حجِ اکبر؟ آپ کے جوابات کا منتظر رہوں گا۔ خدا حافظ۔

روزنامہ خبریں، 16/12/2006

غلام ابنِ غلام ابنِ غلام

اگر کوئی ڈاکٹر ایک مالشی کا حلیہ اختیار کر کے ہاتھ میں تیل کی بوتلیں اٹھائے اور بازار میں گھومنا شروع کر دے تو لوگ اس سے علاج کروانے آئیں گے یا مالش؟ اور اگر کوئی بادشاہ ایک بھکاری کے بھیس میں فٹ پاتھ پر بیٹھ جائے تو لوگ اس کے ساتھ بادشاہوں والا سلوک کریں گے یا بھکاریوں والا؟ ہماری آزادی اور خودمختاری کو امریکہ احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے یا نہیں، یہ تو بعد کی بات ہے پہلے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ اپنی آزادی اور خودمختاری کو ہم کس نگاہ سے دیکھتے ہیں؟ ہم بنیادی طور پر غلامانہ ذہنیت کے لوگ ہیں، اسی لیے آزادی کے ساٹھ سال بعد بھی نفسیاتی طور پر آزاد نہیں ہو سکے۔ اس غلامانہ ذہنیت سے خود چھٹکارا پانا تو دور کی بات ہمیں تو یہ بھی گوارا نہیں کہ کوئی دوسرا ہی اس سے نجات حاصل کر لے۔ باقی باتیں چھوڑیے صرف اسی مثال پر غور کر لیجئے کہ ہم آج تک اپنے بچوں کو (سرکاری طور پر) چُھٹی کی جو درخواست ''رٹاتے'' ہیں وہ ''most respectully i beg to say'' (یعنی ''نہایت ادب کے ساتھ یہ کہنے کی بھیک مانگتا ہوں'') سے شروع ہوتی ہے اور اگر کوئی بچہ اس درخواست کو کسی دوسرے طریقے سے شروع کر دے تو اس کے نمبر کاٹ لیتے ہیں۔

مجھے سکول کے دنوں میں جب یہ پتہ چلا کہ beg کا مطلب بھیک مانگنا ہوتا ہے اور begger بھکاری کو کہتے ہیں تو بڑی بے عزتی محسوس ہوئی لیکن اس کا اظہار انگریزی کے استاد سے کیا تو وہ خوش ہونے کے بجائے ناراض ہو گئے، کہنے لگے کہ'' نصاب میں یہی درخواست شامل ہے اور اسی کو یاد کرنے کے نمبر بھی ملیں گے۔ میں تمھارے لیے نصاب تبدیل نہیں کروا سکتا''۔ سرکاری ملازمت شروع کی تو باس کو سرکاری خط کا جو پہلا مسودہ پیش کیا اس پر یہ درستگی فرمائی گئی کہ میرے نام سے پہلے 'Your Obedient Servent' یعنی 'آپ کا فرماں بردار ملازم' لکھ دیا جسے دیکھ کر مجھے ایک بار پھر 'beg to say' والی کہانی یاد آ گئی۔ یہ کتھا انہیں بھی سنائی اور بتایا کہ آپ نے جو لکھ دیا ہے وہ میں نے جان بوجھ کر نہیں لکھا

تھا لیکن سکول کے استاد کی طرح انھوں نے بھی میری ایک نہ سنی اور یہ حکم دیا کہ ''آپ سے جو کہا جائے بس وہی کیا کریں، میں آپ کے لیے خط و کتابت کے سرکاری قواعد وضوابط تبدیل نہیں کرواسکتا''۔ میں نے مجبوراً Your obedient Servent لکھ دیا لیکن اس کے نیچے اپنے نام کے بجائے ان کا نام لکھ دیا اور گزارش کی کہ بہتر ہوگا یہ خط آپ ہی کے دستخطوں سے جائے۔ اس کے بعد سکول کی طرح سرکاری ملازمت میں بھی میرے نمبر کٹنے شروع ہو گئے اور آخرِ کار میں فیل ہوگیا۔

ہمارا سب سے بڑا مسلئہ یہ ہے کہ ہم حیوانوں کی طرح زیادہ تر کام سوچے سمجھے بغیر کرتے ہیں ورنہ کم ازکم اتنا ضرور سوچتے کہ انگریزوں نے ہمیں تو "I beg to say" اور "Your Obedient Servant" لکھنے کی عادت ڈالی دی لیکن خود اس سے اجتناب کیوں کیا؟ جس قسم کے خط اور درخواستیں وہ برِصغیر کے لوگوں سے لکھواتے رہے ویسے برطانیہ میں کیوں نہیں لکھے جاتے؟ یہ سیدھی سی بات خدا جانے ہم کب سمجھیں گے کہ انگریز حاکموں کی تعداد ہزاروں میں تھی اور اس حقیقت سے وہ بڑی اچھی طرح آگاہ تھے کہ کروڑوں محکوموں پر اپنا تسلط جمائے رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان میں غلامانہ ذہنیت کو فروغ دے کر ان کی نفسیاتی آزادی کو سلب کرلیا جائے۔ انگریز چلے گئے تو بھی ہماری غلامی ختم نہ ہوئی کیونکہ انکی جگہ ان ہم وطنوں نے لے لی جنہیں اپنوں سے غداری اور غیروں سے وفاداری کے عوض بڑی بڑی جاگیروں اور خطابات سے نوازا گیا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ جو لوگ 1857 کی جنگِ آزادی کو ناکام بنانے میں انگریزوں کے آلہء کار بنے انہی کی اولاد آزادی کے بعد ہماری حکمران بن گئی؟ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں آج بھی "I beg to say" اور "your obedient servant" نہ لکھنے والوں کے نمبر کاٹ لیے جاتے ہیں۔ محکوم لوگوں کی بات چیت اور چال ڈھال دونوں سے محکومیت چھلکا کرتی ہے، ہم نے کیونکہ طویل عرصہ تک غلامی کے سوا کچھ نہیں دیکھا اس لیے ہماری زبان میں القاب وآداب کا استعمال زیادہ ہوتا ہے اور ہم اپنے حکمرانوں

کو دیکھ کر بچھ بچھ جاتے ہیں چاہے اسکی ضرورت ہو یا نہ ہو۔آپ خود ہی سوچیے کہ جن لوگوں کو اپنے جائز حق کے لیے بھی بھیک مانگنی پڑتی ہو، یہی نہیں بلکہ اسے حاصل کرنے کے بعد احسان مند بھی ہونا پڑتا ہو، وہ اپنے حق سے ہٹ کر کچھ پانے کے لیے کیا کچھ کرنے کو تیار نہیں ہونگے؟اسی لیے ہمیں اور ہمارے حکمرانوں کو دنیا بھر میں کہیں بھی قابلِ تحسین مقام حاصل نہیں۔ہم میں اور ہمارے حکمرانوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ہم انکے اور وہ امریکہ کے غلام ہیں ورنہ ہم دونوں کا نفسیاتی انحطاط بالکل ایک ہی جیسا ہے۔کیا آپ نے کبھی غور نہیں کیا کہ ہمارے حکمرانوں کی نگاہ میں جو مقام ہمارا ہے وہی امریکہ کی نگاہ میں ان کا ہے اور جسطرح ہم انکی نظر میں آنے کے لیے بیتاب رہتے ہیں ویسے ہی وہ بھی اپنے امریکی آقاؤں کو دیکھ کر بلا وجہ مسکرانے لگتے ہیں۔یہ حال پہلے بھی ایسے ہی تھا جب ہماری جگہ ہمارے آباواجداد، ہمارے حکمرانوں کی جگہ انکے باپ دادا اور امریکی آقاؤں کی جگہ برطانوی آقا ہوا کرتے تھے۔

ہم غلام ابنِ غلام ابنِ غلام ہیں اور ہمیں غلامی کی عادت پڑ چکی ہے۔اگر ہم اپنی حالت تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنی ہوگی اور آزاد لوگوں کی طرح دیکھنا،سننا اور سوچنا ہوگا،اگر ہم باوقار لوگوں کی فہرست میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں باوقار لوگوں کا رویہ بھی اپنانا ہوگا،اگر ہم باعزت قوم بننا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں باعزت قوموں والے کام بھی کرنے ہونگے بصورتِ دیگر ہم مالشی بنے رہیں گے تو ہم سے مالش ہی کروائی جائے گی اور بھیک مانگتے پھریں گے تو ہمارے ساتھ بھکاریوں جیسا سلوک ہی کیا جائے گا۔اپنی خودمختاری اور آزادی کو ہم خود ہی احترام کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے تو کوئی دوسرا کیوں دیکھے گا؟

روزنامہ جناح، 18/11/2008

پبلک سروس کمیشن پر پبلک کا اعتماد بحال کیجئے

پبلک سروس کمیشن کے ایک ممبر سے میں نے پوچھا کہ ایک سرجن ڈاکٹر سے دیوارِ چین کی لمبائی چوڑائی اور غزوہ ءبدر میں شریک مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں سوال کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ یا ایک انجینئر سے سربراہانِ مملکت کے نام اور ایک آرکیٹکٹ سے آئین میں کی گئی ترامیم کے متعلق پوچھنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ انہوں نے کچھ ناخوشگوار سے لہجے میں جواب دیا کہ معلوماتِ عامہ ایک انسان اور اسلامیات ایک مسلمان کی زندگی کا لازمی جزو ہوتے ہیں؟ میں نے کہا کہ محسوس مت کیجئے، خدا کے فضل و کرم سے میں بھی ایک انسان اور مسلمان ہوں لیکن کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ جب آپ کو اپنے ذاتی علاج کے لیے ڈاکٹر کا انتخاب کرنا ہوتا ہے تو اس سے پہلے بھی اسی طرح کی باتیں پوچھتے ہیں؟ اور کیا آپ ایسے ڈاکٹر سے علاج نہیں کرواتے جسے قانون ساز اسمبلی کے ممبران کی تعداد یا قومی پرچم کے رنگوں کا پس منظر معلوم نہ ہو؟ اگر آپ کسی ڈاکٹر کو اپنے ملک میں محض اس لیے گوارا نہیں کرتے کہ اسے اسلامی علوم سے واقفیت نہیں تو پھر اپنے بیٹے کو علاج کے لیے بیرونِ ملک کیوں لے گئے تھے؟ جس انگریز نے آپ کے بیٹے کا آپریشن کیا تھا کیا اس سے بھی آیۃ الکرسی سنی تھی؟ کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا کہ اگر کوئی اپنے گھر کی تعمیر کے لیے انجینئر کے انتخاب سے پہلے اس سے پاکستان کے چوتھے صدر کا نام دریافت کرے اور نام نہ بتانے پر اسے گھر کی تعمیر کے لیے غیر موزوں قرار دے دے تو آپ اس کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟ یا اگر کوئی اپنے گھر کا نقشہ بنوانے سے پہلے آرکیٹکٹ سے 58(2B) کے بارے میں پوچھے اور جواب نہ ملنے پر اس سے گھر کا نقشہ نہ بنوائے تو کیا ایسے شخص کو آپ احمق نہیں کہیں گے؟

انہیں مجھ سے ایسے سوالوں کی توقع تھی نہ ہی وہ ان کے لیے تیار تھے، کچھ دفاعی سے انداز میں بولے کہ معلوماتِ عامہ اور اسلامیات کے تھوڑے سے نمبر ہوتے ہیں، اصل بات تو اپنے اپنے subject کی ہی ہوتی ہے؟ میں نے کہا کہ ان تھوڑے سے نمبروں کی وجہ سے بھی

کیا کسی نااہل ڈاکٹر کو ایک لائق ڈاکٹر پر فوقیت نہیں مل سکتی؟ اور اگر ایسا ہو جائے تو آپ کو اندازہ ہے کہ اس سے کس قدر سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں؟ آپ جسے چھوٹی سی بات سمجھتے ہیں کیا وہ بہت بڑی بات نہیں؟

ان کے پاس میرے کسی بھی سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے کہ وہ تحصیلدار کے عہدے سے ترقی کرتے کرتے گریڈ 20 تک پہنچ کر ریٹائر ہوئے تو سیاسی وابستگی پر پبلک سروس کمیشن میں ''ایڈجسٹ'' کر دیے گئے، ایک تحصیلدار کو جب ڈاکٹروں، انجینئروں اور پروفیسروں کے انتخاب پر مامور کر دیا جائے تو وہ امیدواران سے ان ''مشکل مشکل'' سوالوں کے علاوہ پوچھ بھی کیا سکتا ہے جو گذشتہ رات ''ڈوگر برادرز یا بھٹی برادرز'' کی کی کتب سے ازبر کیے ہوتے ہیں؟ پھر اپنے سے کہیں زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کو لاجواب کرنے کا لطف بھی تو اور ہی ہوتا ہے؟ اس روز بھی وہ کسی ڈاکٹر کی نالائقی پر ہنس رہے تھے اور اپنے پاس بیٹھے لوگوں کو بتا رہے تھے کہ اس نے ''ایم بی بی ایس'' کا امتحان تو پاس کر لیا ہے لیکن یہ بھی معلوم نہیں کہ دوربین کس نے ایجاد کی؟

بالخصوص اسلامیات کے بارے میں ہم لوگ کچھ زیادہ ہی حساس ہیں، ایک مرتبہ ایک ممبر صاحب نے جو اسلامیات کے ماہر تھے، ایک ڈاکٹر سے اس قسم کے سوالات پوچھے کہ جنگِ جمل کس کے درمیان ہوئی تھی اور کیوں ہوئی تھی؟ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد خلیفہ کا انتخاب کس طرح ہوا؟ ڈاکٹر نے تنگ آ کر کہہ دیا کہ جناب میں نے اسلامیات کا لیکچرر نہیں بننا، میں نے تو ڈاکٹری کرنی ہے؟ ان صاحب نے جواب دیا کہ کیا آپ مسلمان نہیں؟ ڈاکٹر نے کہا کہ کیا ایسا شخص مسلمان نہیں ہوتا جسے یہ معلوم نہ ہو کہ جنگِ جمل کے فریق کون تھے؟ ہمیں تو آج تک یہی بتایا گیا کہ جو شخص صدقِ دل سے کلمہ پڑھ لے اور فرشتوں، خدا کی طرف سے نازل ہونے والی کتابوں، پیغمبرانِ کرام اور یومِ آخرت پر ایمان لے آئے وہ مسلمان ہوتا ہے؟ اس جواب پر ظاہر ہے کہ وہ ممبر صاحب ناراض ہو گئے ہونگے، اس پر ستم یہ کہ بے چارے ڈاکٹر کو

معلوماتِ عامہ کا کوئی جواب بھی نہ آیا، اس کی کوئی سفارش بھی نہیں تھی چناچہ وہ فیل ہو گیا جبکہ اس نے ایوب میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس میں اول پوزیشن حاصل کی ہوئی تھی، وہ ڈاکٹر دل برداشتہ ہوکر بیرونِ ملک چلا گیا۔ یہ واقعہ مجھے میرے ایک دوست اور کلاس فیلو ڈاکٹر لیاقت حسین نے سنایا، لیاقت بھی ایوب میڈیکل کالج کے ہی پڑھے ہوئے ہیں، وہ خود بھی پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس نہیں کر سکے تھے البتہ کینڈا میں بحیثیت ڈاکٹر پریکٹس کرنے کا امتحان جو ہمارے ''پی ایس سی'' سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں گنا مشکل ہوتا ہے، فوراً ہی پاس کر گئے تھے، وہاں بڑی کامیاب زندگی گزار رہے ہیں اور شہریت بھی حاصل کر چکے ہیں۔ اس طرح کی ڈھیروں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن فی الحال انہی دو مثالوں سے کام چلایئے اور سوچیے کہ پبلک سروس کمیشن کے انٹرویو میں جو پینل بیٹھا ہوتا ہے کیا اس میں ایک بھی نان پروفیشنل ممبر بیٹھا ہونا چاہیے چاہے وہ کوئی ریٹائرڈ سیکریٹری، جنرل یا جج ہی کیوں نہ ہو؟ ہم نے دیگر محکمہ جات کی طرح پبلک سروس کمیشن کو بھی ایک مذاق بنا کر رکھ دیا ہے جس کے ممبران کی اکثریت ''نان پروفیشنل'' لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے، وہ بھی ایسے جو سراسر سیاسی وابستگی یا کسی بھی دوسری وجہ سے لگائے جاتے ہیں جس کا میرٹ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ آپ خود ہی سوچیے کہ جو ممبران خود سفارش، اقربا پروری یا رشوت کی بنیاد پر تعینات کیے جائیں گے وہ کسی دوسرے کو میرٹ پر کیوں منتخب کریں گے، کیا وہ حتی الامکان اپنے ان آقاؤں کو خوش کرنے کی کوشش نہیں کریں گے جنکے طفیل وہ ممبر لگے اور آئندہ بھی لگ سکتے ہیں؟

ضرورت اس امر کی ہے کہ پبلک سروس کمیشن کو (چاہے وہ صوبائی ہو چاہے وفاقی) مکمل طور پر اس طرح کا خود مختار ادارہ بنا دیا جائے کہ اس کے ممبران کا انتخاب جدید ترین تقاضوں اور میرٹ پر ہو، کوئی ایک ''نان پروفیشنل'' اور ''سرکاری'' آدمی بھی اس کا حصہ نہ بن سکے، امتحان کا قدیم ترین طریقہ فوری طور پر تبدیل کیا جائے، انٹرویو کے بجائے تحریری امتحان لیا جائے جس کی جوابی کاپیاں انٹرنیٹ کے ذریعے امیدواران کی دسترس میں ہوں تاکہ شک وشبے اور بددیانتی کی

گنجائش کم از کم ہو جائے، تحریری امتحان کے ساتھ اگر انٹرویو بھی ناگزیر ہو تو اس کے لیے بے داغ ساکھ کے غیر سرکاری اور اول درجے کے پروفیشنل لوگوں کی خدمات حاصل کی جائیں جن کے کوائف کمیشن کی ویب سائٹ پر کوئی بھی دیکھ سکے، انتخاب کے طریقے کو ترقی یافتہ ممالک کے طریقہء انتخاب سے ہم آہنگ کیا جائے جس کے لیے ماہرین کی خدمات لینا کوئی مشکل بات نہیں۔

پبلک سروس کمیشن کا ادارہ اپنی غیر موزوں، غیر سائنسی، نان پروفیشنل اور ناقص کارکردگی کی وجہ سے پبلک کی نگاہ میں اپنا اعتماد کھو چکا ہے جسے فوری طور پر بحال کیے جانے کی ضرورت ہے تا کہ اہل لوگوں کے دل و دماغ میں ''بھی'' اس کے روبرو پیش ہونے کی خواہش پورے وثوق سے بیدار ہو سکے لیکن یہ سنہرا خواب اس وقت تک شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک اس ادارے کی جان نااہل، کرپٹ اور ''لکیر کے فقیر'' لوگوں سے چھڑا نہیں لی جاتی؟ یہ کام جتنی جلدی ممکن ہو، کر لینا چاہیے تا کہ ہمارے مستقبل کے سنورنے کی جو تھوڑی سی امید باقی ہے وہ باقی رہے۔

روزنامہ جناح، 27/8/2009

کسی کو سازش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

مشہور شاعر، فلسفی اور مصور جبران خلیل جبران (1883-1931) نے اپنی ایک نظم (Pity the Nation) میں ایک ''شرمناک قوم'' کے متعلق کہا ہے کہ وہ عقائد سے بھری لیکن مذہب سے خالی ہوتی ہے، وہ کپڑا پہنتی ہے جو خود نہیں بُنتی، وہ اناج کھاتی ہے جو اس کے اپنے کھیتوں میں نہیں اُگتا، وہ شراب پیتی ہے جو خود کشید نہیں کرتی، غنڈوں کو ہیرو قرار دیتی ہے اور ہر غالب آنے والے کو جھولی بھر بھر کے درازیء عمر کی دعائیں دیتی ہے، اس کی آواز جنازوں اور ماتمی جلوسوں کے سوا کہیں بلند نہیں ہوتی، اپنے کھنڈرات پر ناز کرتی ہے، اس وقت تک بغاوت پر آمادہ نہیں ہوتی جب تک موت کے منہ میں نہ پہنچ جائے، اس کے سیاست دان اور سفارت کار لومڑ اور فلسفی مداری ہوتے ہیں، تخلیق سے عاری ہوتی ہے اور اس کا ہنر نقالی ہوتا ہے، ہر حکمران کا استقبال خوشی کے نقارے بجا کر کرتی ہے اور آوازے کس کس کے اسے رخصت کرتی ہے تا کہ اس کے بعد والے کو بھی شادیانوں کے ساتھ خوش آمدید کہہ کر گالیوں کے ساتھ گڈ بائے کہہ سکے، قومی یکجہتی سے دور ہو کر اسطرح ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی ہوتی ہے کہ ہر ٹکڑا خود کو ایک الگ قوم تصور کرنے لگ جاتا ہے۔

اس نظم کو جب بھی پڑھتا ہوں یا اس کا خیال آ جاتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شاعر نے ہماری ہی قوم کی حالتِ زار لکھ ڈالی ہے۔ ہم رسومات و روایات کے اتنے عادی چکے ہیں کہ ہمارا مذہب ہی ایک عقیدہ بن کر رہ گیا ہے، اگر ایسا نہیں ہوتا تو کیا ہم اس عظیم کتاب کو چلوں اور وظیفوں میں استعمال کرتے جو ایک دستورِ حیات کے طور پر نازل کی گئی تا کہ اسے سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے؟ ہمارا ملک جغرافیائی طور پر دنیا کے بہترین زرعی ممالک میں سے ایک ہے لیکن ہم گندم کے دانے دانے کو ترستے ہیں اور ہمارے یہاں ناشپاتی اور گاجر بھی پڑوسی ممالک سے آتی ہے؟ ہم حکمرانوں کو دیکھ کر بلا وجہ ہی مسکرانے اور دم ہلانے لگتے ہیں چاہے وہ چور، ڈاکو، لٹیرے یا قاتل ہی کیوں نہ ہوں؟ ہم زندہ لوگوں کو کچل دیتے ہیں لیکن مرے ہوؤں

کے لیے ٹریفک روک لیتے ہیں؟ اپنے آباؤ اجداد کی عظمت کے قصے دہرا دہرا کر خوش ہوتے رہتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ ہم خود کیا ہیں؟ ملک تباہی و بربادی کی بدترین لپیٹ میں ہے لیکن ہم ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری تک چھوڑنے کو تیار نہیں؟ ہمارے ''مدبرین'' کی ذہانت وفطانت لومڑی کی طرح بس اپنے ذاتی مفادات کے گرد ہی گھومتی رہتی ہے اور ہمارے ''فلسفی'' محض لفاظی اور یاداشت کے زور پر علمیت جھاڑتے رہتے ہیں؟ تخلیق اور جدت نام کی کوئی شے دور دور تک ہم میں دکھائی نہیں دیتی، تقلید ہماری پسندیدہ روش ہے، نئی بات کرنے والا ایک آنکھ نہیں بھاتا اور لکیر کے فقیر کو پلکوں پر بٹھاتے ہیں؟ ملک میں جمہوریت آئے یا مارشل لا ہر دو صورتوں میں مٹھائیاں تقسیم کرتے ہیں؟ ہم پنجابی، سندھی، پٹھان، بلوچ، کشمیری تو بن گئے لیکن پاکستان بننے کے 62 برس بعد بھی پاکستانی نہ بن سکے؟

ایک ویب سائٹ ہمیں بدترین قوم قرار دیتی ہے اور اپنے موقف کی تائید میں بڑے دردناک اعداد وشمار پیش کرتی ہے: ہم ایک ایسی بے عمل قوم ہیں جس نے وہ کام بھی اللہ کے ذمے چھوڑ رکھے ہیں جو خود کرنے ہیں 82.2%، ہم گلے شکوے میں ماہر ہیں 78.6% محض ایک باتونی قوم ہیں 91.1%، غلطی پر نادم ہونے کو توہین سمجھتے ہیں 60.8%، دوسروں پر کیچڑ اُچھالتے ہیں 85.3%، وعدہ خلاف ہیں 79.5%، منافقت ہمارا وطیرہ ہے 54.8%، وسائل کا بے جا استعمال کرتے ہیں 85.7%، قطار بنانے کو بیوقوفی سمجھتے ہیں 67.9%، نظم و ضبط کا مفہوم بھی نہیں جانتے 66.8%، ہمیں وقت کی کوئی قدر نہیں 78.6% لیکن ہر شخص جلدی میں ہے 48.6%، بھیڑ چال جیسے موذی مرض میں مبتلا ہیں 70.7% لیکن ہر شخص خود کو افلاطون سمجھتا ہے 78.1%، جس کے پاس جتنا زیادہ اختیار ہے وہ اپنے آپ کو اتنا ہی فرعون سمجھتا ہے 90.8%، عام آدمی کسی بردبار جانور سے کم نہیں 81.2%، ہر شخص خود کو قوم سے الگ کر کے تجزیہ کرتا ہے 82.3%، ہر شخص آمریت کو گالی سمجھتا ہے لیکن اسکے اسباب رفع کرنے کی

کوشش نہیں کرتا99.5%، کوئی بھی تاریخ سے سبق نہیں سیکھتا87.3%، ہماری تجارت جھوٹ اور دھوکہ دہی پر مبنی ہے76.8%، ساری قوم ملاوٹ کرتی ہے اور اسے کوستی بھی ہے76.3%،تجارت میں فراڈ کے ساتھ اللہ کا شکر بھی ادا کیا جاتا ہے68.3%،سود کو حرام سمجھا جاتا ہے لیکن اسے کھایا بھی جاتا ہے 73.9%، شادیوں میں اسراف کیا جاتا ہے88.3%،ہم اپنی خوشی کے موقع پر دوسروں کو غم دیتے ہیں45.9% خواتین کو وراثت میں حق نہیں دیا جاتا78.9%، ہمارا قانون صرف کمزوروں کے لیے ہے73.8%، پولیس کی رشوت ستانی مشہور ہے82.1%،امن وامان کی صورتحال ناگفتہ بہ ہے72.5%، فرائض کے بجائے نوافل اور مستجبات پر زور دیتے ہیں91.8%،مسلمانوں پر کفر وشرک کے فتوے لگانے میں ماہر ہیں 95.3%،مذہبی انتہاپسندی کی بدترین مثال ہیں66.4%،موہوم مذہبی تصورات کے رسیا ہیں90.1%،علما کا زورِعمل کے بجائے داڑھی پر ہوتا ہے82.5%،ہم بنی اسرائیل سے بھی بدترین قوم ہیں99.9%۔

ہماری ان ''خوبیوں'' کی شرح فیصد میں تو کمی بیشی کی گنجائش ہوسکتی ہے لیکن اس حقیقت سے کون اختلاف کرسکتا ہے کہ یہ تمام کے تمام ''اوصاف'' ہم میں یقینی طور پر موجود ہیں؟ ہم جتنی جلدی یہ تسلیم کرلیں کہ غلط راستے پر چل رہے ہیں ہمارے حق میں اتنا ہی بہتر ہوگا کیونکہ اس کے بغیر ہم درست راستے پر نہیں چل سکتے اور جب تک درست راستے پر نہیں چلتے تو خود ہی سوچیے کہ کیا ہماری بربادی کے لیے ہم خود ہی کافی نہیں؟ ہمارے خلاف دوسرے کسی کو سازش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

روزنامہ جناح،31/12/2009

8اکتوبر کی سلگتی یادیں

زمین کے اندر کی ہلچل نے زمین کے باہر وہ کہرام برپا کر رکھا تھا کہ اپنی چیخ و پکار بھی سنائی نہیں دیتی تھی، زلزلے کے جھٹکے اتنے شدید تھے کہ کئی جگہ چھتیں اور دیواریں اپنی بنیادوں سے کئی کئی سوفٹ دور جا گریں۔ بڑے بڑے پہاڑ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر چند لمحوں میں کچھ اس طرح ریزہ ریزہ ہو گئے کہ ان میں غرق ہونے والی بستیوں کا نشان تک باقی نہیں رہا۔ لودھی آباد(ضلع مظفرآباد) کی ساڑھے تین کلو میٹر لمبی، آدھا کلو میٹر چوڑی اور350فٹ گہری''زلزال''جھیل کے اُجلے نیلے پانی کو دیکھ کر کیا کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ یہاں زلزلے سے پہلے 275 گھروں پر مشتمل ایک گاؤں آباد تھا؟6لاکھ گھر تباہ اور35لاکھ لوگ بے گھر ہوئے۔ 6,298 سکول اور 796 صحت کے مراکز ملبے کا ڈھیر بن گئے۔30,000مربع کلومیٹر سڑکیں برباد ہو گئیں۔مواصلات، بجلی، پانی اور سیوریج کا70فیصد نظام نا قابلِ استعمال ہو گیا۔73,338لوگ جاں بحق ہو گئے جن میں 35,000 بچے شامل ہیں۔1,28,304لوگ زخمی ہوئے جن میں کئی معذور اور کئی مفلوج ہو گئے۔کئی ایسے بھی تھے جنکے جسمانی اعضا کاٹ کر انہیں بڑے بڑے پتھروں اور ستونوں کے نیچے سے نکالا گیا۔ایک چھ سالہ بچی کی ٹانگ کاٹنی پڑی جس کے بہن بھائی اور ماں فوت ہو گئے تھے جبکہ والد ریڑھ کی ہڈی تڑوا بیٹھا تھا۔کئی والدین سکولوں کے ملبے سے اپنے بچوں کے سارے جسمانی اعضا بھی اکھٹے نہیں کر سکے اور کئی بچے آج بھی اپنے والدین کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ایک گیارہ مہینے کے بچے کو اسکی ماں نے اتنی شدت کے ساتھ سینے سے لگایا کہ موت کے بعد بھی الگ نہیں ہو سکا، دونوں ایک ہی قبر میں دفن ہیں۔کئی ایسے تھے جو دو دو روز تک اپنے گھروں کے ملبے سے دور اس لئے نہیں گئے کہ کہیں کوئی جانور ملبے سے باہر نکلے انکے پیاروں کے جسمانی اعضا نہ کھالے۔کئی ایسے تھے جو رات بھر کھلے آسمان تلے طوفانی بارش میں کھڑے ملبے کے نیچے سے آنے والی اپنے پیاروں کی آوازیں سنتے رہے لیکن انکے لئے کچھ کر نہیں سکے۔ایک بھائی گرلز ہاسٹل کے ملبے میں دبی اپنی

بہن سے تقریباً 24 گھنٹے بات چیت کے ذریعے اس کا حوصلہ بڑھاتا رہا، اسے چھت کے ایک سوراخ سے پانی بھی پلاتا رہا لیکن باہر نہیں نکال سکا اور اس کی بہن اسے پکارتی پکارتی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ جو لوگ جسمانی طور پر زخمی نہیں ہوئے نفسیاتی طور پر ہوگئے، میرا اپنا حال یہ ہے کہ زلزلے کے دو برس بعد بھی کئی بار بستر پر لیٹتا ہوں تو زلزلے کے بغیر بھی زمین ہلتی محسوس ہوتی ہے۔

زلزلہ زدگان کے حالات وطن عزیز کے طول وعرض میں پھیلے تو ہر دل بھر آیا اور ہر آنکھ نم ہوگئی۔ بالاکوٹ، مظفر آباد، باغ اور راولاکوٹ آنے والی تمام سڑکیں امدادی سامان کے ٹرکوں سے اس طرح بھر گئیں کہ تل دھرنے کی جگہ نہ رہی لیکن اس سامان کو لوٹنے والے ہم وطن بھی کم نہیں تھے جن میں حکومتِ آزاد کشمیر کے وزراء کرام بھی شامل تھے۔ مظفر آباد اپر چھتر ہاوسنگ سکیم میں واقع ایک منسٹر صاحب کے گھر سے تو امدادی سامان کے وہ ٹرک برآمد بھی کئے گئے جنہیں باقاعدہ طور پر اغوا کر کے وہاں پہنچایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ موصوف کے گھر سے 70 خیمے عین اس روز ملے جب اقوامِ متحدہ نے عالمی برادری سے یہ اپیل کی تھی کہ آئندہ چند دنوں میں خیموں کی کمی کو پورا نہ کیا گیا تو موسم کی تلخی 10 ہزار بچوں کو موت کے گھاٹ اُتار سکتی ہے۔

زلزلے سے جاں بحق ہونے والے بچوں میں 18000 کے لگ بھگ طلبا اور طالبات بھی شامل تھے جو زلزلے سے زیادہ تعلیمی اداروں کی ''سرکاری'' تعمیرات کے باعث ہلاک ہوئے، اس سے یہ امید پیدا ہوئی کہ لوگ کرپٹ سرکاری افسروں اور ٹھیکیداروں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے لیکن بعض ''صاحب علم'' حضرات نے زلزلے کو عذاب الٰہی سے تعبیر کر کے اس امید پر بھی پانی پھیر دیا۔ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ زلزلہ اگر گناہوں کی پاداش میں آتا ہے تو چاند اور مریخ پر کون گناہ کرتا ہے کہ زلزلے تو وہاں بھی آتے ہیں؟ زمین پر تو زلزلے اس وقت بھی آتے تھے جب یہاں کوئی انسان آباد ہی نہیں تھا؟ اور یہ زلزلے نہیں آتے تو کیا

زمین رہنے کے قابل بن سکتی ؟

زلزلے سے اس قدر تباہی و بربادی ہوئی کہ وزیر اعظم آزاد کشمیر نے آزاد کشمیر کو قبرستان اور خود کو قبرستان کا وزیرِ اعظم کہا لیکن یہ نہیں سوچا کہ قبروں اور لاشوں پر حکومت کے لیے اس لمبی چوڑی کابینہ کی کیا ضرورت ہے جو زلزلے سے پہلے بھی ضرورت سے اتنی زیادہ تھی کہ بعض وزارتوں کو دو دو وزیروں میں بانٹنا پڑا؟ بہر طور وزیرِ اعظم کی خدمات کو اس حد تک سراہا جا سکتا ہے کہ زلزے کے دوران انہیں کچھ روز ایک خیمے میں گزارنے پڑے جہاں (انہی کے بقول) انہیں مچھروں نے بھی کاٹا، انہوں نے ایک ٹیلی ویژن پروگرام میں مچھر کا نشانہ بننے والا اپنا ہاتھ بھی دکھایا تو سب کو پتہ چل گیا کہ زلزلے سے کشمیری عوام ہی نہیں بلکہ انکا وزیر اعظم بھی متاثر ہوا ہے اور ساری دنیا زلزلہ زدگان کی بحالی کے لیے سرگرمِ عمل ہوگئی۔

جن لوگوں کے گھر مکمل طور پر تباہ ہوئے انہیں ڈیڑھ لاکھ روپۓ کا حق دار قرار دے کر جس قسم کا گھر بنانے کے لئے کہا گیا وہ اس رقم سے بن ہی نہیں سکتا۔ جن کے گھر جزوی طور پر تباہ ہوئے انکے لئے 50 ہزار روپۓ کا اعلان کیا گیا لیکن انہیں بھی یہ نہیں بتایا گیا کہ اس رقم سے کیا وہ جزوی طور پر تباہ ہونے والے گھروں کو مرمت کروا کے آئندہ زلزلے میں مکمل طور پر تباہ ہونے کے لئے تیار کریں؟ جن کے گھر زلزلے سے محفوظ رہے انکے لئے کوئی معاوضہ منظور نہیں کیا گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ خفیہ رکھی جانے والی سسمک رپورٹ کے حوالے سے یہ بھی بتایا گیا کہ مظفر آباد دو فالٹ لائنوں پر واقع ہے، ایک سے حالیہ زلزلے کی صورت میں توانائی کا اخراج ہو چکا ہے جبکہ دوسری سے آئندہ زلزلے کی صورت میں ہوگا۔ یعنی اس بار محفوظ رہنے والے علاقے آئندہ کے لئے انتہائی غیر محفوظ ہو گئے ہیں، اس اعتبار سے تو مظفر آباد میں جنکے گھر محفوظ رہے انہیں زلزلہ پروف گھروں کی ضرورت کیا دوسروں سے بھی زیادہ نہیں؟ اُن سفید پوش لوگوں کے بارے میں بھی کسی نے کچھ نہیں سوچا جنکی عمر بھر کی کمائی کرائے کے گھروں میں دب گئی۔ معاوضے کے حصول کا طریقہ ایسا رکھا گیا کہ اس کے پیچھے کئی لوگ دو دو سال تک

اپنے خرچ پر دھکے کھاتے رہے۔ کچھ کے بقول تو اس رقم سے بمشکل وہی اخراجات پورے ہوئے جو اسکے حصول میں اٹھے، کچھ کہتے ہیں کہ اس سے تو بہتر تھا کہ دیہاڑ داری پر مزدوری کر لیتے کہ زلزلہ زدہ علاقوں میں مزدور کی سالانہ آمدن ڈیڑھ لاکھ روپے سے کم تو نہیں تھی اور کچھ کہتے ہیں کہ کاش ہم کاغذات مکمل کروانے کے بجائے سروے پر مامور پٹورای صاحب یا حوالدار صاحب کی جیب گرم کر دیتے؟

حکومتی رٹ کا عالم یہ تھا کہ زلزلہ زدہ اضلاع میں پبلک ٹرانسپورٹ کے کرائے پانچ سے دس گنا بڑھ گئے، اور تو اور کفن کی قیمت میں بھی کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ امدادی سامان کی تقسیم کے لئے عمومی طور پر وہی طریقہ اپنایا گیا جس میں بڑے بڑے لوگ دوسروں کا مال اپنی طرف سے تقسیم کرتے ہوئے تصویریں بھی بنواتے ہیں اور ویڈیو فلمیں بھی۔ گھر بار تو پہلے ہی لٹ چکا تھا، امدادی سامان کے لئے بھکاریوں کی طرح قطاروں میں کھڑے رہ رہ کر زلزلہ زدگان کی ایک بڑی تعداد عزتِ نفس سے بھی محروم ہو گئی۔ زلزلہ زدہ علاقوں کے ایک ایک شخص کے دل و دماغ پر کئی کئی المناک کہانیاں نقش ہو کر رہ گئی ہیں اور یہ سلگتی یادیں اسے زندگی بھر سُکھ کا سانس نہیں لینے دیں گی۔

زلزلے نے ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا لیکن افسوس کہ ہم نے اس سے کچھ نہیں سیکھا، زلزلے کے حوالے سے قائم کیے گئے اداروں کی حقیقت زلزلہ زدعلاقوں کے رہنے والوں پر تو کھل ہی چکی ہے، باقی لوگوں پر اس وقت کھل جائے گی جب خدانخواستہ ایک زلزلہ اور آ جائے گا۔ ان اداروں کی مایوس کن کارکردگی کوئی بھی متاثرہ علاقوں میں جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ دو برس بیت گئے لیکن شہروں کی تعمیرِ نو کا کام شروع ہی نہیں ہو سکا۔ 8 اکتوبر کے سانحے نے ہمیں ایسے زخم دیے ہیں جو شاید کبھی نہ بھر سکیں۔

روزنامہ خبریں، 8/10/2007

ایک دن میں دو یومِ سیاہ

اس مرتبہ 5 جولائی کو بیک وقت دو یومِ سیاہ منائے، ایک اس لیے کہ اس روز ضیاالحق نے آئین سے غداری کر کے ملک کی آبرو لوٹی اور قوم کو ایسا زخم دیا جو قیامت تک نہیں بھر سکتا، اور دوسرا اس لیے کہ اسی روز یہ خبر مجھ تک پہنچی کہ پولیس کے دو سپاہیوں نے تین سال کی ایک بچی کو اپنی جنسی ہوس کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا۔

پہلے یومِ سیاہ کے حوالے سے بہت کچھ لکھنے کا جی چاہتا ہے لیکن دوسرے کے بارے میں سوچتا ہوں تو خدا کی قسم یوں لگتا ہے کہ جیسے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی یا دل کی دھڑکن ڈوب جائے گی۔ اس کیفیت میں دو روز سے مبتلا ہوں، کچھ لکھے بغیر بھی نہیں رہ سکتا اور کچھ لکھا بھی نہیں جاتا۔ اس دوران اپنی ساڑھے تین سالہ بیٹی کو بے شمار مرتبہ سینے سے لگایا، تو دل خون کے آنسو روتا ہوا محسوس ہوا، ایک بار تو آنکھیں بھی بے اختیار بھیگ گئیں جنہیں دیکھ کر اس نے اپنے توتلے تکلم میں مجھ سے پوچھا کہ ابا آپ اس لیے رو رہے ہیں کہ میں نے کھانا نہیں کھایا، آپ پلیز چپ ہو جائیں میں ابھی کھا لوں گی؟ اور میرا دل چاہا کہ میں دہاڑیں مار مار کر زمین آسمان ایک کر دوں۔ جو تین سالہ بچی دو انسان نما شیطانوں کی درندگی کا شکار بنی وہ تو میری بیٹی سے بھی کم عمر اور معصوم ہوئی ہوگی، اس کے ماں باپ اسے یاد کرتے ہونگے تو ان پر کیا گزرتی ہوگی؟

میں تمام حکمرانوں اور تمام عوام سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا انکی کوئی بیٹی بہن بھانجی بھتیجی نواسی یا پوتی تین سال کی نہیں یا کبھی تین سال کی نہیں تھی؟ اگر اس کے ساتھ بھی ایسی درندگی کی جاتی جس کی مثال درندوں کے یہاں بھی نہیں ملتی تو وہ کیا کرتے؟ سندھ کی وزیرِ اطلاعات نے کہا کہ ہر دو ملزمان کو قرار واقعی سزا دلوائی جائے گی، اس قسم کے بیانات سننے کو تو ملتے ہی رہتے ہیں لیکن ان پر عملدرآمد کبھی دیکھنے کو نہیں ملا ورنہ ایسے واقعات بار بار کیوں رونما ہوتے؟ اگر حکومت اس معاملے میں سنجیدہ ہے تو پھر یہ کیس کیا سپیڈی ٹرائل کے ذریعے حل ہو کر

سرِ عام پھانسی پرانجام پزیر نہیں ہونا چاہیے، پھانسی بھی ایک بار کی نہیں بلکہ بار بار کی؟

یہ بیان بھی سمجھ سے بالاتر ہے جو صدر مملکت نے جنرل ضیاالحق کے حوالے سے جاری کیا کہ آمروں کو ان کے کیے کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔اس سزا کا اہتمام کیا کسی دوسرے نے کرنا ہے؟ کیا ہمارے ملک پر آپ کی اپنی حکومت نہیں؟ پیپلز پارٹی ضیا مارشل لا کے بعد تین مرتبہ اقتدار میں آ چکی ہے لیکن ملک وقوم پر ہونے والے ظلم کا حساب لینا تو دور کی بات، کیا ذوالفقار علی بھٹو کو بھی انصاف دلا سکی؟ آخر وہ کونسا راز ہے جس کے باعث آپ سیاہ وسفید کے مالک ہو کر بھی ملک وقوم اور اپنے بانی قائد کے قاتل کی ہڈیوں کو قبر سے نکلوا کر علامتی سزا نہیں دلوا سکتے؟ بس کیس ری اوپن کرنے کے زبانی مطالبے ہی کرتے رہتے ہیں، وہ بھی صرف ضیاالحق کی حد تک؟ کیا ایوب خان نے مارشل لا نہیں لگایا تھا؟ بلکہ وہ تو کیا ملک وقوم وآئین کا سب سے بڑا مجرم نہیں کہ اس نے جمہوریت پر شب خون مارنے کی رِیت ڈالی اور اسطرح ہر آنے والے آمر کے جرم میں شریک ہوگیا؟ اس کا کیس ری اوپن کرنے کا مطالبہ کیوں منظرِ عام پر نہیں آرہا؟ کیا اس لیے کہ اس کا ساتھ بھٹو صاحب نے بھی دیا تھا؟ اور جنرل پرویز مشرف کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جس نے ملک وقوم کو برباد کرنے میں رہی سہی کسر بھی پوری کر دی لیکن آپ اسے آج تک پروٹوکول دے رہے ہیں؟

کیا ہماری کوئی ایک سیاسی جماعت یا سیاست دان بھی ایسا ہے جو کسی مارشل لا سے فیض یاب نہ ہوا ہو؟ کسی کے استحکام میں ایوب خان کی نوازشوں کا دخل ہے تو کسی نے یحییٰ خان کی آشیر باد سے زور پکڑا، کسی نے ضیاالحق کی انگلی تھام کر شہرِ سیاست میں چلنا سیکھا تو کسی نے پرویز مشرف کے سائے میں جمہوریت کی منزلیں طے کیں، کوئی ایک آمر سے ہاتھ ملا کر اقتدار میں آیا تو کوئی دوسرے کے ساتھ ڈیل کر کے۔ ہر ''جمہوری جماعت'' کا المیہ اس کی یہ خواہش ہے کہ ڈکٹیٹروں کے ساتھ اس کے کُھلے تعلقات پر بھی پردہ پڑا رہے لیکن دوسروں کے پوشیدہ مراسم بھی منظرِ عام پر آ جائیں۔اگر ہم نے آج بھی مصلحتوں کو خیر آباد نہ کہا تو کب کہیں گے

جبکہ ملک بدترین حالات سے دوچار ہے؟ اگر ہم آج بھی اپنی اپنی ڈیڑھ ڈیڑھ انچ کی مسجد سے باہر نہ نکلے تو کب نکلیں گے؟

اپنی اپنی ڈیڑھ ڈیڑھ انچ کی مسجد سے یاد آیا کہ ہماری مذہبی جماعتیں اور انکے رہنماؤں کے ذاتی مفادات کا تحفظ کرنے والے اسلامی مدرسوں کی بھاری اکثریت بھی تو مارشل لاء ہی کی پیداوار ہے؟ ان ''نیک اور پرہیزگار'' لوگوں سے چلیے ایسی کوئی بات نہیں پوچھتے کہ آپ ایک طرف تو اس خدا سے محبت کا دعوی کرتے ہیں جس کی نگاہ میں آمریت گناہِ عظیم ہے، اس رسولؐ کو رول ماڈل مانتے ہیں جس کی ذاتی جائیداد اس کے اعلی کردار کے سوا کچھ نہیں تھی اور دوسری طرف آمروں کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں، بڑی بڑی گاڑیوں پر گن مینوں کے جھرمٹ میں پھرتے ہیں، بڑے بڑے محلوں کے مالک ہیں، عیش و آرام کے رسیا ہیں، شان وشوکت کے دلدادہ ہیں؟ لیکن یہ تو پوچھنا چاہیے کہ آپ ''دین دار'' حضرات کیا ایک چھوٹی سی بچی پر ڈھائے جانے والے انسانیت سوز مظالم کے خلاف بھی آواز نہیں اُٹھا سکتے؟ امتِ مسلمہ کے غم سے سرشار صوم وصلوۃ کے پابند یہ ''جنتی لوگ''، فلسطین، کشمیر اور عراق کے لیے تو ہڑتالیں کرتے رہتے ہیں لیکن کیا اس بچی کے حق میں کوئی مظاہرہ نہیں کر سکتے؟

اگر اس اعلان کے ساتھ ہڑتال کر دی جائے کہ یہ اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک گنہگاروں کو واقعی میں قرار واقعی سزا نہیں دے دی جاتی تو کس کی مجال ہے کہ وہ انصاف کی راہ میں رکاوٹ بنے؟ لیکن اگر کوئی اس تین سالہ معصوم کے حق میں فیصلہ کُن آواز اٹھانے کے لیے تیار نہیں تو سب سے میری اپیل یہ ہے کہ جس طرح ضیاالحق نے خدا اور رسولؐ کے نام پر اٹھائے ہوئے اپنے حلف کی آبروریزی کی تو اسے ''مردِ مومن مردِ حق اور امیرالمومنین'' کا خطاب دیا گیا، ویسے ہی پولیس کے ان دو شیطانوں کو بھی کسی لقب سے نواز دیا جائے؟

روزنامہ جناح، 9/7/2009

جہاں سے فاختہ کے پر لہو کا دُکھ پہن آئے

کشمیر کی وادیاں مجھے ماں کی طرح عزیز ہیں، ان میں کھلنے والے پھولوں کی خوشبو میری روح سے براہِ راست سرگوشیاں کرتی ہے اور ان پر چمکنے والے ستاروں کی جھلمل سے میرے ذہن کے تاریک گوشے ایک دم جگمگا اٹھتے ہیں۔ مجھے شاعری انہی وادیوں اور ان میں سانس لینے والے پہاڑوں سے ملی کہ

میں نے لکھی ہے آتی جاتی رُت کی رچنا دھرتی پر
برف مری تحریر ہوئی اور ابر مرے مکتوب ہوئے
جھیلیں میرا لہجہ ہوئیں دیوَدار مری آواز بنے
اور مرے کشمیر کے روپ سروپ مرا اسلوب ہوئے

مظفر آباد میں قیام کے دوران نیلم اور جہلم کے دریا میرے قریبی دوستوں میں شامل رہے، چودھویں کا چاند مجھے ہمیشہ ان دریاؤں کے سنگم کی طرف کھینچ لاتا تھا جسے دومیل کہتے ہیں اور جہاں میں نے اس طرح کے اشعار کہے کہ

یہ نیلم جہلم کی لہریں
یہ سونے چاندی کی نہریں
دردیلی سُر میں روتی ہیں
اب برف میں بھی کب سوتی ہیں

وادیٔ جہلم بھی بڑی خوبصورت ہے لیکن وادیٔ نیلم کی بات ہی کچھ اور ہے، بالخصوص کریم آباد، ہلمت، نکرو اور تاؤبٹ کے علاقے اپنی مثال آپ ہیں جہاں دریائے نیلم سات ہزار چار سو فٹ کی بلندی پر بہتا ہے، اسکا برفیلا پانی اتنا شفّاف ہے کہ اسکی تہہ میں پڑے چھوٹے چھوٹے پتھر بھی صاف صاف دکھائی دیتے ہیں اور اسکے کنارے پر دیودار کے عظیم الشان درختوں کا گھنا جنگل واقع ہے۔ یہ علاقہ میں نے تقریباً 15 برس پہلے دیکھا جب یہاں لے

جانے والی سڑک کا ایک 36 کلومیٹر کے لگ بھگ لمبا ٹکڑا (کیرن بائی پاس) انڈین فائرنگ کی ایسی شدید زد میں ہوتا تھا کہ صرف رات کو سفر کیا جا سکتا تھا، وہ بھی کچھ اسطرح کہ 28 مختلف مقامات پر گاڑی کی بتیاں بھی بجھانی پڑتی تھیں، کنڈکٹر ایک سلگتا ہوا سگریٹ (اپنی پشت کی جانب) ہاتھ میں تھام کر گاڑی کے آگے آگے بھاگتا تھا اور اسکے پیچھے پیچھے گاڑی چلتی تھی۔ وادیءِ نیلم کے کئی بلند و بالا پہاڑ ایسے ہیں جن پر کھڑے ہو کر مقبوضہ کشمیر کی دھندلائی ہوئی جنت نظیر وادیاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں اور انہیں دیکھ کر میری روح بے چین ہو جاتی ہے کہ

اچھے تھے کیا چنار کی وادی کے خدوخال
افسوس اب وہاں ہیں اداسی کے خدوخال
شب بھر انگیٹھیوں میں چٹختا ہے کس کا دل
کیا بولتے ہیں سوختہ لکڑی کے خدوخال
نیلم چٹانیں کاٹتا پھرتا ہے گھاٹ گھاٹ
شاید تراشے شاردا دیوی کے خدو خال

'بانسریوں میں لہو کے سر' کے عنوان سے عظیم سکالر سید نصیر شاہ نے میرے شعری مجموعے 'سرد دھوپ' میں لکھا کہ ''کشمیریوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو قومِ ثمود یاد آ جاتی ہے جس پر عجیب قسم کا عذاب نازل ہوا تھا، انکی زمینیں قسم قسم کے خوش رنگ پھولوں اور پھلوں والے درخت اگا تیں، درختوں میں پھل آتے، چاندنی ان پھلوں میں رس بھرتی لیکن جب ان محروم القسمت لوگوں کے بدنصیب ہاتھ ان پھلوں کی طرف بڑھتے تو پھل ریزہ ریزہ ہو کر زمین پر گر پڑتے ، بڑھے ہوئے ہاتھ سینہ کوبی کرنے لگتے اور للچائی ہوئی نگاہیں مایوسیوں کی شرر باریاں بن کر کاشانہءِ چشم میں لوٹ آتیں، بالکل یہی کشمیر میں بھی ہو رہا ہے مگر یہ عذابِ خداوندی نہیں بلکہ جبر کے فرعونوں کا لایا ہوا عذاب ہے، یہاں پھل ریزہ ریزہ نہیں ہوتے جابر انہیں مزے سے اتار لیتے ہیں اور حرماں نصیبی اس 'قومِ نجیب و تر دماغ' کے حصہ میں آتی

ہے''۔

کشمیریوں کو رس بھرے پھل بھی میسر ہیں، خشک میوے بھی اور بلند و بالا درختوں کی گھنی چھاؤں بھی لیکن اس چھاؤں میں بیٹھ کر ان پھلوں اور میووں کی مٹھاس سے لطف اندوز ہونا ان کے نصیب میں نہیں اس لئے کہ سایہ دار درختوں کے تنے گولیوں سے چھلنی ہیں۔ انہیں گلگشت کے لئے زعفراں زار بھی میسر ہیں لیکن ان زعفراں زاروں سے بارود کی بُو آتی ہے۔ بہشت آباد چشمے بھی ان کی دسترس سے دور نہیں لیکن ان چشموں میں خون گھلا ہوا ہے۔ شاہ صاحب کے بقول ''کشمیر کا ہر پھول ایک شعر، ہر جھرنا ایک گیت اور ہوا کا ہر جھونکا ایک بحر الا پتا ہے اور یہ سب مل کر سنگیت کمپوز کرتے ہیں'' لیکن یہ سنگیت گولیوں اور بموں کی آواز میں دب جاتا ہے۔ میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ

بصارت بجھ گئی ہو تو ضیا کا کیا کرے کوئی
رکی ہو سانس تو بادِ صبا کا کیا کرے کوئی

بچھی بل کھاتی پگڈنڈی پہ بارودی سرنگیں ہیں
پہاڑوں پر کسی کے نقشِ پا کا کیا کرے کوئی

جہاں دَیَودار کی تقدیر چھلنی گولیوں سے ہو
مہکتی چھاؤں کی ایسی جگہ کا کیا کرے کوئی

جہاں سے فاختہ کے پر لہو کا دُکھ پہن آئے
کسی ایسے مقامِ پُرفضا کا کیا کرے کوئی

جہاں کے زعفراں زاروں سے بُو بارود کی آئے
بھلا اس وادیء جنت نما کا کیا کرے کوئی

جہاں سورج نکلنے سے بھی تاریکی نہیں جاتی
مداوا رات کی اس انتہا کا کیا کرے کوئی

خدا جانے ہم کب تک یومِ سیاہ مناتے رہیں گے، ہمیں خود ارادیت اور آزادی کا وہ حق کب ملے گا جو اقوامِ متحدہ نے ساری دنیا کے لیے منظور کر رکھا ہے، نیلم اور جہلم کی آہ و زاریاں کب ختم ہوں گی، خدا جانے ہمارے الغوزوں اور ہماری بانسریوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کب تک ہوتی رہے گی اور ان سے لہو کے سر کب تک پھوٹتے رہیں گے؟

روزنامہ جناح، فروری 2009

عمران خان سے ایک ملاقات

احمد بشیر نے کہا تھا کہ اگر عمران خان اپنے اندر کی داڑھی صاف کروالیں تو وہ ایک اچھے سیاست دان بن سکتے ہیں اور یہ بات عمران خان کو بتا کر میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ کے اندر کوئی قدامت پرست آباد ہے جو طالبان پر حکومتی حملوں کی پرزور مخالفت پر تو اکسا تا رہتا ہے لیکن طالبان کی جانب سے لڑکیوں کے سکولوں کو جلائے جانے یا اس قسم کے دیگر اقدامات کی کھل کر مذمت نہیں کرنے دیتا؟ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ سوات، باجوڑ اور وزیرستان میں فوجی کاروائی درست نہیں لیکن اس میں بھی کیا شک وشبے کی کوئی گنجائش ہے کہ طالبانائزیشن، جہالت اور تاریکی کا دوسرا نام ہے؟

عمران خان بولے کہ میں نے طالبانائزیشن کی سپورٹ کبھی نہیں کی اور مذمت سے بھی گریز نہیں کیا، میں تو فقط یہ پوچھتا رہتا ہوں کہ طالبان کو پیدا کس نے کیا؟ کوئی میرے اس سوال کا جواب بھی آج تک نہیں دے سکا کہ قبائلی علاقوں میں فوج کشی جن مقاصد کے تحت کی گئی اور کی جا رہی ہے کیا وہ حاصل ہوئے؟ جتنے خودکش حملہ آور وہاں پہلے تھے اس سے کہیں زیادہ پرویز مشرف نے پیدا کر دیے اور اب بھی اس حوالے سے کوئی نئی روش اختیار نہیں کی جا رہی۔ اگر ہم قبائلی ثقافت سے آگاہ ہوتے تو قبائلیوں کے ساتھ ایسا سلوک کبھی نہ کرتے جیسا کر رہے ہیں اور حالات بہتری کی طرف جانے کے بجائے مذید خراب نہ ہوتے لیکن افسوس کہ کسی نے قبائلیوں کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

میں نے پوچھا کہ آپ اسلام کے متعلق کس کے نکتہ نظر سے متفق ہیں؟ انہوں نے علامہ اقبال کا نام لیا اور میرا اگلا سوال یہ تھا کہ اگر ایسا ہے تو پھر آپ قاضی حسین احمد صاحب کے قریب کیوں ہیں؟ کیا قاضی صاحب کو یہ گوارا ہوسکتا ہے کہ اقبال کی Reconstruction Of Religious Thoughts In Islam جسکا ترجمہ ''فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو'' اور ''خطبات'' کے نام سے کیا گیا، ہمارے نصاب میں شامل کر لی جائے؟ ایک قاضی صاحب ہی

کیا اگر کسی بھی مذہبی جماعت کو اقبال کا اسلام منظور ہوتا تو وہ اس بات پر احتجاج کیوں نہ کرتی کہ اسلام پر''شاعرِ اسلام، شاعرِ مشرق اور مصورِ پاکستان'' کے لیکچرز پر مشتمل یہ واحد کتاب ہمارے نصاب میں کیوں پڑھائی نہیں جاتی؟

انہوں نے جواب دیا کہ پاکستان کی کوئی بھی سیاسی جماعت کافر نہیں اور کسی مذہبی جماعت کے ساتھ میرا تعلق مذہب کی بنیاد پر آج ہے نہ پہلے کبھی تھا کہ اس تعلق کی وجوہات ہمیشہ سیاسی اور اصولی رہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو میں سترویں ترمیم کے معاملے پر متحدہ مجلسِ عمل کی شدید مخالفت کیوں کرتا؟ انتہا پسندی چاہے مذہبی ہو، سیاسی ہو، علمی ہو یا کسی بھی دوسری قسم کی ہو، میں نے ہمیشہ دوٹوک الفاظ میں اسکی مخالفت کی۔

ہم عمران خان کے گھر میں بیٹھے تھے جو بنی گالا کی اس پہاڑی پر واقع ہے جہاں سے سارا اسلام آباد نظر آتا ہے، وہ وفاقی دارالحکومت جسکا ایوانِ اقتدار اتنا کمزور ہے کہ اس پر قبضے کے لئے ایک فوجی بریگیڈ بھی کافی ہوتی ہے اور جسکی شاہراہِ دستور پر کھڑے ہوکر جنرل پرویز مشرف نے 6 مئی 2007 کو کراچی کے نہتے شہریوں کے ساتھ سرِ عام کھیلی جانے والی خون کی اس ہولی کو اپنی طاقت کا مظاہرہ قرار دیا تھا جسکی مثال نہیں ملتی لیکن اس اقبالِ جرم کے باوجود انہیں گارڈ آف آنر کے ساتھ رخصت کیا گیا اور انکے حلیف جنہوں نے طاقت کے اس سفاک و وحشیانہ مظاہرے کو ممکن بنایا، آج بھی حکومت کر رہے ہیں۔

میں نے عمران خان سے پوچھا کہ اگر آپ کو اقتدار مل جائے تو کیا آپ ہماری سیاست سے امریکہ کا عمل دخل ختم کر سکتے ہیں جس کے ادھار سے ہم اپنا کاروبارِ زندگی چلاتے ہیں؟

وہ بولے کہ بالکل کر سکتا ہوں، اگر سنگاپور جیسا ملک جس کے پاس پینے کا پانی تک نہیں، اپنے پیروں پر کھڑا ہوسکتا ہے تو پاکستان کیوں کھڑا نہیں ہوسکتا؟

میں نے کہا کہ ہماری قوم جو شارٹ کٹ، جلد بازی اور کرپشن جیسے جان لیوا نشوں کی

عادی ہے، کیا سنگاپور کے لوگوں کی طرح خودداری وخودمختاری کے کٹھن راستے پر چل سکتی ہے؟

انہوں نے کہا کہ کیوں نہیں چل سکتی؟ آپ کبھی لاہور شوکت خانم ہسپتال میں آ کر دیکھیے کہ ہمارے اپنے ہی لوگ اس ادارے کو کس خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں، کیونکہ وہاں کسی فرد کی نہیں بلکہ قانون کی حکمرانی ہے جو ہر کسی کے لیے ایک جیسا ہے چاہے کوئی بڑا ہو یا چھوٹا۔ میں نے یہ ہسپتال بنایا اور میں اس کا سربراہ بھی ہوں لیکن میرے والد صاحب بیمار ہو کر یہاں آئے تو ان کے ساتھ بھی بالکل ویسا ہی سلوک کیا گیا جیسا عام مریضوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، یہی نہیں بلکہ ان کے علاج کے پیسے بھی میں نے اپنی جیب سے ادا کیے کیونکہ مفت علاج کی سہولت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جن میں علاج کے اخراجات جھیلنے کی سکت نہیں۔ اگر پاکستان کے حکمران رول ماڈل بن جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ قوم انکے نقشِ قدم پر نہ چلے۔

عمران خان کے خیال میں پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہاں قانون کی بالادستی نہیں، عدالتوں سے عوام کا اعتماد اٹھ گیا ہے اور انصاف کو ترستے لوگ، دل برداشتہ ہو کر قانون کو ہاتھ میں لینے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ قانون وہی ہوتا ہے جو سب کے لیے ایک جیسا ہو اور اگر ایک جیسا نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ بغاوت ہے۔ انہوں نے پاکستانی کرکٹ ٹیم کی مثال دی کہ وسیم اکرم ایک شاندار کرکٹر تھے لیکن اپنی کپتانی کے دور میں سینئر کھلاڑیوں کو کچھ نہیں کہتے تھے اور ان کا سارا قانون جونیرز کے لیے ہوا کرتا تھا چنانچہ ان کے خلاف بغاوت ہو گئی جس کی پیش گوئی میں نے پہلے ہی کر دی تھی لیکن میری کپتانی میں ایسا نہیں ہوا کیونکہ میں نے کسی کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا، یہی نہیں بلکہ جو کچھ ٹیم کو کرنے کے لیے کہا وہ پہلے خود کر کے دکھایا۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک کے ساتھ کچھ ایسا ماجرہ ہے کہ طاقتور لوگ چاہے کتنا ہی بڑا جرم کیوں نہ کر لیں، قانون کی گرفت میں نہیں آتے بلکہ انہیں اعزاز و اکرام سے نوازا جاتا ہے جبکہ کمزوروں کو چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں کے لیے بھی سخت سے سخت سزا دی جاتی ہے، بغاوت نہ ہو تو کیا ہو؟ کیا کوئی ایسا معاشرہ امن ومحبت کا گہوارہ بن سکتا ہے جہاں اور تو اور چیف جسٹس کو بھی انصاف سے محروم کر دیا جائے؟

عمران خان کے نزدیک ہمارا دوسرا بڑا مسئلہ میرٹ کی پامالی ہے جسکی وجہ سے اہل، سچے اور ایماندار لوگ ملک چھوڑ کر جا رہے ہیں جبکہ نا اہل، جھوٹے اور بد دیانت ہر شعبے میں آگے آ رہے ہیں۔ان حالات میں پاکستان کیسے ترقی کر سکتا ہے؟ یہ بات باعثِ حیرت ہے کہ وہ لوگ جو اپنے ذاتی ملازموں کی بھرتی میں تو اہلیت و اچھائی کا خصوصی خیال رکھتے ہیں، قومی ملازموں کی بھرتی میں اقربا پروری، سفارش اور رشوت کو میرٹ مانتے ہیں؟

عمران خان کہتے ہیں کہ اگر میں اقتدار میں آیا تو پہلی ترجیح کے طور پر پاکستان میں آئین، قانون اور میرٹ کی حکمرانی قائم کرنے کی کوشش کروں گا اور اس کا اطلاق سب سے پہلے خود پر کروں گا چاہے اسکے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے لیکن میں حقیقی جمہوری عمل سے گزر کر اقتدار میں آنا چاہتا ہوں تا کہ انصاف کے راستے پر چلنے کے لیے مجھے عوام کی تائید و نصرت حاصل ہو ورنہ جنرل پرویز مشرف کی آفر قبول کر کے کب کا وزیرِ اعظم بن چکا ہوتا؟

عمران خان سے میری ملاقات میں جو باتیں سامنے آئیں وہ انکے بارے میں پائے جانے والے عمومی تصور سے مطابقت نہیں رکھتیں اور یہ انکی سیاست کے لیے کوئی اچھی بات نہیں۔امید ہے، وہ یہ احساس کرتے ہوئے کہ Perception ،حقیقت سے مضبوط ہوا کرتی ہے، اپنے بارے میں پائے جانے والے تصور کو درست کرنے کی کوشش کریں گے۔

روزنامہ جناح، 12/1/2009

جسٹس افتخار چوہدری اور سر ایڈورڈ کک

یہ ان دنوں کی بات ہے جب برطانیہ پر مطلق العانیت کا راج تھا۔ آئین وقوانین کی تشریح وتوضیح عدالتیں نہیں کرتی تھیں بلکہ مطلق العنان بادشاہ کرتے تھے اور کچھ اسطرح کرتے تھے کہ اس کا فائدہ بادشاہ کو ہوتا تھا یا اسکے حواریوں کو جن میں اہلِ کلیسا یعنی مذہبی پیشواؤں کے علاوہ بڑے بڑے جاگردار اور سرمایہ دار شامل تھے۔ اپنے اور اپنے درباریوں کے عیش وآرام پر خرچ ہونے والی رقم بادشاہ عوام پر نت نئے ٹیکس لگا کر پوری کیا کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ غیر آئینی وغیر اخلاقی ٹیکس کے خلاف آواز اٹھانے کو جرم قرار دے کر مجرم کے لیے کوئی سزا مقرر کرنے کا اختیار بھی انہوں نے زبردستی حاصل کر رکھا تھا۔ وہ کسی چیز کو جرم ٹھہرا کر اسکے لیے عدالت سے کوئی بھی سزا سنوا دیا کرتے تھے۔ نام نہاد عدالتوں کے نام نہاد جج کسی کیس کی سماعت سے پہلے اس کے بارے میں حکمرانوں کی رائے جان لینے کے پابند تھے تاکہ فیصلہ کرتے وقت اس کا خیال رکھ سکیں۔ کسی جج میں یہ جرات نہیں تھی کہ وہ بادشاہ کے آگے سر اٹھانے کا خیال بھی ذہن میں لا سکے۔ یہ وہ حالات تھے جب چیف جسٹس سر ایڈورڈ کک نے عدلیہ کی آزادی کا نعرہ بلند کیا اور بادشاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہنے کی ہمت کی کہ قانون کی تشریح وتوضیح کرنے کا حق صرف عدالتوں کو حاصل ہے جو اسطرح کی جانی چاہیے کہ اس کا فائدہ غریبوں اور محکموں کو بھی ہو۔

سر ایڈورڈ کک یکم جنوری 1552ء کو برطانیہ کے شہر نارفوک میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد لندن کے ایک مشہور ومعروف بیرسٹر تھے۔ غالبًا انہی سے متاثر ہو کر ایڈورڈ کک نے قانون کی تعلیم کو دیگر علوم پر ترجیح دی۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم ٹرینیٹی کالج، کیمرج سے حاصل کی۔ 1589ء میں وہ پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ 1592ء میں انہیں ملکہ الزبتھ کی جانب سے سولیسٹر جنرل اور 1593ء میں برطانیہ کا اٹارنی جنرل تعینات کیا گیا۔ اس دوران ان کی کارکردگی حکمرانوں کے خواہشات کے عین مطابق رہی، بالخصوص پارلیمنٹ کو بارود سے اڑانے

کی سازش کرنے والے ملزموں کے خلاف ان کے دلائل کو اہلِ اقتدار نے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ 1606ء میں شاہ جیمز اول نے انہیں ''کورٹ آف کومن پلیز'' (Court of common pleas) کا چیف جسٹس مقرر کر دیا۔ چیف جسٹس بننے کے بعد بادشاہ کے ساتھ ان کا اختلاف شروع ہوا جو جلد ہی خاصی سنجیدگی اختیار کر گیا۔ اس اختلاف کی وجہ بادشاہ کی مرضی کے خلاف ان کی جانب سے عوام کے مفاد میں کیے گئے فیصلے اور ان حقیقت کا برملا اظہار تھا کہ بادشاہ کو من مانی کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔

1628ء میں ان کے کلیدی کردار سے تیار کی گئی ''پٹیشن آف رائٹ'' (جو بعدازاں ایک تاریخ ساز قانونی دستاویز قرار پائی اور جس کے مطابق برطانیہ اور امریکہ کے 'حقوق کے بل' تشکیل دیے گئے) کے تحت بادشاہ کو اپنی مرضی کے مطابق ٹیکس عائد کرنے کی آزادی حاصل نہیں تھی۔ اس سے پہلے 1610ء میں وہ یہ ''اعلان'' بھی سرعام کر چکے تھے کہ بادشاہ کو اس بات کا کوئی اختیار حاصل نہیں کہ وہ کوئی نیا جرم اور نئی سزا ''ایجاد'' کرے، ان کا دوٹوک موقف یہ تھا کہ عدلیہ کو مکمل طور پر آزاد ہونا چاہیے۔ انہوں نے عدالتوں کے کام میں بادشاہ اور اس کے درباریوں کے عمل دخل کی بھرپور مخالفت کی۔

سر ایڈورڈ کک جلد ہی ایک نجات دہندہ کی حیثیت سے عوام میں مقبول ہو گئے۔ بادشاہ کے حق میں ''اہلِ کلیسا'' کی دعائیں اور عوام سے تعاون کی اپیلیں بھی کارگر ثابت نہ ہوئیں، نہ ہی اس عقیدے کا پرچار کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد کر سکا کہ بادشاہ صفاتِ ربانی کا حامل ہونے کے باعث کسی بھی قانون کی تشریح و توضیح کا اختیار بھی رکھتا ہے اور اہلیت بھی۔

متوقع عوامی ردعمل کے پیشِ نظر بادشاہ نے سر ایڈورڈ کک کو برطرف تو نہیں کیا لیکن غیر فعال بنانے کے ارادے سے 1613ء میں ''کنگز بنچ'' (Kings Bench) کا چیف جسٹس بنا دیا۔ اس سے حالات سنورنے کے بجائے مزید بگڑ گئے کیونکہ سر ایدورڈ کک نے ایسے تمام شاہی فرامین کو غیر قانونی قرار دے دیا جو عوامی حقوق کے خلاف تھے یا عقل و شعور کے

پیمانے پر پورا نہیں اترتے تھے۔ بادشاہ کے پاس چیف جسٹس کی برطرفی کے سوا کوئی چارہ نہ رہا اوراس نے عوامی ردعمل کی پرواہ نہ کرتے ہوئے 1616ء میں یہ کہہ کرانہیں فارغ کر دیا کہ انہوں نے باشاہ کی اجازت کے بغیر ایک مقدمے کی سماعت کی ہے۔اس سے بھی بات نہ بنی کیونکہ عوام چیف جسٹس کے ساتھ تھے جن کی بھرپور حمائت سے وہ 1620ء میں ایک بار پھر پارلیمنٹ کا رکن بننے میں کامیاب ہوگئے۔اس بار انہوں نے بادشاہ کی مخالفت اتنی شدت کے ساتھ کی کہ وہ اپنے ہم خیال اراکین کے ساتھ ''ٹاور آف لندن'' میں قید کر دیئے گئے لیکن 9 مہینے کی یہ قید بھی ان کے عزم کو نہ توڑسکی۔سر اڈورڈ کک کو شمالی امریکہ (جو ان دنوں برطانیہ کی نو آبادی تھا) میں بھی بڑی پزیرائی حاصل ہوئی۔ان کے فیصلے اور دیگر تحریریں وہاں پہنچیں تو انہیں قانون کی تعلیم کا ''مغز'' مان لیا گیا۔امریکہ کی جنگِ آزادی کے سرخیلوں پیڑک ہنری اور جان ایڈم نے سر ایڈورڈ کک کے نظریات پر ہی اپنے انقلابی خیالات کی بنیادرکھی جنہیں عوام میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

برطانیہ میں سرایڈورڈ کک کی تحریک اس وقت واضح طور پر نتیجہ خیز ہوئی' جب نئے بادشاہ چارلس اول کو بڑی مجبوری کے عالم میں ''پٹیشن آف رائٹ'' قبول کرنا پڑی۔اسکے علاوہ 4 جلدوں پر مشتمل Institute of Laws of England اور 13 جلدوں پر مشتمل ''رپورٹس''(Reports) انکی اہم ترین تحریریں ہیں۔''Reports''میں انہوں نے اپنی چالیس سالہ پیشہ ورانہ زندگی میں زیرِ سماعت رہنے والے خاص خاص مقدمات کے بارے میں اپنا تجزیہ پیش کیا ہے۔

سر ایڈورڈ کک نے 1629ء میں عملی زندگی سے علیحدگی اختیار کر لی اور "Stoke poges" میں رہائش پذیر ہوگئے، جہاں 3 ستمبر 1634ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ان کی زندگی خوبیوں پر ہی مشتمل نہیں تھی،اس میں خامیاں بھی تھیں مثال کے طور پر اگر بادشاہ کو پورا یقین نہ ہوتا کہ ایڈورڈ کک اپنے فرائض اس کی مرضی کے مطابق ادا کریں گے تو وہ انہیں چیف جسٹس کیوں

بنا تا؟ لیکن بادشاہ کے آگے نعرہ حق بلند کر کے انہوں نے ایسا کا نامہ سرانجام دیا جس کے باعث قوم نے ان کے سارے گناہ معاف کر دیے۔

وقت گزر گیا، سر ایڈورڈ کک رہے نہ شاہ جیمز اول لیکن امریکہ کی سپریم کورٹ کے اندر نصب ایک علامتی شبیہہ میں آج بھی وہ بادشاہ کو تنبیہ کر رہے ہیں کہ عدالتی معاملات میں مداخلت سے باز رہو۔ اس شبیہہ کو جو بھی دیکھتا ہے وہ بادشاہ پر افسوس کرتا ہے اور ایڈورڈ کک کی عظمت کے گیت گاتا ہے۔

ایڈورڈ کک اور جسٹس افتخار کی کہانی میں غضب کی مماثلت ہے تو کیا عجب ہے کہ کل کو اول الذکر کی طرح ثانی الذکر بھی اپنے رفقاء کی مدد سے عوام کو وہ حقوق دلوا دیں جو ڈکٹیٹروں اور انکے چیلوں نے غصب کر رکھے ہیں اور ہماری عدالتِ عظمی کے اندر ایک ایسی شبیہہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کنندہ کر دی جائے جس میں وہ صدر مشرف کو قانون کا احترام سکھا رہے ہوں؟

روزنامہ خبریں، 23/6/2007

مفاہمت، بینظیر اور بلال کی مونچھ

اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو کبھی یقین نہ کرتا کہ بلال نے کلین شیو کرالی ہے، کیونکہ وہ اپنی مونچھ کے بارے میں شروع دن سے ہی بڑا احساس واقع ہوا ہے۔ کالج کے دنوں میں ایک حجام نے غلطی سے اسکی مونچھ کی تراش خراش کچھ ایسے انداز سے کر لی کہ وہ بلال کے معیار سے گر گئی۔ اس کے بعد جب تک بلال کی مونچھ اپنی اصلی حالت میں واپس نہیں آئی وہ گھر کے باہر خال خال ہی دکھائی دیا۔ گھر کے اندر بھی بعض دوستوں کے خیال میں وہ کھلے عام نہیں گھومتا تھا۔ کالج کی بات چلی ہے تو یہ بھی بتاتا چلوں کہ بلال کو اپنی مونچھ کی طرح سوشلزم کے کے ساتھ بھی بڑا ہی والہانہ لگاؤ تھا۔ وہ بھٹو کی سیاست کو زندگی اور فیض احمد فیض کی شاعری کو زندگی کا مفہوم جانتا تھا، ''نسخہ ہائے وفا'' کی بعض نظموں کو تو وہ اپنے ایمان کا لازمی جزو مانتا ہے۔

جن دو چار غیرت منداور انسان دوست لوگوں کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں ان میں بلال اپنی مثال آپ ہے، غیرت مند اتنا کہ 28 برس کی قریبی رفاقت کے دوران میں نے اسے کبھی جھوٹ بولتے سنا نہ بد دیانتی کرتے دیکھا اور انسان دوست ایسا کہ مظلوم کی خاطر (چاہے وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو) جان تک قربان کر سکتا ہے۔ طالبِ علمی کے دنوں میں بلال اپنی مونچھ، جمہوریت اور سوشلزم کے علاوہ پولیس کے لاٹھی چارج کے حوالے سے بھی خاصا مشہور و معروف ہوا کرتا تھا۔ کالج یا یونیورسٹی کے احاطے میں پولیس چاہے مخالف جماعت کے طالبِ علموں کے تعاقب میں ہی داخل ہوتی، بلال کے ساتھ اس ٹکراؤ ایک لازمی امر ہوتا تھا کیونکہ اس کے خیال میں پولیس کو ایک درس گاہ میں داخل ہونے کی اجازت کسی صورت میں بھی نہیں دی جا سکتی۔ بھاگنا اس کی فطرت میں نہیں تھا، لہٰذا اسے اس وقت تک مار پڑتی رہتی جب تک پولیس مار مار کر تھک نہیں جاتی۔

بلال سے کلین شیو کی وجہ دریافت کی تو وہ بولا کہ کسی سے ایک شرط لگائی تھی جسے ہارنے کی صورت میں مجھے مونچھ منڈوانی تھی۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ آخر ایسی کونسی شرط تھی

جسے جیتنے کا تمھیں اتنا یقین تھا؟ اس نے بڑی بے بسی سے جواب دیا کہ دوستوں کا خیال تھا کہ بے نظیر بھٹو (''قومی مفاہمت'' کے نام پر) مشرف حکومت کے ساتھ ''ڈیل'' کرلیں گی اور میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پیپلز پارٹی جیسی جمہوری جماعت کی قائد ایک آمر کے ساتھ صلح کرسکتی ہے، دوستوں کا خیال درست ثابت ہوا اور میں شرط ہار گیا؟ اُس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے میں نے کہا کہ جو ہوا سو ہوا، تم دل چھوٹا نہ کرو، مونچھ کا کیا ہے دوبارہ نکل آئے گی۔ وہ بولا کہ بات ''ڈیل'' تک ہی محدود ہوتی تو میں مونچھ کے دوبارہ نکلنے کا انتظار کرلیتا لیکن بے نظیر بھٹو کا یہ بیان سن کر کہ میری جگہ ذولفقار علی بھٹو ہوتے تو وہ بھی ایسا ہی کرتے جیسا میں نے کیا، جی چاہتا ہے کہ باقی ماندہ زندگی مونچھ کے بغیر ہی گزاروں، بے نظیر کو کیا یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ذولفقار علی بھٹو نے اپنی جان تک قربان کردی لیکن ایک آمر کے ساتھ ''ڈیل'' نہیں کی؟ بلال کی آواز بھر آئی اور پھر یہ کہتے ہوئے تو وہ رو پڑا کہ میں تمام عمر ''پولیس سرکار کی دھونس'' اور ''مال پٹوار کی دھاندلی'' کے خلاف کیا اسی لیے سربکف رہا کہ اپنی آنکھوں سے جمہوریت کا گلا گھٹتے ہوئے دیکھوں اور کچھ نہ کرسکوں؟ اُس کی آنکھیں یوں بھیگ گئیں جیسے طالبِ علمی کے دور میں آنسو گیس کی شدید شیلنگ کے دوران بھیگ جایا کرتی تھیں۔

میں نے بات اِدھر اُدھر کرنے کی کوشش میں چوھدری شجاعت کا انداز اپناتے ہوئے کہا کہ ''رات گئی، بات گئی''، تم ڈیل کو دخترِ مشرق کی ایک ''سیاسی چال'' سمجھ کر بھول جاؤ، قومی مفاہمت والے آرڈینینس کا وجود اور مستقبل کیا اہلِ اقتدار کے اپنے بقول خطرے میں نہیں؟ بعض لوگوں کے خیال میں بینظیر کو ڈیل کا پہلا فائدہ یہ ہوا کہ کراچی انکی آمد پر خودکش حملے ہوئے، آخر کب تک وہ اس طرح کے فوائد سے مستفید ہوسکیں گی؟ آخر کب تک پیپلز پارٹی کے دیگر سنجیدہ کارکن اپنی مونچھوں کی حفاظت کرسکیں گے؟ تمھیں مونچھ صاف کروانے کی کیا ضرورت تھی؟ شرمندہ تو انہیں ہونا چاہیے جو مختلف حیلوں اور بہانوں سے وطنِ عزیز کو دو دو ہاتھوں سے لوٹتے ہیں، ان میں سے بعض کو اپنے اگلے پچھلے گناہ معاف کروا کر ہمیں ازسرِ نو

لوٹنے کے لیے ''این آر او'' جیسے شرمناک قانون کی ضرورت ہوتی ہے اور بعض کو اس کی حاجت بھی نہیں ہوتی؟ تمھاری مونچھ اتنی سستی نہیں کہ اسے اس قسم کے لوگوں کے لیے داؤ پر لگا یا جائے، تم دوبارہ مونچھیں رکھو اور پھر انہیں تاؤ دے کر فیض صاحب کی وہ نظم ایک مرتبہ پھر جھوم جھوم کر پڑھو جو طالبِ علمی کے زمانے میں پڑھتے ہوئے تمھارا جوش و ولولہ سرخی بن کر تمھارے چہرے میں اتر آتا تھا، آؤ آج میں بھی تمھارے ساتھ مل کر یہ نظم پڑھتا ہوں کہ

لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل پر لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں
روئی کی طرح اڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہلِ حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی
جب ارضِ خدا کے کعبے سے
سب بت اٹھوائے جائیں گے
ہم اہلِ صفا، مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے

روزنامہ خبریں، 24/10/2007

ہری مرچ،حمید اور شوکت عزیز

کچھ ہی عرصہ پہلے کی بات ہے کہ ہری مرچ کی چٹنی اور روٹی غریب لوگوں کی خوراک ہوا کرتی تھی کیونکہ ہری مرچ مفت بھی مل جاتی تھی اور آٹا بھی بہت سستا ہوا کرتا تھا لیکن اب آٹا بھی مہنگا ہے اور ہری مرچ تو 300 روپے کلو فروخت ہو رہی ہے۔اس صورتحال سے حمید بڑا پریشان ہے۔فارورڈ کہوٹہ کا یہ نوجوان شروع شروع میں میرے بھائی کے یہاں کام کیا کرتا تھا لیکن پھر بہتر مستقبل کی تلاش میں اپنے علاقے کے چند اور مزدوروں کے ساتھ مل کر مزدوری کے ٹھیکے لینے لگا۔حمید کے بقول وہ اور اسکے ساتھی مزدور دن کو ہری مرچ کی چٹنی اور روٹی کھایا کرتے تھے جس سے ایک طرف تو چار پیسے بچ جاتے تھے اور دوسری طرف انسان چاک وچوبند بھی رہتا تھا لیکن اب ہری مرچ بھی انکی قوتِ خرید سے باہر ہو چکی ہے۔

حمید کا حوصلہ بڑھانے کے لیے میں نے اسے بتایا کہ ہری مرچ (تمہاری ہی نہیں بلکہ) ملک کی 90 فیصد آبادی کی دسترس سے باہر ہو چکی ہے۔اسی لیے تو اکثر سبزی فروش اب ہری مرچ رکھتے ہی نہیں، کہتے یں کہ اتنے مہنگے داموں کوئی اسے خریدتا ہی نہیں اور یہ پڑے پڑے خراب ہو جاتی ہے جبکہ پہلے ہم گاہکوں کو یہ مفت دے دیا کرتے تھے۔حمید بولا کہ شوکت عزیز صاحب نے مہنگائی کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک مزدور کی کم از کم تنخواہ 4500 روپے مقرر کی تھی۔اس اعتبار سے ہماری یومیہ آمدن 150 روپے بنتی ہے جس سے بمشکل آدھا کلو ہری مرچ خریدی جاسکتی ہے لیکن اگر شوکت عزیز صاحب ہاتھ آجائیں تو اپنی دو دن کی تنخواہ سے پوری ایک کلو ہری مرچ خرید کر انہیں زبردستی کھلاوں بلکہ لگاؤں۔اس ارادے پر میں بے اختیار مسکرانے لگا لیکن حمید اتنے غصے میں تھا کہ اگر اسے شوکت عزیز صاحب مل جاتے تو یقین مانیے کہ وہ ان کا ذرا سا لحاظ بھی نہ کرتا۔حمید اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا کہ سر! جب شوکت عزیز صاحب کو لایا گیا تھا تو سب کہتے تھے کہ وہ بہت لائق ہیں ملک سے غربت کا خاتمہ کر دیں گے،غربت تو کیا ختم ہو گی البتہ غریب ضرور ختم ہو جائیں گے۔میں نے کہا کہ حمید تمہارا

مسئلہ یہ ہے کہ تم پڑھنا لکھنا نہیں جانتے۔ وہ میری بات کاٹ کر بولا کہ سر! میرے ساتھ کئی پڑے لکھے بھی مزدوری کرتے ہیں، پڑھائی لکھائی کو اس ملک میں پوچھتا کون ہے؟ میں نے کہا کہ تم میری بات نہیں سمجھے، میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر تم پڑھے لکھے ہوتے تو میں تمہیں صدر مشرف کی کتاب ''ان دی لائن آف فائر'' پڑھنے کے لیے کہتا اور تمہیں تمہارے سوال کا جواب مل جاتا۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ''سب سے پہلے پاکستان'' کی سب سے پہلی کابینہ کے اراکین کی بنیادی قابلیت یہ تھی کہ وہ انگریزی بڑی اچھی بولتے تھے اور خوش لباس بھی تھے۔ یہ بات سن کر حمید زور زور سے ہنستے ہوئے بولا کہ سر کیوں مذاق کرتے ہیں، انگریزی بولنے یا اچھے کپڑے پہنے سے کوئی لائق تھوڑا ہی ہو جاتا ہے؟ اُسے یہ یقین دلانے کی بہت کوشش کی کہ میں مذاق نہیں کر رہا لیکن وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ ایسی باتیں سنجیدگی سے بھی کی جاسکتی ہیں۔

شوکت عزیز صاحب کی بات چلتی ہے تو توجہ وزیرِ اعظم کی حیثیت سے ان کے آخری انٹرویو کی طرف چلی جاتی ہے جو انہوں نے ایک نجی ٹیلی ویژن کو دیا اور جس میں کہا تھا کہ ''ہم نے ملک وقوم و دین کی خدمت کی ہے اور اللہ تعالی کے فضل وکرم سے کوئی ہماری طرف انگلی نہیں اٹھا سکتا''۔ اس بات پر جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انکی طرف تو انگلیاں ہی انگلیاں اٹھ رہی ہیں وہ اسکی وضاحت اگر اٹارنی جنرل ملک قیوم سے مانگیں تو وہ غالباً یہ کہیں گے کہ سابق وزیر اعظم نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ انکی طرف انگلی نہیں اٹھے گی بلکہ یہ کہا تھا کہ ان کی طرف اٹھنے والی انگلی میں خدا کا فضل وکرم شامل نہیں ہوگا۔ شوکت عزیز صاحب نے بڑے فخر سے یہ بھی کہا تھا کہ مجھ سے پہلے وزیر اعظم یا قید ہوتے تھے یا ملک بدر لیکن مجھے گارڈ آف آنر کے ساتھ رخصت کیا جا رہا ہے۔ شوکت عزیز صاحب کے اس اعزاز پر ایک دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے۔ آزاد کشمیر کے عظیم بانی صدر سردار محمد ابراہیم خان (مرحوم) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ آزاد کشمیر کے سابق وزیر اعظم ممتاز حسین راٹھور (مرحوم) سے پوچھا کہ آپ کو ''بڑوں'' نے کبھی shut up کہا؟ اور انہوں نے جواب دیا کہ جی ہاں۔ انکے بعد

سردار صاحب نے یہی سوال وہاں بیٹھے ایک اور سیاسی قائد سے پوچھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتے راٹھور صاحب بول پڑے کہ سر ''شٹ اپ'' تو اسے کہا جاتا ہے جو بولتا ہے، انکے منہ میں تو زبان ہی نہیں۔ شوکت عزیز صاحب سے پہلے کے کسی وزیر اعظم میں بھی اگر وہ خصوصیات ہوتیں جو ان میں تھیں تو اسے بھی گارڈ آف آنر کے ساتھ ہی رخصت کیا جاتا۔ قید یا جلاوطن تو انہیں کیا جاتا ہے جو اختلاف کرتے ہیں جبکہ شوکت عزیز صاحب کا ''اتفاق'' تو ساری دنیا میں مشہور تھا، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ ''فنافی صدر'' ہو چکے تھے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ صدر صاحب کی تائید کرتے ہوئے وہ یہ بھی بھول جاتے تھے کہ کیا کہہ رہے ہیں اور کہاں کہہ رہے ہیں؟ مثلاً انہوں نے آخری انٹرویو ایمرجنسی کے دوران دیا جب تمام نجی چینلوں پر پابندی عائد تھی۔ جس چینل پر ان کا انٹرویو چلا، اسکی نشریات بھی بند تھیں۔ یہ انٹرویو میں نے ڈیجیٹل ریسیور کے ذریعے دیکھا لیکن اس میں بھی موصوف فرما رہے تھے کہ ہماری حکومت کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہم نے میڈیا کو آزاد کر دیا ہے۔

شوکت عزیز صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ انکے اور صدر صاحب کے خوشگوار تعلقات کی وجہ مزاج کی ہم آہنگی ہے کیونکہ دونوں ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ بات وہ نہ بھی کہتے تو بھی کسے معلوم نہیں کہ ہر دو نے جو بھی کیا وسیع تر ملکی مفاد و قومی سلامتی کے پیش نظر کیا جس سے پاکستان دن دگنی رات چگنی ترقی کر کے ایک ہی برس میں ناکام ریاستوں کی فہرست میں 34 نمبر سے 9 نمبر پر آ گیا، اسی ترقی کے ثمرات ''ٹرکل ڈاؤن ایفکٹ'' کے تحت حمید تک بھی پہنچ چکے ہیں اور وہ اپنی دو روز کی آمدن سے ایک کلو ہری مرچ خرید کر شوکت عزیز ساحب کو زبردستی کھلانے بلکہ لگانے کی حسرت دل میں لیے انہیں ڈھونڈ رہا ہے۔ یہ حسرت تو خیر کیا پوری ہوگی لیکن اس شخص کو ایک بار انصاف کے کٹہرے میں ضرور کھڑا کرنا چاہیے جو حمید سے ہری مرچ کی چٹنی، قوم سے امن وامان اور ملک سے سلامتی چرا کر فرار ہو گیا۔

روزنامہ خبریں، 31/3/2008

''فرق تو پڑا ھے''

کوئی کچھ بھی کہے لیکن مشرف صاحب غلط نہیں کہا کرتے کہ انکے دورِ حکومت میں ''فرق تو پڑا ہے''، ان کی اس بات سے جسے اتفاق نہ ہو وہ میرا آج کا کالم ضرور پڑھے اور بتائے کہ کیا روزمرہ اشیا کی قیمتوں میں 1999 کی نسبت 2007 میں 500 فیصد اضافہ نہیں ہوا؟اس دوران خوراک کی قیمتوں میں اضافے کی شرح 2 . 2 3 فیصد سے بڑھ کر کیا 10.24 فیصد نہیں ہوگئی ؟ اس مہنگائی میں مذید اضافے کو ق لیگ اور نگران حکومت نے زبردستی روکے رکھا تا کہ یہ ''کڑوی گولی'' اگلی حکومت کو نگلنی پڑے لیکن یہ اضافہ پہلے ہوتا یا بعد میں، اس کا خمیازہ تو عوام کو ہی بھگتنا تھا۔ کیا پہلے کبھی مہنگائی اور غربت میں اتنا اضافہ ہوا کہ جس سے تنگ آ کر ایک باپ نے اپنی بچی کو زندہ دفن کیا ہو یا ایک ماں اپنے بچوں کو سکول کے کپڑے پہنا کر، سینے سے لگائے ٹرین کے آگے کود گئی ہو؟ کیا مشرف صاحب کے جوبن پر معیط دہائی کے دوران خودکشی کرنے والوں کی تعداد میں 20 گنا اضافہ نہیں ہوا؟ کون کہتا ہے کہ فرق نہیں پڑا؟

کیا تازہ ترین اعدادوشمار کے مطابق غربت کی لکیر سے نیچے رہنے والے پاکستانیوں کی تعداد 7 کروڑ اور ایک کمرے کے مکان میں آباد ہم وطنوں کی تعداد 9.5 کروڑ سے تجاوز نہیں کر گئی ؟ کیا پہلے کبھی ایسا ہوا کہ ہماری نصف سے زیادہ آبادی کو (اور تو اور) پینے کا صاف پانی تک میسّر نہ ہوا ہو؟ کیا پہلے کبھی ایسا ہوا کہ کوئی چیز بیک وقت ایکسپورٹ بھی کی جائے اور امپورٹ بھی، وہ بھی کچھ اسطرح کہ جس قیمت پر ایکسپورٹ کی جائے اس سے دگنی قیمت پر امپورٹ کی جائے ؟ کیا ق لیگ نے ایک ہی سال میں پہلے 1.3 ملین ٹن گندم ایکسپورٹ اور پھر 1.0 ملین ٹن امپورٹ نہیں کی اور بیچتے وقت اسکی قیمت کیا 220 ڈالر فی ٹن اور خریدتے وقت 450 ڈالر فی ٹن نہیں تھی ؟ جو گندم ایکسپورٹ کی گئی اس سے 9.24 ارب روپئے کی آمدنی ہوئی لیکن جو امپورٹ کی گئی اس پر کیا 26.40 ارب روپئے کے اخراجات نہیں ہوئے

اور اسطرح کیا 17.16 ارب روپئے کا نقصان نہیں ہوا اور اسکے بعد سے آج تک اربوں روپئے مذید خرچ کر کے بھی کیا آٹے کے بحران پر قابو پایا جا سکا؟ کیا پہلے کبھی آٹا اسقدر نایاب ہوا جتنا مشرف صاحب کے اقتدار میں ہوا؟ اگر نہیں ہوا تو پھر خود ہی بتایئے کہ فرق پڑا یا نہیں؟ کیا ق لیگ کے دورِ حکومت میں آخری 4 برس کے دوران 1400 ارب روپے سے زیادہ کے قرضے جاری نہیں کیے گئے جبکہ اس سے پہلے کے 18 برس میں صرف 921 ارب روپے کے جاری کیے گئے تھے؟ اور اسٹیٹ بینک کے اعداد وشمار کے مطابق 2000 سے 2006 تک کیا 100 ارب روپے کے قرضے معاف نہیں کیے گئے؟ کیا یہ قرضے غریب عوام کو جاری ومعاف کیے گئے یا بڑے بڑے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو؟ پھر قرضوں اور سود کی ادائیگی کے لیے اس وقت کے بجٹ میں کیا 4 کھرب 36 ارب روپے کی رقم نہیں رکھی گئی؟ اور ٹیکس محصولی کے لیے کیا 10 کھرب روپے کا ہدف مقرر نہیں کیا گیا جو اشرافیہ سے لیا جانا تھا یا عوام سے؟

کیا ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی تازہ ترین رپورٹ کے مطابق (بین الاقوامی پیمانے کی رو سے) ہمارے یہاں 2006 کی نسبت 2007 میں رشوت ستانی کی شرح 100 فیصد اضافے کے بعد 15 فیصد سے بڑھ کر 30 فیصد نہیں ہو گئی؟ مجموعی کرپشن میں پولیس، ٹیکس کا شعبہ اور بنیادی ضروریات کے شعبہ جات (بجلی، پانی وغیرہ) کیا دن دگنی رات چوگنی ترقی کے ساتھ سامنے نہیں آئے؟ کیا پاکستان سٹریٹ کرائم میں اپنی مثال آپ نہیں بن گیا؟ کیا گذشتہ حکوت کے آخری 8 مہینوں کے دوران صرف لاہور شہر میں راہزنی، قتل، اغوا اور چوری کی 6 ہزار سے زیادہ وارداتیں نہیں ہوئیں؟ کیا ہم جعلی ادویات بنانے والے پہلے 13 مما لک میں شامل نہیں ہو گئے؟ کیا پہلے کوئی خودکش حملوں کی اس فراوانی کے بارے میں سوچ بھی سکتا تھا جو آج ہمیں آرام سے سونے دیتی ہے نہ جاگنے دیتی ہے؟ کیا ق لیگ کے دورِ حکومت میں صرف 3 مہینوں کے دوران خودکش حملوں میں 400 سے زیادہ ایسے لوگ قتل نہیں ہوئے جن

کی اکثریت کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ انہیں کس جرم کی پاداش میں موت کی سزا دی جا رہی ہے؟

بم دھماکوں کی بات چلتی ہے تو اپنی بیٹی میرب کا خیال آ جاتا ہے جو ہر رات سونے سے پہلے کہانیاں سنتی ہے۔ایک رات جب اس نے کہانی کی فرمائش کی تو میں نے کہا کہ ہر روز میں کہانی سناتا ہوں، آج آپ سنائیں تو وہ سنانے لگی کہ ''ایک دفعہ ایک کیٹو (بلی) اور ایک ڈاگی (کتا) شاپنگ مال جا رہے تھے، پھر بم بلاسٹ ہوا اور وہ دونوں مر گئے''۔اپنی دو سال کی معصوم بیٹی سے سنی ہوئی یہ کہانی جب بھی یاد آتی ہے تو یہ سوچ کر آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ جاتے ہیں کہ جس عمر میں ہم پھولوں تتلیوں اور پریوں کی کہانیاں سنتے سناتے تھے اس میں ہمارے بچے بم دھماکوں کے قصے کرنے پر مجبور ہیں۔فرق نہیں پڑا تو اور کیا ہوا ہے؟

کیا یواین ڈی پی کی رپورٹ کے مطابق سکول چھوڑنے والے بچوں کی شرح 48 فیصد سے بڑھ کر 54 فیصد نہیں ہو گئی؟ کیا ذہنی دباؤ اور نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا پاکستانیوں کی شرح 70 فیصد سے تجاوز نہیں کر گئی؟ کیا ق لیگ کے دورِ حکومت میں یواین ڈی پی کی جانب سے زندگی کے تحفظ، خواندگی، تعلیم اور معیارِ زندگی کو ملحوظ خاطر رکھ کر مرتب کی گئی 175 ممالک کی فہرست میں پاکستان کی پوزیشن گر کر 136 نمبر پر نہیں آ گئی؟ کیا گزشتہ 10 برس کی کارکردگی کو مدنظر رکھتے ہوئے 10 جولائی 2007 کو جاری کی گئی عالمی بینک کی ایک سروے رپورٹ کے مطابق 202 ممالک کی فہرست میں پاکستان سیاسی استحکام وامن وامان کے اعتبار سے 193 نمبر پر، کرپشن پر کنٹرول کے اعتبار سے 166 نمبر پر، اظہارِ رائے کی آزادی اور احتساب کے اعتبار سے 165 نمبر پر، قانون کی حکمرانی کے اعتبار سے 153 نمبر پر، حکومت کی فعالیت کے اعتبار سے 134 نمبر پر اور قواعد وضوابط کے معیار کے اعتبار سے 125 نمبر پر نہیں پہنچ گیا؟ کیا ہم ناکام ممالک کی اس فہرست میں 34 نمبر سے ترقی کرتے کرتے 9 نمبر پر نہیں پہنچ چکے جس میں بنگلہ دیش، نیپال، سری لنکا اور بھوٹان جیسے ممالک بھی بالترتیب 25، 20,19 اور 39 نمبر پر ہیں؟

اگر فرق نہ پڑا ہوتا تو امریکی ادارے ''انٹرنیشنل ری پبلک انسٹی ٹیوٹ'' کے حالیہ سروے کے مطابق پاکستان کے 86 فیصد لوگوں کا خیال کیا یہ ہوتا کہ ملک صحیح سمت میں سفر نہیں کر رہا، 83 فیصد کی رائے کیا یہ ہوتی کہ مشرف صاحب کو فوری طور پر اقتدار سے الگ ہو جانا چاہیے اور 86 فیصد کیا یہ چاہتے ہیں کہ صدرِ ذی وقار کا مواخذہ ہونا چاہیے؟ اگر فرق نہ پڑا ہوتا تو جن لوگوں کو مشرف صاحب نے زیادہ ناپسند کیا، وہ عوام کے یہاں زیادہ پسندیدہ کیوں ہوتے اور مذکورہ سروے کے مطابق نواز شریف، ڈاکٹر قدیر، جسٹس افتخار اور شہباز شریف کو بالترتیب 82 فیصد، 76 فیصد، 65 فیصد اور 65 فیصد ووٹوں کے ساتھ مقبول ترین شخصیات کیوں قرار دیا جاتا؟ فرق تو پڑا ہے۔

روزنامہ خبریں، دسمبر 2007

فیصلہ زرداری صاحب خود کر لیں

اگر ہمارے کانوں کی جگہ آنکھیں ہوتیں اور آنکھوں کی جگہ کان ہوتے یا ہاتھوں کی جگہ پاؤں اور پاؤں کی جگہ ہاتھ ہوتے تو ہم کیا کرتے؟ کیا ہماری زندگی موت سے بدتر نہ ہوتی؟ ہمارے ملک کے ساتھ بھی کیا ایسا ہی نہیں کہ یہاں اکثر چیزیں وہاں ہیں جہاں انہیں نہیں ہونا چاہیے یا وہاں نہیں ہیں جہاں انہیں ہونا چاہیے؟ کیا ہمارا معاشرہ بھی گھٹ گھٹ کر نہیں جی رہا؟

کیا آپ جانتے ہیں کہ عربی لغت (تاج العروس، محیط المحیط وغیرہ) کی رو سے ظلم کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ ظلم کا مطلب ہوتا ہے کسی چیز کو اس کے صحیح مقام سے ہٹا دینا، اس میں کمی بیشی کر دینا۔ مثال کے طور پر ظلم یہ ہے کہ آئین کو معطل کر دیا جائے یا اس میں غیر ضروری و ناجائز ترامیم کر دی جائیں، اختیارات کا ناجائز استعمال کیا جائے، دوسروں کے کام میں بے جا مداخلت کی جائے، میرٹ کو پامال کیا جائے، ذاتی مفاد کو قومی مفاد اور ذاتی سلامتی کو قومی سلامتی کہا جائے وغیرہ وغیرہ

قرآن کریم میں ظالم کا لفظ کثرت سے استعمال کیا گیا ہے اور ان لوگوں کے لیے کیا گیا ہے جو حدود کی پاسداری نہیں کرتے، قانون توڑتے ہیں، انسانی حقوق میں کمی کرتے ہیں، دوسروں کی ملکیت و محنت ناجائز طور پر اپنے مصرف میں لاتے ہیں، دوسروں کے واجبات پورے ادا نہیں کرتے وغیرہ وغیرہ۔ یہی نہیں بلکہ ان لوگوں کو بھی ظالم کہا گیا ہے جو ظلم سہتے ہیں اور اسکے خلاف بغاوت نہیں کرتے۔ ظلم اور ظالم کی تعریف ذہن میں رکھیے اور سوچیے کہ وطنِ عزیز کا نظام کیا ظلم پر مبنی نہیں اور یہاں کیا قدم قدم پر ظالم لوگ مسلط نہیں؟

قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ جو معاشرہ ظلم پر مبنی ہو وہ ایک نہ ایک روز لازمی طور پر برباد ہو جاتا ہے۔ اس تباہی سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ عدل کا نظام رائج کر دیا جائے جس کا مطلب ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا اور اسے ہر قسم کی غیر ضروری و ناجائز کمی بیشی

سے پاک کرنا ہوتا ہے۔

ظلم وعدل کی جنگ کا ذکر ہوتا ہے تو کولمبیا کی یاد آ جاتی ہے جہاں 1989 میں سپریم کورٹ نے ''پابلو اسکوبار'' نامی انڈرورلڈ ڈان کی گرفتاری کے احکامات صادر کر دیے جو دنیا کا خطرناک ترین اور امیر ترین مجرم سمجھا جاتا تھا۔ خطرناک اتنا کہ اس نے اپنے راستے میں آنے والے 3500 لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور امیر اتنا کہ اس کی سالانہ آمدن (اس زمانے میں بھی) 30 ارب امریکی ڈالر تھی۔ کولمبیا میں ان دنوں ''ظلم'' کا راج تھا اور اکثر چیزیں اپنی حقیقی جگہ سے ہٹا دیں گئی تھیں۔ مافیا اور حکومت میں گٹھ جوڑ کے باعث اسکوبار کی گرفتاری عمل میں نہ لائی گئی جس پر سپریم کورٹ نے صدر کو توہینِ عدالت کا نوٹس جاری کر دیا۔ جواب میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی لیکن ججوں نے اس صدارتی اقدام کو بھی خاطر میں نہ لایا۔ کولمبیا کے لوگ جو ظلم کے ہاتھوں پہلے ہی بڑے تنگ تھے فوری طور پر عدلیہ کی حمایت میں اس زور وشور سے سڑکوں پہ نکل آئے کہ حکومت اسکوبار کو گرفتار کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اپنے لارڈ کی گرفتاری پر مافیا نے ججوں کو ہر حربے اور طریقے سے ''راہ راست'' پر لانے کی کوشش شروع کر دی جس کے نتیجے میں بعض ججوں نے مافیا سے پیسے اور حکومت سے چھٹی لے لی لیکن باضمیر، غیور اور باوقار جج اسکوبار کے کیس کی سماعت میں مگن رہے۔ مافیا نے ججوں کے خلاف کاروائی شروع کر دی۔ 30 جج شہید کر دیے گئے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جج اس کیس کے سماعت ایسے شیشے کے پیچھے بیٹھ کر کرنے لگے جس سے وہ تو سب کو دیکھتے تھے لیکن انہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا اور جب انہیں کوئی سوال پوچھنا ہوتا تو وہ ایسے سپیکر کے ذریعے پوچھتے تھے جو آواز کو تبدیل کر دیتا تھا تاکہ کسی کو یہ پتا ہی نہ چل سکے کہ کونسا جج کیس سن رہا ہے۔ آخر کار کیس کی سماعت مکمل ہوگئی اور اسکوبار کو سزا سنا دی گئی۔ سزا پر عمل درآمد سے گریز کیا گیا جس پر کولمبیا کے لوگ مرنے مارنے پر تل گئے۔ اس شدید عوامی ردعمل کے بعد حکومت کے پاس سزا کے حکم پر عمل درآمد کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ عدل فتح مند ہوا، ظلم کو ذلت آمیز شکست ہوئی۔ حق و باطل کا

یہ معرکہ(جسکا با قاعدہ آغاز اس ایڈیٹر کے قتل سے ہوا جس کے اخبار نے مافیا اور حکومت کے خفیہ روابط کو بے نقاب کرنے کا 'جرم' کیا تھا) کولمبیا کے لیے ایک نئی زندگی کا پیغام لایا۔

ججوں اور مافیا کی کشمکش میں 1978 سے 1991 تک کل ملا کر 278 جج قربان ہوئے لیکن عدلیہ نے ظلم کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکے۔ اسی لیے کولمبیا میں ان ججوں سے اتنی محبت کی جانے لگی کہ انکے گھروں کے باہر پھول رکھے جانے لگے، وہ جس تقریب میں جاتے ،لوگ کھڑے ہو کر تالیاں بجانے لگتے ، وہ بولتے تو لوگ احتراماً خاموشی اختیار کر لیتے ، تعلیمی اداروں میں طالب علموں کو انکی عظمت کے قصے سنائے جاتے اور ان کے ناموں پر بچوں کے نام رکھے جانے لگے۔ ایک طرف تو یہ عالم تھا اور دوسری طرف مافیا سے سودے بازی کرنے والے بے ضمیر ججوں کی تذلیل اس طرح کی جانے لگی کہ انکے دروازوں کے آگے کوڑا کرکٹ پھینکا جانے لگا، ان کا سوشل بائیکاٹ کر دیا گیا اور آئندہ نسلوں کے لیے وہ نام تک حرام قرار دے دیے گئے جو ان ججوں کے تھے۔ وہ جہاں جاتے انہیں اتنی حقارت سے دیکھا جاتا کہ انکے پاس کولمبیا کو خیر آباد کہنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

کولمبیا کے غیور ججوں نے میڈیا اور عوام کے بھرپور تعاون سے قانون کی بالادستی کا معرکہ جیت لیا۔ یہی جنگ اب پاکستان میں جاری و ساری ہے جس میں 60 ججوں نے عزتِ نفس کے سوا اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا لیکن کسی ''ڈان'' کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ ان ججوں کے لیے عوام کی محبت کا عالم یہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے بچے کا نام بھگوان داس رکھ دیا اور اس کے وجہ یہ بتائی کہ جب تک یہ بچہ زندہ رہے گا لوگ اس سے پوچھتے رہیں گے کہ مسلمان ہو کر بھی اس کا نام ہندوؤں جیسا کیوں ہے اور جواب میں یہ ''پی سی او'' کے تحت حلف نہ اٹھانے والے عظیم جج بھگوان داس کی کہانی سنا کر انہیں خراجِ تحسین پیش کرتا رہے گا۔ اسی محبت کی وجہ سے 18 فروری کے الیکشن کا نتیجہ حکومتِ وقت کی تمام تر خواہش اور کوشش کے برعکس نکلا جس سے مظلوم عوام کے دلوں میں یہ امید پیدا ہوئی کہ پاکستان میں ایک نئے دور کا آغاز ہونے والا

ہے، ایسا دور جو آئین و قانون کی بالادستی کا ضامن ہوگا اور جس میں ہر چیز وہیں ہوگی جہاں اسے ہونا چاہیے لیکن افسوس کہ پیپلز پارٹی ججوں کی بحالی اور فعالی کے معاملے میں عوامی امنگوں کو خاطر میں نہیں لا رہی۔ کبھی یہ اعلان تو کبھی وہ اعلان، کبھی 24 گھنٹے تو کبھی 72 گھنٹے، کبھی فلاں مسئلہ تو کبھی فلاں مجبوری؟ پہلے کہا جاتا تھا کہ جنرل مشرف ججوں کی راہ میں رکاوٹ ہیں لیکن اب تو وہ بھی ''گارڈ آف آنر'' لے کر جاچکے؟

کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے لیکن دنیا جانتی ہے کہ موجودہ حکومت کی کامیابی میں معزول ججوں کی بحالی کے نعرے نے کلیدی کردار ادا کیا، لہذا منتخب حکمرانوں کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ فوری طور پر پرانی عدلیہ کو بحال کریں اور آئین کو اپنی اصلی حالت میں واپس لائیں بصورتِ دیگران کی جانب عوام کی نفرت و ناپسندیدگی کا ایسا سیلاب بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا ہے جو انہیں خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے گا۔

پاکستان کے عظیم وکلا، صحافی اور شہری تہیّہ کر چکے ہیں کہ جسطرح کولمبیا میں عدلیہ کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کیا گیا ویسے ہی ہمیں بھی اپنے باضمیر، غیور اور باوقار ججوں کو ہر قیمت پر بحال و فعال کرانا ہے اور ملک میں انصاف و قانون کی مکمل بالادستی قائم کرنی ہے جسکے بغیر ہماری سلامتی کو شدید خطرات لاحق ہو چکے ہیں۔ ظلم اور عدل کی اس لڑائی میں ان لوگوں کا ساتھ بھی دیا جاسکتا ہے جنکے دروازوں کے آگے کوڑا کرکٹ پھینکا جائے گا اور انکا بھی جنکے گھروں کے باہر پھول رکھے جائیں گے؟ زرداری صاحب کو کس کا ساتھ دینا چاہیے، اس کا فیصلہ وہ خود کرلیں لیکن اس سے پہلے یہ نظم ضرور ملاحظہ فرمالیں کہ

آمریت کی ہو جس کے منہ میں زباں
جو گھٹا ٹوپ ظلمت کا ہو ترجماں
جو ہو اندھے قوانین کا پاسباں
ایسے انصاف سے قوم بیزار ہے

ایسے انصاف سے ہم کو انکار ہے
زیردستوں پہ جو حکمرانی کرے
جو زبردستوں کے آگے پانی بھرے
جو ہو انسانیت کی حدوں سے پرے
ایسے انصاف سے قوم بیزار ہے
ایسے انصاف سے ہم کو انکار ہے
فیصلے بیچنا جس کا دستور ہو
جھوٹ کو سچ بنانے پہ مامور ہو
اقرباپروری جس کا منشور ہو
ایسے انصاف سے قوم بیزار ہے
ایسے انصاف سے ہم کو انکار ہے
ظلم کا راج ہو جس کے سائے تلے
جس کی آغوش میں جبرِ پھولے پھلے
لے کے فرعونیت کا علَم جو چلے
ایسے انصاف سے قوم بیزار ہے
ایسے انصاف سے ہم کو انکار ہے

روزنامہ جناح، 27/8/2008

''کھوٹے سکے''

کچرے کے ڈھیر سے اس عورت کو ایک سیب ملا جسے اپنے میلے کچیلے کپڑوں سے صاف کر کے اس نے پاس کھڑی بچی کو دے دیا جو غالبًا اس کی بیٹی تھی۔ بچی نے ماں کی دیکھا دیکھی اس سیب کو اپنے پھٹے پرانے کپڑوں سے دو تین بار رگڑا اور پھر بڑے مزے سے کھانا شروع کر دیا۔

میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔اس کھڑکی کے شیشے سے کمرے میں اترتی ہوئی جاڑے کی نشیلی دھوپ میں بیٹھ کر ناشتہ کرنا مجھے بڑا اچھا لگتا ہے جس کا موقع چھٹی کے دن ہی ملتا ہے، قائداعظم کا یومِ ولادت تھا لیکن ان ماں بیٹی کی حالت دیکھ کر طبیعت اتنی اداس ہوگئی کہ انہیں گھر بلا کر ناشتہ کرانے سے بھی جی بحال نہ ہوا۔گزشتہ شب کا وہ چراغاں نگاہوں میں گھومنے لگا جو بانیء پاکستان کی پیدائش پر ملک بھر میں کیا گیا۔کیا اس چراغاں سے ہم قائدِ اعظم کا شکریہ ادا کر سکتے ہیں جنہوں نے دوٹوک الفاظ میں فرمایا تھا کہ ''پاکستان میں رہنے والے ہر شخص کو یکساں مواقع فراہم کیے جائیں گے۔ پاکستان امیروں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں اورنوابوں کی لوٹ مار کے لئے نہیں بنایا گیا۔ پاکستان غریبوں کی قربانیوں سے قائم ہوا ہے اور غریبوں کا ملک ہے جس پر غریبوں کو ہی حکومت کرنے کا حق ہے۔ پاکستان میں ہر شخص کا معیارِ زندگی اس قدر بلند کیا جائے گا کہ امیر و غریب کا کوئی فرق نہیں رہے گا''۔کیا ہم نے وطنِ عزیز کو ''امیروں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور نوابوں'' کی لوٹ مار سے بچا لیا؟ کیا ہم نے امیر غریب کا فرق مٹا دیا؟ قائد کا شکریہ ادا کرنے کے لیے کیا ہمیں پاکستان کے طول و عرض میں پھیلی غربت کا خاتمہ نہیں کرنا چاہیے، ''مساوات'' کو فروغ نہیں دینا چاہیے؟

بابائے قوم قانون و انصاف کی بالادستی پر یقین رکھتے تھے،تو کیا پاکستان میں قانون و انصاف کی بالادستی قائم کیے بغیر ان کا شکریہ ادا کیا جا سکتا ہے؟ وہ قانون و انصاف جسے پیروں

تلے روندنے میں ہم فخر محسوس کرتے ہیں، جس کی پاسداری میں ہمیں اپنی توہین محسوس ہوتی ہے، جسے ہم نے مذاق بنا کر رکھ دیا ہے۔ قائداعظم نے حاکموں سے کہا تھا کہ ''حاکمیت کے تکبر کا نشہ ٹوٹنا چاہیے۔ اب آپ کو ملازموں کی طرح فرائض بجالانے چاہیں۔ مجھے احساس ہے کہ قدیم روایات، قدیم ذہنیت، قدیم نفسیات، ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں اور ان سے نجات پانا آسان نہیں لیکن اب یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ عوام کے سچے خادموں کی حیثیت سے کام کریں''۔ قائداعظم کا شکریہ کیا اس وقت تک ادا کیا جا سکتا ہے جب تک ہمارے حکمران عوام کے خادم نہ بن جائیں؟

قائداعظم نے ''امن و رواداری'' کے فروغ پر زور دیا۔ کیا ''امن اور رواداری'' کو فروغ دیے بغیر قائداعظم کو خراجِ عقیدت پیش کیا جا سکتا ہے؟ وہ امن جو پاکستان میں آج تک قائم ہو سکا نہ مستقبل قریب میں قائم ہونے کا کوئی امکان ہے اور وہ رواداری جو ہمیں چُھو کر بھی نہیں گزری۔

قائداعظم کا احسان اتارنے کے لیے کیا پاکستان سے ''کرپشن کا خاتمہ'' کرنا ضروری نہیں، رشوت و سفارش کو مٹانا لازمی نہیں جبکہ قائداعظم نے انہیں ''آہنی ہاتھ سے'' ختم کرنے کی تاکید کئی بار کی؟ وہ کرپشن جس میں ہم اپنا ثانی نہیں رکھتے، وہ رشوت جس کے بغیر ہمارے یہاں گیس اور بجلی کا کنکشن بھی نہیں ملتا اور وہ سفارش جس کے بغیر (اور تو اور) کسی ہوٹل سے چائے کی ایک اچھی پیالی بھی نہیں ملتی۔

قائداعظم کا قرض تو پاکستان کو (قائد ہی کے الفاظ میں) ''مضبوط، مستحکم اور جمہوری'' بنانے سے ہی چکایا جا سکتا ہے، کیا ہم نے پاکستان کو'' مضبوط، مستحکم اور جمہوری'' بنایا؟ قائد اعظم کی ہدایت تو یہ تھی کہ مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چلنا چاہیے، وہ تو کہا کرتے تھے کہ عورتوں کو کم تر جاننے والی قومیں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں لیکن ہم کیا عورتوں کو جانوروں کے برابر بھی سمجھتے ہیں؟ اگر سمجھتے تو کیا زندہ درگور کرتے یا کتوں کے آگے ڈالتے؟

قائداعظم چاہتے تھے کہ ہر شہری کو بلا تخصیص اس کے حقوق ادا کیے جائیں۔اگر پاکستان کا آئین قائداعظم نے خود بنایا ہوتا تو کیا وہ اس میں یہ لکھتے کہ کوئی غیر مسلم پاکستان کا سربراہ نہیں بن سکتا،خواہ وہ سات پشتوں سے ہی پاکستانی کیوں نہ ہو؟ کیا ہم قائداعظم کا 11 اگست والا مشہورومعروف خطاب بھی بھول چکے ہیں جو انہوں نے قانون ساز اسمبلی سے کیا اور جس میں انہوں نے کہا کہ ''آپ آزاد ہیں۔آپ کو اپنے مندروں، مسجدوں یا دوسری عبادت گاہوں میں جانے کی مکمل آزادی ہے۔خواہ آپ کسی بھی مذہب،نسل یا ذات سے تعلق رکھتے ہوں اس کا کوئی تعلق اس بنیادی اصول سے نہیں کہ ہم ایک ریاست کے شہری اور مساوی حیثیت رکھنے والے شہری ہیں''۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قائداعظم پاکستان کو ایک کٹر مذہبی ملک بنانا چاہتے تھے وہ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ قائداعظم نے ایک طرف تو اپنی کابینہ میں جوگندر ناتھ منڈل کو وزیرِ قانون بنایا تھا جو ایک ہندو تھے،سید ظفر اللہ خان کو وزیرِ خارجہ بنایا تھا جو ایک قادیانی تھے اور دوسری طرف کسی ایک انتہا پسند کو بھی اپنی کابینہ میں شامل نہیں کیا۔

کئی بار سوچتا ہوں کہ قائداعظم کچھ دیر اور زندہ رہتے تو انہیں ہمارے ہاتھوں کتنی تکلیف اٹھانی پڑتی۔اپنے آخری ایام میں بھی انہوں نے کم تکلیف تو نہیں اٹھائی۔کیا آپ کو یاد نہیں کہ بانیء پاکستان کو (گورنر جنرل کی حیثیت سے) شدید علالت کی حالت میں کوئٹہ سے کراچی لایا گیا تو ائیر پورٹ پر انکے ملٹری سیکرٹری کے علاوہ کوئی حکومتی عہدیدار موجود نہیں تھا اور پاک فضائیہ کے ماڑی پور بیس سے انہیں ہسپتال لے جانے کے لیے جو ایمبولنس بھیجی گئی تھی اسکا انجن راستے میں ہی خراب ہو گیا۔اس حوالے سے مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح اپنی کتاب 'مائی برادر' (میرا بھائی) میں لکھتی ہیں کہ ''ہمارے قریب مہاجرین کی سینکڑوں جھونپڑیاں تھیں جو کاروبارِ زندگی میں مصروفِ کار تھے۔انہیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ انکا قائد جس نے انہیں وطن دیا،انکے درمیان بے یارو مددگار پڑا تھا۔کاریں ہارن بجا بجا کر اپنا راستہ بنا رہی تھیں،بس اور ٹرک شور مچاتے ہوئے ہمارے آس پاس سے گزر رہے تھے،لیکن ہم ایک ایسی ایمبولنس میں

وہیں کے وہیں کھڑے تھے جو ایک انچ چلنے کو تیار نہیں تھی۔ ہمیں ایک گھنٹے سے زیادہ انتظار کرنا پڑا اور میری تمام زندگی میں کوئی اور گھنٹہ اتنا طویل گزرا نہ اتنا کربناک''۔

قائداعظم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ''میری جیب میں چند کھوٹے سکّے ہیں''۔ شاید وہ کھوٹے سکے قائداعظم کی وفات تک انکی جیب میں ہی پڑے ہوئے تھے۔ انہی کھوٹے سکوں کی باقیات آج بھی پاکستان کو ''قائدِ اعظم کا پاکستان'' نہیں بننے دے رہیں، اس لیے کہ وطنِ عزیز بابائے قوم کی خواہشات کا پیکر بن گیا تو یہ کھوٹے سکّے یہاں نہیں چل سکیں گے۔ کھوٹے تو کھوٹے ہی ہوتے ہیں لیکن جو کھوٹے نہیں انہیں تو سوچنا چاہیے کہ اگر بانیء پاکستان زندہ ہوتے تو ہمارے پاکستان کی موجودہ حالت دیکھ کر ان کا حال کیا ہوتا جہاں ایسے لوگ بھی آباد ہیں جنہیں کچرے کے ڈھیر سے چیزیں اٹھا کر کھانی پڑتی ہیں؟

روزنامہ خبریں، 5/1/2007

ہمارا اصل مجرم کون ہے؟

پاکستان بنا تو انگریزوں کو برصغیر سے جانا پڑ گیا اور ان کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا اسے تین طاقتیں پُر کرسکتی تھیں۔ سیاستدان، سول بیوروکریسی اور ملٹری بیوروکریسی۔ سیاستدان وہ تھے جو انگریز راج کے خلاف طویل عرصے تک ہر طرح کی جدوجہد کرتے رہے، قربانیاں دیتے رہے۔ اسی لیے انگریز انہیں غداری کا مرتکب قرار دیتے تھے اور پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے، سیاستدانوں ہی کی بدولت برصغیر کے اقتدار پر گورا صاحب کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوگئی، سیاستدانوں میں جس نے انگریز راج کی جتنی زیادہ مخالفت کی وہ عوام میں اتنا ہی زیادہ مقبول ہوا۔ سیاستدانوں کے برعکس سول اور ملٹری بیوروکریسی کا معاملہ یہ تھا کہ ہر دو طاقتیں برِصغیر پر انگریزوں کے اقتدار کو طویل و مستحکم بنانے میں مگن رہیں، اسی لیے انگریز ان پر نوازشات کی بارشیں برسایا کرتے تھے، جو بیوروکریٹ (چاہے سول ہو چاہے فوجی) انگریزوں کا جتنا زیادہ وفادار ہوتا تھا وہ اتنا ہی آگے اور اوپر جاتا تھا۔ سیاستدانوں کی ٹریننگ گلیوں محلوں جلسوں جلوسوں اور ریلیوں میں ہوتی تھی اور کامیابی کے سرٹیفکیٹ لاٹھی چارج اور قید و بند کی صعوبتیں تھیں جبکہ اسٹبلشمنٹ کی تربیت ان اکیڈمیوں میں ہوتی تھی جو انگریزوں نے اپنے مفادات کے تحت بڑی سوچ بچار کے بعد قائم کی تھیں۔

آپ خود ہی سوچیے کہ انگریز حکمران اگر اپنے ماتحت لوکل حکمرانوں کا ایک سلسلہ پیدا نہ کرتے تو کیا وہ قلیل سی تعداد میں ایک طویل عرصے تک برِصغیر کی کثیر آبادی کو اپنا غلام رکھ سکتے تھے۔ کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ انگریزوں کی تعداد 30 ہزار کے لگ بھگ تھی اور جن لوگوں کو انہوں نے اپنا غلام بنا رکھا تھا وہ تقریباً ایک ارب تھے، ایک ارب لوگ اگر ''مِل کر'' تھوکنا بھی شروع کر دیتے تو کیا عجب تھا کہ 30 ہزار گورے انکی تھوکوں میں ہی ڈوب کر مر جاتے؟ اسی لیے تو انگریزوں نے ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کو اپنایا ہوا تھا۔

13 اگست 1947 کی رات اس اندھیرے کا آخری نشان تھی جو انگریزوں نے

ہماری سول وملٹری بیوکریسی کی بدولت ہم پر تقریباً چار سو سال مسلط کیے رکھا اور 14 اگست کو وہ صبح طلوع ہوئی جسے سیاستدانوں کی قیادت میں آزادی کی باقاعدہ تحریک چلانے والے عوام کے لہو سے پھوٹنے والی شفق نے بیدار کیا تھا۔ اقتدار کی منتقلی سیاستدانوں کو ہوئی جن کی قیادت قائداعظم جیسی عظیم ہستی کے ہاتھوں میں تھی، اس کے ساتھ ہی بیوروکریسی کی شرمناک و مکروہ سازشوں کا آغاز شروع ہو گیا جو قائدِ اعظم کی افسوس ناک رحلت پر عروج پہ پہنچ گئیں۔ نوکر شاہی خود کو انگریزوں کا حقیقی جانشین سمجھتی تھی اور سیاستدانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ منظّم اور مراعات یافتہ تھی، اس پر ستم یہ کہ اس نے انگریزوں کی قائم کردہ اکیڈمیوں سے دھوکہ دہی، چالبازی اور منافقت کی باقاعدہ ٹریننگ لے رکھی تھی جبکہ سرکردہ سیاستدان تو بالکل ہی سیدھے سادے تھے۔ آپ خود ہی سوچیے کیا لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین اور حسین شہید سہروردی جیسے لوگ غلام محمد اور جنرل سکندر مرزا جیسے شیطانوں کے مکروفریب کا مقابلہ کر سکتے تھے؟ چنانچہ اقتدار جلد ہی اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھ میں آ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ملک جسے اپنے بنانے والوں کی متفقہ رائے کے مطابق ایک جمہوری ملک بننا تھا اور جس کی باگ ڈور ''قراردادِ مقاصد'' کے تحت عوام کی جانب سے (الیکشن کے ذریعے) منتخب شدہ نمائندوں کے ہاتھ میں ہونا تھی، غیر منتخب لوگوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گیا جنہوں نے آزادی کے 23 برس بعد تک یہاں عام قومی انتخابات ہی نہیں ہونے دیے۔ ان 23 سالوں میں ہر اس سیاست دان کو منظرِ عام سے ہٹا دیا گیا جس نے پاکستان بنانے میں قابلِ ذکر خدمات انجام دی تھیں اور جو قیامِ پاکستان کے حقیقی مقاصد سے آگاہی و خلوص رکھتا تھا، اس کے بعد کنونش لیگ کے ذریعے دو نمبر سیاستدانوں کو پیدا کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا جو کبھی جمہوری اتحاد تو کبھی ق لیگ کی شکل میں پنپتا ہی رہا اور تا حال جاری وساری ہے۔

کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ لیاقت علی خان کو کیوں قتل کیا گیا اور ان کے قاتلوں کا سراغ آج تک کیوں نہیں لگ سکا؟ خواجہ ناظم الدین جنہوں نے قیامِ پاکستان میں نہایت اہم

کردار ادا کیا، کی اسمبلی کتنی آسانی سے ایک ایسے شخص نے توڑ دی جو قیامِ پاکستان کی راہ میں رکاوٹ تھا؟ حسین شہید سہروری کو کتنی سہولت کے ساتھ وزارتِ عظمٰی سے ہٹا کر گھر بھیج دیا گیا جنہوں نے تحریکِ پاکستان کے دوران قائدِ اعظم کی کال پر وزیرِ اعلی بنگال کی حیثیت سے تمام حکومتی مشینری کو ساتھ لے کر اس ''ڈائریکٹ ایکشن ڈے'' کو کامیاب بنانے میں فیصلہ کُن کردار ادا کیا تھا جو قیامِ پاکستان کی فوری وجہ بنا؟ انگریزوں کا پِٹھو سکندر مرزا جو بیک وقت فوجی اور سول بیوروکریسی کا نمائندہ تھا ان بنگالیوں پر کس طرح مظالم ڈھاتا رہا جن سے زیادہ قربانیاں قیامِ پاکستان کے لیے کسی نے بھی نہیں دی تھیں؟ ایوب خان جو تحریکِ پاکستان کے دوران انگریز آرمی میں افسر اور انگریزوں کے وفادار ترین لوگوں میں شامل تھا کتنے آرام سے اس جلیل القدر خاتون کو سیاست سے آؤٹ کرنے میں کامیاب ہو گیا جسے قوم متفقہ طور پر مادرِ ملت کے نام سے پکارتی ہے؟ پاکستان کی خاطر تن من دھن قربان کرنے والے بنگالیوں کے دلوں میں پاکستان کے خلاف اتنی نفرت کیوں پیدا ہوئی کہ وہ الگ ملک بنانے پر مجبور ہو گئے؟ جنرل ضیاالحق نامی 22 گریڈ کا ایک فوجی افسر اتنی جرات کہاں سے لایا کہ اس نے ''جمہوریہ'' پاکستان کے پہلے منتخب وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ ءدار پر لٹکا دیا؟ پیپلز پارٹی تین مرتبہ برسرِ اقتدار آکر بھی اپنے مقتول بانی کو انصاف کیوں نہ دلا سکی؟ پرویز مشرف نے ملک کو ڈبونے میں وہ رہی سہی کسر بھی پوری کر دی جو ضیاالحق نہ کر سکا، پھر بھی اسے گارڈ آف آنر کے ساتھ رخصت کیا گیا؟ پیپلز پارٹی کی موجودہ حکومت جسے تمام جماعتوں کی تائید و نصرت حاصل ہے بینظیر بھٹو کے قتل کی حقیقی تحقیقات سے کیوں گریزاں ہے؟ سترویں ترمیم جیسی مکروہ چیز کو ختم کرنے میں کیا امر مانع ہے؟ ہمارے موجودہ سیاستدان کس کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں بنے ہوئے ہیں؟ قدرتی وسائل کی فراوانی اور بہترین آب و ہوا کے باوجود پاکستان بجلی گیس اور روٹی کو کیوں ترس رہا ہے؟ ہماری افسر شاہی کی تربیت گاہیں آزادی کے 62 برس بعد بھی انہی روایات پر کیوں چل رہی ہیں جو انگریزوں نے ایک غلام قوم کے ''افسروں'' کے لیے

بنائی تھیں؟

جب کوئی یہ کہتا ہے کہ پاکستان کی جمہوریت کو نادیدہ قوتوں سے ایک مرتبہ پھر خطرہ لاحق ہوگیا ہے یا ہونے والا ہے تو یہ سوچ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ وہ قوتیں تا حال نادیدہ کی نادیدہ ہی ہیں جن کی دید کرکر کے ہم بصارت اور بصیرت دونوں ہی سے محروم ہوتے چلے جا رہے ہیں؟ اس سے پہلے کہ ہم مکمل طور پر اندھے ہو جائیں، ہمیں اندھیرے کو اندھیرا اور اجالے کو اجالا کہنے کی ہمت پیدا کر لینی چاہیے تاکہ دھندلا دھندلا ہی سہی لیکن اس منزل کا کوئی نشان نگاہ میں تو رہے جس کا خواب عظیم سیاستدانوں نے دیکھا تھا اور جس کی راہ میں بیوروکریٹ رکاوٹ بنتے رہے؟ یاد رکھیے کہ جب تک ہم غلام محمدوں، سکندر مرزوں، ایوب خانوں، ضیاالحقوں، پرویز مشرفوں اور طارق عزیزوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر لیتے اس وقت تک ممکن ہی نہیں کہ ترقی اور استحکام کی کوئی منزل ہماری منزل بن سکے کہ ہمارے اصل مجرم دراصل یہی لوگ ہیں۔

روزنامہ جناح 2009

مسلم کانفرنس کے سارے گناہ معاف

اسے میری خوش قسمتی کہیے یا بدقسمتی کہ مجھے اپنی سرکاری ملازمت کے دوران آزاد کشمیر کی اشرافیہ کو نایاب اور برہنہ زاویوں سے دیکھنے کا بڑا نادر موقع ملا کیونکہ میں چار برس تک کرپشن کی تحقیقات کے اعلی ترین اور طاقتور ترین ادارے میں ڈائریکٹر کے عہدے پر کچھ اسطرح فائز رہا کہ میرے گھر میں کھڑکیوں کے پردوں سے لیکر کرسیوں اور پلنگوں تک جو سامان موجود تھا وہ سب کباڑیے سے خرید کر لایا ہوا تھا۔شاید آپ یقین نہ کریں لیکن سرکاری گاڑی ہونے کے باوجود، میں اپنی فیملی سمیت کئی مرتبہ ویگن میں بیٹھ کر گاؤں جایا آیا کرتا تھا کیونکہ میری جائز آمدنی اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ ذاتی خرچ پر سرکاری گاڑی استعمال کرسکوں اور ''ذاتی استعمال'' کو''سرکاری استعمال'' ظاہر کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔اس دوران حکمرانوں کے ساتھ میرے تعلقات بڑے کشیدہ رہے، ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ مجھے کچا چبانے کی کوشش تک کی گئی لیکن میں بچ گیا۔

آخرکار میں نے ملازمت سے استعفی دے دیا لیکن اسکی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں سفید پوشی کی زندگی سے اُکتا گیا تھا اور نہ ہی یہ تھی کہ ''کرپٹ مافیا'' ہاتھ دھوکر پیچھے پڑا ہوا تھا بلکہ یہ تھی کہ کچھ اچھا کرنے کی کوئی کوشش بارآور ہوتی دکھائی نہیں دیتی تھی کیونکہ مجھ پر یہ عیاں ہو چکا تھا کہ جس محکمے میں تعینات ہوں اسے بنانے والی وفاقی حکومت کی نیت ہی صاف نہیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آزاد کشمیر کے ''حقیقی تاریخ جغرافیے'' سے مجھ جیسی واقفیت رکھنے والے لوگ زیادہ نہیں ہونگے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ آزاد کشمیر کے موجودہ سیاسی افق پر جن دو چار لوگوں کی وجہ سے مکمل اندھیرا نہیں ہو رہا ان میں سے ایک راجہ فاروق حیدر ہیں۔سیاست دان ہوکر بھی سچ بولتے ہیں، حکمران ہوکر بھی بددیانتی نہیں کرتے۔مشیر، سینئر وزیر اور قائم مقام وزیرِ اعظم تک رہے لیکن سفید پوش ہیں۔ان کی

حلال کھانے کی عادت، صاف گوئی اور بے باکی کو مدِ نظر رکھ کر اگر یہ کہا جائے کہ وزیرِ اعظم آزاد کشمیر کے عہدے پر انکی نامزدگی کسی اچھنبے سے کم نہیں تو یقین مانیے کہ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔

راجہ فاروق حیدر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تنقید سننے کی جرات رکھتے ہیں، یہی نہیں بلکہ ان میں ایسی سچی بات ماننے کا حوصلہ بھی ہے جو ان کی مرضی اور مفاد کے خلاف ہو۔اسی لیے تو ان کے تعلقات مجھ جیسے ''فضول آدمی'' کے ساتھ بھی کمزور نہیں ہوئے جو''زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند''۔ میں انہیں جتنا سراہتا ہوں اس سے کہیں زیادہ تنقید کا نشانہ بناتا ہوں لیکن وہ ہمیشہ بڑی خندہ پیشانی اور توجہ کے ساتھ میری بات سنتے بھی ہیں اور پڑھتے بھی ہیں۔

ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے ان کے ساتھ بات ہوئی تو میں نے کہا کہ آپ کی نامزدگی سے بے حد خوشی ہوئی لیکن یہ سوچ کر بڑا ڈر بھی لگ رہا ہے کہ کہیں آپ بھی اپنے پیش رووٗں جیسے وزیرِ اعظم ہی ثابت نہ ہوں؟ آپ اور باقیوں میں جو فرق بحیثیت انسان قائم رہا وہ بحیثیت وزیرِ اعظم کہیں ختم نہ ہو جائے؟ آپ کے وزیرِ اعظم بننے کے بعد آپ پر تنقید اور بھی سخت ہو جائے گی کیونکہ پہلے تو آپ کے''براہِ راست'' اختیار میں کچھ نہیں ہوتا تھا لیکن اب تو ہوگا؟ اور وہ بولے کہ اگر وزیرِ اعظم بن گیا تو تنقید کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہوگی۔ میں نے کہا کہ وزیرِ اعظم کیوں نہیں بنیں گے، ممبران کی واضح اکثریت آپ کے ساتھ ہے اور وفاقی حکومت عدم اعتماد کے جمہوری عمل میں رکاوٹ ڈالنے کی سنگین غلطی کیوں کرے گی، وہ بھی ان حالات میں جبکہ پاکستان اپنی سلامتی کے نازک ترین موڑ سے گزر رہا ہے اور اسے مذید بحرانوں میں مبتلا کرنے کے بجائے بحرانوں سے نکالنے کی ضرورت ہے؟ دیگر مسائل کیا کم ہیں جو وفاق اپنے لیے خوامخواہ کا ایک مسئلہ اور کھڑا کرے گا؟

سابق وزراء اعظم نے آزاد کشمیر کے ساتھ جو سب سے بڑا ظلم کیا وہ یہ ہے کہ اسے برادری ازم کا گڑھ بنا کر رکھ دیا، پچھلے تین حضرات کی مثال ہی لے لیجئے جن میں ایک کٹر راجہ، دوسرے کٹر عباسی اور تیسرے کٹر سدھن کے طور پر ابھر کر ریاستی یکجہتی کے اُجلے دامن کا بدنما داغ بن گئے؟ راجہ فاروق حیدر کو سب سے زیادہ احتیاط برادری ازم سے ہی برتنے کی ضرورت ہے، انہیں اس حقیقت سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہیے کہ عوام کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انہیں لوٹنے والا کوئی سدھن یا راجہ ہے یا کسی اور ''اعلیٰ نسل'' سے تعلق رکھتا ہے، عوام کہتے ہیں کہ چاہے کوئی ''بھنگی یا میراثی'' ہی وزیرِ اعظم یا وزیر کیوں نہ لگ جائے لیکن وہ کوئی اچھا کام تو کرے، ایسے سدھنوں، راجوں مہاراجوں، عباسیوں، چوھدریوں کا کوئی کیا کرے جنہیں ذاتی مفاد پرستیوں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ کسی قومی مفاد کے بارے میں سوچ سکیں، جن کا مقصد صرف اقتدار کا حصول ہے جس کے لیے چاہے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑ جائے؟ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ اگر کسی طاقتور برادری کا فرد ہونا ''میرٹ'' نہیں ہوسکتا تو ''ڈی میرٹ'' بھی نہیں ہونا چاہیے، سیدھی سی بات ہے کہ کسی کو کہیں لگاتے وقت صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ وہاں لگنے کا اہل ہے یا نہیں، اگر ہے تو چاہے کسی برادری کا ہو اور اگر نہیں ہے تو بھی چاہے کسی برادری کا ہو؟

خدا کرے کہ راجہ فاروق حیدر کے اوصاف پکا وزیرِ اعظم بننے کے بعد بھی ان میں موجود رہیں کیونکہ پکا وزیرِ اعظم بننے کے بعد انسان کے اردگرد بلا وجہ مسکرا مسکرا کر ''سب اچھا ہے، سب اچھا ہے'' کہنے والے خوشامدی، مفاد پرست اور کرپٹ عناصر کا حصار قائم ہو جاتا ہے جن کے طفیل جناب وزیرِ اعظم (باہر کی دنیا سے کٹ کر) ایک ایسی دنیا میں رہنے کے عادی ہو جاتے ہیں جو ان کے سوا کسی کو دکھائی نہیں دیتی، تا آنکہ اقتدار چھن جاتا ہے اور وہ ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں۔

بہر طور وزارتِ عظمیٰ کے لیے راجہ فاروق حیدر کی نامزدگی پر مجھے عظیم شاعر اور

ادیب سید ضمیر جعفری کے وہ الفاظ یاد آ گئے جو انہوں نے آزاد کشمیر کے بانی صدر غازیء ملت سردار محمد ابراہیم خان کو چھوتھی مرتبہ آزاد کشمیر کا صدر نامزد کیے جانے پر میرے نام اپنے ایک خط میں لکھے تھے، ضمیر صاحب نے لکھا تھا کہ ''میں نے تو جب یہ سنا کہ پیپلز پارٹی انہیں صدرِ ریاست کے عہدے کے لیے نامزد کر رہی ہے تو میں نے اس پارٹی کے سارے گناہ معاف کر دیے''۔ میرے ساتھ بھی جعفری صاحب والا معاملہ ہی ہوا، فرق صرف اتنا ہے کہ میں نے پیپلز پارٹی کے نہیں بلکہ مسلم کانفرنس کے سارے گناہ معاف کر دیے۔

روزنامہ جناح 14/10/2009

کالا کاروبار

یہ بات کئی مرتبہ مشاہدے میں آتی ہے کہ ڈاکٹر کی تجویز کردہ (ایلوپیتھک) ادویات منہ مانگے داموں خرید کر ہدایت کے عین مطابق استعمال کی گئیں لیکن افاقہ نہیں ہوا بلکہ بعض اوقات تو صحت اور بھی خراب ہوگئی، اسکی بنیادی وجہ ان ادویات کا غیر معیاری ہونا ہے۔

پاکستان میں ایلوپیتھک ادویات کی مارکیٹ تقریباً ڈیڑھ ارب ڈالر کی ہے جس میں ہر سال 12 سے 15 فیصد کا اضافہ ہو رہا ہے اور اس اضافے کی وجہ آبادی اور ماحولیاتی آلودگی کے باعث بڑھنے والی بیماریاں ہیں۔ اس انڈسٹری میں 350 کے لگ بھگ دواساز کمپنیاں ہیں جو تقریباً 50,000 رجسٹرڈ ناموں کی مختلف ادویات بناتی ہیں، ان کمپنیوں میں سے اکثر کا معیار اتنا خراب کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔

پہلا مسئلہ دواسازی کے ماحول کا ہے جو صاف ستھرا نہ ہو تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی مخصوص دوا کو بناتے وقت اس میں جراثیم شامل ہو جائیں گے اور یہ آپ کو اس بیماری سے تو نجات دلا دے جس کے لیے آپ نے اسے استعمال کیا ہو لیکن کسی دوسری بیماری میں مبتلا کر دے، بالکل ویسے ہی جیسے بعض لوگ ڈینٹل کلینک سے اپنا علاج کروا کر دانت کی تکلیف سے تو چھٹکارا پا لیتے ہیں لیکن سٹیریلائزیشن (Sterilization) کا مناسب انتظام نہ ہونے کی وجہ سے ڈینٹسٹ کے اوزار انہیں ہیپاٹائٹس بی یا سی جیسے جان لیوا امراض میں مبتلا کر دیتے ہیں کیونکہ یہ اوزار پہلے کسی ایسے مریض پر استعمال ہو چکے ہوتے ہیں جو ان امراض کا شکار ہوتا ہے اور اس پر استعمال ہونے کے بعد انہیں اس ماحول (Autoclave) میں نہیں رکھا گیا ہوتا جو ان امراض کے جراثیموں کا خاتمہ مکمل طور پر کرتا ہے یا جس طرح آپریشن تھیٹر کا ماحول جراثیم سے پاک نہ ہو تو آپ جس چیز کا آپریشن کروائیں گے وہ تو ٹھیک ہو جائے گی لیکن آپ کسی دوسری بیماری میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس بات کو اس مثال سے بھی باآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ جس ہانڈی میں کڑاہی گوشت پکایا گیا ہو اگر اسے اچھی طرح صاف کیے بغیر اس میں

سبزی یا دال یا کوئی بھی دوسری چیز پکائی جائے گی تو اس میں بھی کڑاہی کا ذائقہ آجائے گا، اسی طرح جس جگہ پنسلین بنائی جا رہی ہو اگر اسے اچھی طرح صاف کیے بغیر پیراسیٹامول بنانے کے لیے استعمال کیا جائے گا تو پیراسیٹامول میں پنسلین کی آمیزش بھی ہو جائے گی اور وہ سر کا ٹھیک کرنے کے بجائے اسے مذید تیز کر سکتی ہے۔اسی لیے اچھی دواساز کمپنیاں جن کی تعداد بہت ہی کم ہے، Clean Environment کا خصوصی خیال رکھتی ہیں۔ دواسازی کے ماحول کو ہر قسم کے ذرات اور جراثیم سے پاک کرنے کے لیے جو پلانٹ لگایا جاتا ہے اسے ہیٹنگ وینٹیلیشن ائرکنڈیشننگ سسٹم کہتے (HVAC) ہیں اور یہ دیکھنے کے لیے کہ سسٹم صحیح کام کر رہا ہے یا نہیں، مخصوص قسم کے سازوسامان کی ضرورت ہوتی ہے جسے ''انوائرمنٹ مانیٹرنگ اکوپمنٹ'' کہتے ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے وزن کم کرنے کے لیے مختلف قسم کی excercises اور ڈائٹ پلان follow کیے جاتے ہیں لیکن یہ دیکھنے کے لیے کہ وزن کم ہو بھی رہا ہے یا نہیں، وزن کرنے والی مشین کی ضرورت ہوتی ہے۔انوائرمنٹ مامیٹرنگ اکوپمنٹ میں ایسے آلات شامل ہوتے ہیں جو فضا میں موجود ذرات و جراثیم کو شمار کرتے ہیں، ہوا کا حجم اور اس کی رفتار بتاتے ہیں، درجہ حرارت اور نمی کی پیمائش کر کے اس کا پرنٹ بھی دیتے ہیں۔ یہ اکوپمنٹ ادویات سازی کے ماحول کو معیار کو مطابق بنانے کے لیے ضروری ہوتا ہے ،اس کی مالیت 30 لاکھ سے زیادہ نہیں اور اس پر 17 کروڑ پاکستانیوں کی صحت کا دورومدار ہے لیکن وزارتِ صحت کی کسی ایک ڈرگ انسپکشن ٹیم کے پاس بھی یہ سازوسامان موجود نہیں البتہ افسرانِ کرام کے پاس اس سے کہیں زیادہ مالیت کی پراڈو گاڑیاں ضرور موجود ہیں۔ جو کمپنیاں کلین انوائرنمنٹ کا خیال نہیں رکھتیں، انکے یہاں اور تو اور فرش، دیواروں اور چھت پر اس Chemical Resistant Sheet تک کا استعمال نہیں کیا جاتا جو ضروری ہوتی ہے اور اس کی جگہ ٹائلیں یا پلستر لگا دیا جاتا ہے۔

دوسرا مسئلہ ادویات سازی میں استعمال ہونے والے پانی کا ہے جو جراثیم سے پاک

نہ ہوتو تو ادویات کے ذریعے خون میں شامل ہوکر طرح طرح کی بیماریوں کا سبب بن سکتا ہے۔اس پانی کو جراثیم سے پاک کرنے کے لیے بہت ہی اعلی کوالٹی کے فلٹرز کی ضرورت ہوتی ہے جو پانی کو کئی مراحل سے گزار کر معیار کے مطابق بناتے ہیں جبکہ کئی کمپنیاں کم کوالٹی کے فلٹرز استعمال کرتی ہیں۔

تیسرا مسئلہ اجزائے ترکیبی کا ہے جسے یوں سمجھ لیجئے کہ ہر دوا میں کچھ متحرک اور کچھ غیر متحرک اجزا ہوتے ہیں،غیر متحرک اجزا کا کام متحرک اجزا کو قابلِ قبول اور کارآمد بنانا ہے۔مثلاً 1000 ملی گرام پیراسیٹامول کی گولی میں پیراسیٹامول کی مقدار صرف 500 ملی گرام ہوتی ہے یہی اس دوا کا متحرک جز ہے اور باقی 500 ملی گرام غیر متحرک اجزا ہوتے ہیں جو دوا کے رنگ اور اسکی شکل سے لے کر اس بات تک کے ذمہ دار ہیں کہ اسے انسانی جسم کے اندر کب، کہاں اور کتنی دیر میں حل ہونا ہے۔متحرک یا غیر متحرک اجزا کی مقدار معیار سے کم یا زیادہ ہو یا انہیں بنانے کے صحیح عمل سے نہ گزارا گیا ہو تو دوا غیر معیاری کہلائے گی اور اسے کھانے سے یا تو فائدہ نہیں ہوگا یا الٹا نقصان ہوگا، وہ اسطرح کہ جو دوا چھوٹی آنت یا بڑی آنت میں حل ہونے کے لیے بنائی گئی ہو وہ معدے میں حل ہو جائے گی یا معدے والی چھوٹی یا بڑی آنت میں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوا پوری حل ہی نہ ہو۔

چوتھا مسئلہ خام مال کی سٹوریج سے لے کر دوا کی ترسیل تک اس ٹھنڈے ماحول کو یقینی بنانا ہے جو اسے ذود اثر رکھنے کے لئے لازمی ہوتا ہے۔مثلاً کسی دوا کو اگر 15 سے 30 ڈگری سینٹی گریڈ کی ضرورت ہے تو جس گاڑی میں اسے میڈیکل سٹور تک پہنچایا گیا یا جس شلف میں وہ پڑی ہے کیا وہاں یہ درجہ حرارت موجود ہے؟ یا جس ویکسین کو 4 سے 5 ڈگری سینٹی گریڈ پر رکھنا ہے کیا اس کے لیے وہ مخصوص فرج استعمال کیا جا رہا ہے جو درجہ حرارت کو دو مخصوص حدوں کے درمیان رکھنے کی سہولت سے آراستہ ہے؟ اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ وطنِ عزیز میں کتنے میڈیکل سٹور ایسے ہونگے جہاں ایسا ماحول اور ایسے فرج دیکھنے کو ملتے ہیں؟

ادویات سازی کے رہنما اصول Good Manufacturing Practices تو 1998 سے نافذ ہیں جو بین الاقوامی معیار کے عین مطابق بھی ہیں لیکن ان پر عمل درآمد ویسے نہیں ہو رہا جیسے ہونا چاہیے، جس کی چند وجوعات ڈرگ انسپکٹروں کی کم تعداد، کم تنخواہ، کمزور قوانین، کم سزائیں اور ادویات ساز کمپنیوں میں ان کی حصہ داریاں ہیں۔ یہ ''شراکت'' زیادہ تر عزیزاقارب کے نام پر کی جاتی ہیں مثال کے طور پر وفاقی وزارتِ صحت کے ایک اعلی افسر کے بھائی، بیٹے اور داماد تینوں کے نام پر ایک ایک فیکٹری قائم شدہ ہے۔

وطنِ عزیز میں کوئی ایک دواساز کمپنی بھی بین الاقوامی معیار کے کسی اعلی ادارے سے منظور شدہ نہیں اور ہمارے یہاں بے شمار لوگ غیر معیاری ادویات کے کالے کاروبار میں ملوث ہیں جو منشیات فروشی سے بھی سنگین ہے کہ منشیات فروش تو موت کے نام پر ہی موت کا دھندہ کرتے ہیں جبکہ یہ حضرات تو زندگی کے نام پر موت بیچتے ہیں، انہیں سرِ عام پھانسی پر لٹکا کر بھی کیا اس نقصان کا ازالہ کیا جاسکتا ہے جسکا باعث یہ بنتے ہیں۔

روزنامہ جناح، 1/5/2009

بھوک ننگ اور جھلستی دھوپ

کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ دن بہت دور نہیں جب سائنسدانوں کے بقول زمین کا درجہ حرارت اسقدر بلند ہو جائے گا کہ سیلاب اور قحط روزمرہ کا معمول بن جائیں گے، انسان اناج کے دانے دانے کو ترسے گا، سلفر ڈائی آکسائیڈ کا اخراج اس قدر بڑھ جائے گا کہ سلفر کا تیزاب بارش کی طرح زمین پر برسے گا، بڑے بڑے نایاب پودے اور جڑی بوٹیاں (جن سے بیش قیمت ادویات تیار کی جاتی ہیں) صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے، ہوا میں آکسیجن بہت کم ہو جائے گی جو زندگی دیتی ہے، کاربن ڈائی آکسائیڈ بہت زیادہ ہو جائے گی جو موت دیتی ہے اور اس سب کی بنیادی وجہ آبادی کی کثرت ہو گی۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ کثرتِ آبادی کا تعلق صرف آبادی کے ساتھ ہوتا ہے جبکہ اس کا تعلق جتنا آبادی کے ساتھ ہوتا ہے اتنا ہی وسائل کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور یہ طے کئے بغیر کہ کسی علاقے کی آبادی اور وہاں کے وسائل میں تناسب کیا ہے، یہ طے نہیں کیا جا سکتا کہ وہ علاقہ کثرت آبادی کا شکار ہے یا نہیں؟ زیادہ وسائل کے حامل ممالک میں زیادہ آبادی سے بھی آبادی کی کثرت نہیں ہوتی لیکن کم وسائل کے حامل ممالک میں کم آبادی سے بھی آبادی کی کثرت ہو جاتی ہے۔ مثلاً افریقہ کی فی مربع کلومیٹر آبادی فرانس کی فی مربع کلومیٹر آبادی سے تقریباً پانچ گنا کم اور ہانک کانگ کی فی مربع کلومیٹر آبادی سے تقریباً 250 گنا کم ہے لیکن ماہرین کے مطابق افریقہ میں کثرت آبادی کا مسئلہ جتنا سنگین ہے اتنا فرانس اور ہانگ ہانگ میں نہیں ہے کیونکہ افریقہ کے ایک مربع کلومیٹر میں لوگوں کو سنبھالنے اور پالنے کی صلاحیت فرانس اور ہانک کانگ کے ایک مربع کلومیٹر سے کہیں کم ہے۔

کوئی علاقہ کثرت آبادی کا شکار اس وقت ہوتا ہے جب اس کے وسائل اس کی آبادی کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہوں یا جب وہاں کی آبادی وہاں کے وسائل پر بوجھ بن کر انہیں اسطرح تباہ کرنا شروع کر دے کہ وہ آج جتنے لوگوں کے لئے کافی ہیں کل اتنے لوگوں کے لئے

کافی نہ رہیں یا جب وہاں کے لوگ اپنے وسائل کے بجائے کسی دوسرے کے وسائل پر زندہ رہنا شروع کر دیں۔افریقہ اس لئے کثرت آبادی کا شکار ہے کہ وہاں وسائل و ماحول کی گنجائش سے زیادہ لوگ آباد ہیں۔ امریکہ اس لئے کثرت آبادی کا شکار ہے کہ وہاں کارخانوں کے بڑھنے سے زمین بنجر ہو رہی ہے، پانی کے ذخائر کم ہو رہے ہیں اور ماحولیاتی آلودگی بڑھ رہی ہے یعنی امریکہ کے وسائل و ماحول آج جتنے لوگوں کے لئے کافی ہیں کل اتنے لوگوں کے لئے کافی نہیں رہیں گے اور ہالینڈ اس لئے کثرت آبادی کا شکار ہے کہ وہاں استعمال ہونے والا خام مال دوسرے ممالک سے لایا جاتا ہے یعنی وہاں کے لوگ دوسروں کے وسائل پر زندہ ہیں۔

دنیا کو ایک اکائی کی حیثیت سے دیکھا جائے تو کثرتِ آبادی کا مسئلہ اور بھی سنگین نوعیت اختیار کر لیتا ہے کہ دنیا کی آبادی گزشتہ 70 برس کے دوران 2.7ارب سے بڑھکر 6ارب سے زیادہ ہو چکی ہے اور شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ اگر فی ماں بچوں کی اوسط تعداد جو 1990-96 میں 3 تھی، 2035-40 تک کم ہو کر 2.1 ہو جائے تو بھی اقوامِ متحدہ کے مطابق دنیا کی آبادی 2025 میں 8.04ارب اور 2050 میں 9.37ارب ہو جائے گی جبکہ کرہ ءارض میں زیادہ سے زیادہ سات ارب لوگوں کو پالنے اور سنبھالنے کی گنجائش موجود ہے۔دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اگر تمام کے تمام لوگ اس روش کو اپنا لیں جس پر چل کر اگلے 28 سے 33 سال تک کسی ماں کے بچوں کی تعداد بھی دو سے زیادہ نہ رہے (جو بظاہر ناممکن دکھائی دیتا ہے) تو بھی دنیا کثرتِ آبادی کا شکار ہو جائے گی۔

پاکستان کی آبادی لگ بھگ 60 برس میں 3 کروڑ 30 لاکھ سے بڑھکر 17 کروڑ تک پہنچ چکی ہے، ہمارے یہاں فی ماں بچوں کی اوسط تعداد 5 ہے اور ہم آبادی میں اضافے کے اعتبار سے دنیا کے 10 خطرناک ترین ممالک کی فہرست میں تیسرے نمبر پر شمار کیے جاتے ہیں۔دیگر ممالک ہندوستان، چین، نائجیریا، ایتھوپیا، انڈونیشیا، امریکہ، بنگلہ دیش، زیرے

اور ایران ہیں۔اقوامِ متحدہ کے تازہ ترین اعداد وشمار کے مطابق 1995 سے 2025 تک ہندوستان ،چین اور پاکستان کی آبادی میں بالترتیب 40 کروڑ 10 لاکھ،26 کروڑ اور 13 کروڑ 30 لاکھ افراد کا اضافہ ہوگا،جس سے ان ممالک میں کثرتِ آبادی کا مسئلہ بدترین نوعیت اختیار کر جائے گا۔

دنیا کے 4 ارب 80 کروڑ لوگ ایسے ہیں جو غریب ممالک میں رہتے ہیں،تین ارب ایسے ہیں جو روزانہ دو ڈالر بھی نہیں کما سکتے جبکہ ایک ارب بیس کروڑ ایسے ہیں جنکی یومیہ آمدن ایک ڈالر بھی نہیں ۔ان اعداد وشمار کو ذہن میں رکھیے اور سوچیے کہ اگر کثرتِ آبادی کے مسئلے کو فوری طور پر حل نہ کیا گیا تو اگلے 17 سے 42 برس کے دوران دنیا کا حال کیا ہوگا؟

اگر دنیا موجودہ روش پر ہی چلتی رہی تو اقوامِ متحدہ کے مطابق صرف 10 ممالک فی ماں بچوں کی اوسط تعداد کو 1.84 اور 2.1 کے درمیان لاسکیں گے جبکہ دنیا کے تمام ممالک اس اوسط تعداد کو 1.57 تک بھی لے آئیں تو بھی 2025 میں دنیا کی آبادی 7.5 ارب ہوگی اور یہ تو ہم جان ہی چکے ہیں کہ دنیا زیادہ سے زیادہ سات ارب لوگوں کا بوجھ اٹھا سکتی ہے۔

کاش انسان اس آسان سی حقیقت کا ادراک کر سکے کہ اس کے لیے کرہ ءارض کی حیثیت ماں سے بھی بڑھکر ہے کیونکہ ہم ماں کے بغیر تو زندہ رہ سکتے ہیں لیکن کرہ ءارض کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ذرا دیر کے لیے سوچیے کہ انسان اپنی ماں کے لیے کیا کچھ نہیں کر گزرتا تو جو ماں سے بڑھکر ہے اس کے لیے کیا کچھ نہیں کر گزرنا چاہیے؟ خدارا کثرتِ آبادی کی روش کو ترک کر دیجئے بصورتِ دیگر اس دن کے لیے تیار رہیے جب انسان کو کھانے کے لئے بھوک، پہننے کے لئے ننگ اور اوڑھنے کے لئے جھلستی دھوپ کے سوا کچھ میسر نہیں ہوگا۔

روزنامہ جناح،5/1/2010

فارن پالیسی

ہمارے ملک کی خارجہ پالیسی کے بارے میں ابنِ انشا نے کیا خوب کہا تھا کہ اسے فارن پالیسی اس لیے کہتے ہیں کہ یہ فارن سے آتی ہے۔امریکہ کے سرمایہ دارانہ نظام کو روس کے اشتراکی نظام سے شدید خطرہ لاحق ہواتو فارن سے آنے والی پالیسی کے مطابق ''جہاد'' ہمارا قومی نصب العین بن گیا اور آئین کے خلاف ''جہاد'' کرنے والے ''مردِ مومن، مردِ حق'' جنرل ضیاالحق ،ایک منتخب وزیرِاعظم کو قتل کروا کر ہمارے ''امیرالمومنین'' بن گئے۔ مجلسِ شوریٰ کا قیام عمل میں آ گیا اور اس قسم کی شریعت کا نفاذ ہماری اولین ترجیح قرار پایا جسکی رو سے کمیونزم اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے لیکن یہ کمیونزم چین والا نہیں تھا بلکہ روس والا تھا کیونکہ چین امریکہ کے ساتھ ہاتھ ملا چکا تھا۔

کیا ہم نے کبھی یہ سوچا کہ سرد جنگ کے دوران ایک طرف تو ہم روس کے خلاف اپنی جہدوجہد کو اس لیے عبادت کا درجہ دیتے تھے کہ وہ ایک کمیونسٹ ملک ہے لیکن دوسری طرف ''پاک چین دوستی زندہ باد'' کے نعرے لگانے میں بھی بڑا فخر محسوس کرتے تھے؟ کیا چین کمیونسٹ ملک نہیں؟ اگر روس سے ہماری دشمنی کا سبب مذہب تھا تو چین کے ساتھ گہری دوستی کی وجہ کیا ہے؟ کیا چین مسلمان ملک ہے؟ آخر ہم یہ بات کب سمجھیں گے کہ روس کے ساتھ ہماری دشمنی کی وجہ اسلام یا کمیونزم نہیں تھا بلکہ امریکی مفادات تھے؟ امریکہ سے آنے والی فارن پالیسی کے تحت جنرل ضیاالحق کے ''سنہرے'' اسلامی دور میں ''طالبانائزیشن'' کو فروغ دینے والے جن اداروں کا جال پاکستان میں بچھایا گیا ان سے فارغ التحصیل ہونے والے معصوموں کے دل و دماغ میں روسی کمیونزم کے خلاف اتنی نفرت پیدا کی گئی کہ لفظ کمیونسٹ (دہریہ) ہمارے یہاں ایک ننگی گالی بن کر رہ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ''سی آئی اے'' (CIA) کے فنڈ سے جہاد کے حق میں لکھی گئی کتابیں جگہ جگہ تقسیم کی جاتی تھیں، بین الاقوامی میڈیا روس کے خلاف سرگرم عمل جہادیوں کی عظمت کے گیت گاتا تھا اور ''ہالی ووڈ'' کی فلم

انڈسٹری میں روس کے خلاف مسلمان مجاہدوں اور امریکیوں کے ''عظیم جنگی اتحاد'' کی تعریف میں فلمیں بنائی جاتی تھیں۔ ایک فلم میں اور تو اور ''جان ریمبو'' جیسے مصروف اور نایاب امریکی فلمی کمانڈو تک کو افغانستان میں مسلمان مجاہدین کے ساتھ مل کر روس کے دانت کھٹے کرتے ہوئے دکھایا گیا۔

افغانستان میں روس کی پسپائی کے بعد امریکہ اور اسے چلانے والے سرمایہ داروں کی ترجیحات بدل گئیں۔ ایک طرف تو روس کے خلاف جہاد کرنے والے اسامہ بن لادن جیسے ''ہیرو'' انکے لیے بیکار ہو گئے اور دوسری طرف انکی معیشت جس کا زیادہ تر انحصار جنگی سازوسامان کی فروخت پر تھا، اس اعتبار سے خطرے میں پڑ گئی کہ سرد جنگ کے خاتمے سے بین الاقوامی مارکیٹ میں اسلحہ و بارود کی خرید میں شدید کمی واقع ہو گئی۔ چناچہ ایجنٹ صدام حسین کے ذریعے کویت پر حملے کا ڈرامہ رچا کر مشرق وسطی اور وہاں کے تیل تک پہلے رسائی حاصل کر لی گئی جس سے معیشت کو کچھ سہارا تو مل گیا تھا لیکن امریکی سول سوسائٹی نے امریکی جارحیت کی شدید مخالفت کی تھی اور صدام والے ڈرامے کو بھی ہدفِ تنقید بنایا۔ معیشت کو مزید سہارا دینے اور اپنے ڈرامے کو سچا ثابت کرنے کے لیے عراق پر دوبارہ حملہ کر دیا گیا لیکن یہ حملہ جھوٹ موٹ کا نہیں تھا بلکہ سچ مچ کا تھا۔ صدام حسین سے جو کچھ حاصل کیا جانا تھا وہ حاصل کیا جا چکا تھا لہذا اسے اسکی وفاداری سمیت اپنے مفادات پر قربان کر دیا گیا بالکل ویسے ہی جیسے ''مردِ مومن مردِ حق'' کا قصہ پاک کیا گیا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں مشہور زمانہ ''دہشتگردی'' کا واقعہ رونما کیا گیا اور اسے خوب بڑھا چڑھا کر اسامہ بن لادن کے ذمے ڈال دیا گیا۔ اس سے امریکہ کو تین فائدے ہوئے۔ پہلا یہ کہ ایک بار پھر خوف و ہراس اور جنگ کی کیفیت پیدا کر کے اسلحے کی نئی مارکیٹ تخلیق کی گئی۔ دوسرا یہ کہ افغانستان میں اپنی حکومت بنانے کا خواب دیکھنے والے کل کے مجاہدوں اور آج کے دہشت گردوں کو کچلنے اور جنوبی ایشیاء میں اپنی موجودگی کو برقرار رکھنے کی

وجہ تراش لی گئی تا کہ یہاں موجود رہ کر پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر قابو پانے اور وسط ایشیا کے قدرتی وسائل ہڑپنے کے علاوہ ہندوستان کی مدد سے چین کے لیے مشکلات پیدا کی جاسکیں جو اب امریکہ کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن چکا ہے۔اور تیسرا یہ کہ اپنی سول سوسائٹی کے سامنے سرد جنگ ختم ہونے کے بعد بھی ''دفاع'' پر خرچ ہونے والی خطیر رقم کا ایک ٹھوس جواز پیش کر دیا گیا۔

نئی ترجیحات کے مطابق اسامہ بن لادن کا ایسا تعاقب شروع کر دیا گیا جس میں اس کے قدم تو دکھائی نہیں دیتے لیکن قدموں کے نشان ضرور دکھائی دیتے ہیں تا کہ اسے جہاں سے چاہے بھگا کر جہاں چاہے پہنچایا جاسکے۔۔امریکہ کے تخلیق کردہ ''مجاہدین'' امریکہ کے خلاف ''جہاد'' میں مصروف ہوگئے اور امریکہ انکے خلاف ''دہشت گردی'' کی جنگ لڑنے لگا۔فارن سے آنے والی فارن پالیسی کے مطابق اب ہمارا مذہب ''روشن خیال اعتدال پسندی'' ہوگیا۔جن لوگوں نے اسلام کے نام پر ہمارے ہاتھوں میں بندوقیں اور میزائل تھمائے تھے انہی کی زبانی ہمیں یہ پتہ چلا کہ جہادی کلچر والا اسلام حقیقی اسلام نہیں بلکہ دہشت گردی ہے، حقیقی اسلام تو وہ ہے جو ''رواداری'' سکھاتا ہے اور وہ بھی ایسی کہ اگر کوئی منہ کے ایک طرف تھپڑ رسید کرے تو دوسری طرف سامنے کر دی جائے۔چنانچہ صوفی کونسل قائم ہوگئی۔اس کونسل کا قیام تو تعجب کا باعث نہیں تھا لیکن یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ ''صلح کروانے کے ماہر'' ہمارے ''منجھے ہوئے'' سیاستدان چوھدری شجاعت حسین ایک صوفی ہیں اور میاں یوسف صلاح الدین جنہیں عام طور پر ان کی پتنگ بازی کے حوالے سے عقیدت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، بھی دنیائے تصوف کے باسی ہیں۔اولذکر کو کونسل کا سرپرست اور ثانی الذکر کو ان کا نائب مقرر کیا گیا ہے۔کونسل کا پہلا اجلاس حضرت علامہ اقبالؒ کی یاد میں برپا ہوا جس میں تمام سرکردہ حکومتی عہدیداران نے ویسے ہی جوش وخروش سے شرکت کی جیسے کسی زمانے میں جہادی کلچر کو فروغ دینے والے سیمیناروں میں کیا کرتے تھے۔اجلاس میں تصوف کے

ساتھ شاعر مشرق کی گہری وابستگی پر خوب روشنی ڈالی گئی۔ اجلاس کے اختتام پر ایک قوال نے اقبال کا کلام پیش کیا جس میں یہ اشعار بھی سنائے گئے (جن پر ذرا سا بھی غور کر لیا جاتا تو اس موقع پر کبھی پیش نہ کیا جاتا) کہ

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن تصوف شریعت کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

ہم نے وہ دن دیکھا جب امریکہ نے قدامت پرستی کو دفترِ خارجہ کا ایمان بنا دیا، وہ دن بھی دیکھا جب امریکہ نے ہی روشن خیال اعتدال پسندی کو ہماری خارجہ پالیسی کا مرکز ومحور بنا دیا اوران دونوں کے تصادم سے پیدا ہونے والی تباہی و بربادی بھی ہماری نگاہ سے پوشیدہ نہیں جس نے زندگی کو موت سے بدتر بنا دیا ہے۔ پھر بھی ہمیں اس حقیقت کا ادراک حاصل نہیں ہو سکا کہ بین الاقوامی تعلقاتِ عامہ میں مذہب کا عمل دخل ویسا نہیں ہوتا جیسا ہمارے یہاں عام طور پر سمجھا جاتا ہے، نہ ہی ہم یہ سیکھ سکے کہ فارن سے آنے والی فارن پالیسی ''فارنرز'' (foreigners) ہی کے مفادات کی نگہبان ہوا کرتی ہے۔

آیئے سب مل کر یہ دعا کریں کہ ہماری فارن پالیسی، فارن سے آنے کے بجائے پاکستان میں بننا شروع ہو جائے اور اس کا مقصد کسی دوسرے کے نہیں بلکہ ہمارے اپنے مفادات کا تحفظ ہو۔ آمین۔

روزنامہ خبریں، 18/8/2007

ہمارا نظریہ کیا تھا اور کیا ہے؟

''قوم'' شروع شروع میں ایک ''نسل'' کے لوگوں کو کہا جاتا تھا (قوم کے لیے Nation کا لفظ اسی لیے استعمال کیا گیا کہ لاطینی زبان میں اس لفظ کا مادہ Natus ہے جس کے معنی ہیں ''پیدائش'') لیکن ''سیاسیات'' کی ترقی کے ساتھ ساتھ ''قوم'' کا مفہوم بھی وسیع ہوتا چلا گیا اور یہ لفظ ان لوگوں کے لیے بھی بولا جانے لگا جن کا تعلق بے شک ایک نسل سے نہ ہو لیکن وہ ایک طرح کی ثقافت رکھتے ہوں، ایک زبان بولتے ہوں یا ایک ریاست کے شہری ہوں، اسکے برعکس اسلام نے ایک فکر اور ایک عمل کے حامل لوگوں کو قوم کہہ کر پکارا۔ قومیت کی اسی بنیاد کو برصغیر کے مسلمانوں نے اپنایا جو نہ ایک نسل سے تعلق رکھتے تھے نہ ایک ثقافت کے حامل تھے اور نہ ہی ان کی مادری زبان ایک تھی، البتہ شہری وہ ایک ہی ریاست کے تھے لیکن انہوں نے وحدتِ فکر و عمل کے تحت دیگر شہریوں سے علیحدگی اختیار کرنے کی خواہش ظاہر کی اور اپنے لیے ایک نئی ریاست کا مطالبہ کیا۔ علامہ محمد اقبال نے کہا تھا کہ ''مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے نہ اشتراکِ وطن'' (ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر)۔ یہی بات انہوں نے اشعار میں یوں کہی کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
اُن کی جمیعت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمیعت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمیعت کہاں
اور جمیعت ہوئی رخصت تو ملت بھی کہاں

اس کے جواب میں مہاتما گاندھی نے (''قوم'' کے مروجہ مفہوم کو ذہن میں رکھ کر)

بڑی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے قائدِ اعظم کو ایک خط میں لکھا کہ ''میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ آباؤاجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان، اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کی آمد کے بعد بھی ایک ہی قوم رہنا چاہیے، خواہ اس کے سپوتوں کی ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو'' (15 ستمبر 1944)۔

قائدِ اعظم اپنا موقف ان الفاظ میں واضح کر چکے تھے کہ ''مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمہء توحید ہے، وطن نہیں اور نہ ہی نسل ہے، ہندوستان کا پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا، وہ جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا، ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آ گئی'' (علی گڑھ 8 مارچ 1944)۔

آخرکار ہندوؤں کو مسلمان قومیت کے اس تصور کو ماننا ہی پڑا جسے ماننے کی تلقین انہیں، کانگریس کمیٹی کے ممتاز رکن این سی دت، اخبار میں چھپنے والے اپنے ایک کھلے خط میں ان الفاظ کے ساتھ پہلے ہی کر چکے تھے کہ ''میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہو گا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ ہی لیا جائے اور ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دیا جائے۔ مسٹر جناح نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے تعبیر کر کے اس خیال کا اظہار کیا ہے، یہ میرے خیال میں آج نہیں تو کل ہو کے ہی رہے گا'' (یکم فروری 1940)۔ انگریزوں کو بھی اس موقف کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے، پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا اور سب نے اسے تسلیم کر لیا۔

یہاں تک تو سب ٹھیک ہو گیا کہ ہندوستان کے مسلمان، قومیت کے ایک نئے تصور کو منوانے میں کامیاب ہو گئے لیکن کیا پاکستان بننے کے بعد بھی اپنے موقف پر قائم رہ سکے؟ 14 اگست 1947 کے بعد خود کو ''پاکستانی قوم'' قرار دے کر اپنی قوم میں ہر اس فرد کو

شامل کرلیا گیا جو پاکستان کا رہنے والا ہے چاہے وہ مسلمان نہ بھی ہو لیکن کسی ایسے فرد کو اپنی قوم میں شامل نہ کیا گیا جو پاکستان کا رہنے والا نہیں چاہے وہ مسلمان بھی ہو، جس کا صاف مطلب کیا یہی نہیں کہ ہم قیامِ پاکستان کے بعد ''قوم مذہب سے ہے'' والے تصور سے نکل کر ''قوم وطن سے ہے'' والے تصور میں داخل ہو گئے؟ قومیت کے اصول کی یہ تبدیلی کوئی نئ بات اس لیے نہیں کہ اس روش کو باقی دنیا کے مسلمان پہلے سے ہی اپنائے ہوئے ہیں، اس افسوسناک حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور، اولین اسلامی ریاست کے ٹکڑے ہوتے ہی عملی طور پر پاش پاش ہو گیا تھا جب مسلمانوں نے وحدتِ فکر وعمل کے عظیم نصب العین کو ترک کر کے رنگ نسل اور وطن کی بنیاد پر خود کو الگ الگ قوموں میں تقسیم کر دیا۔ موجودہ حالات میں ''قوم مذہب سے ہے'' والے تصور پر عملدرآمد اس لیے بھی ممکن دکھائی نہیں دیتا کہ مفاد پرست عناصر کے ہاتھوں طرح طرح کے فرقوں میں تقسیم ہو کر، مذہب بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے اور کون نہیں جانتا کہ ان فرقوں کے نظریات ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں؟ جن لوگوں نے تفرقہ بازی کے بیج بوئے اور جو اس کی آبیاری کرتے رہے، اچھی طرح جانتے تھے کہ فِرقوں کی بقا دراصل ان کی اپنی بقا ہے چنانچہ انہوں نے دوطرفہ حکمتِ عملی اپناتے ہوئے ایک طرف تو یہ کیا کہ طرح طرح کے فروعی اختلافات پیدا کر دیے اور دوسری طرف اپنے پیروکاروں کے ایمان میں قدامت پرستی کو کوٹ کوٹ کر بھر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی ایک فرقہ بھی ایسا نہ بچا جو کسی دوسرے فرقے کی نگاہ میں کافر نہ ہو؟

قیامِ پاکستان کے بعد ہمارا نظریہ ہمارے عمل سے مختلف ہو گیا، ہم نے قومی شناختی کارڈ کا اجرا ''قوم وطن سے ہے'' کے اصول پر کرنا شروع کر دیا جبکہ نظریاتی طور پر ہم آج بھی ''قوم مذہب سے ہے'' کے قائل ہیں۔ قول وفعل کا یہی تضاد ہمیں ایک ایسے مقام پر لے آیا ہے جہاں ایک طرف کھائی ہے اور دوسری طرف دلدل، اس پر ستم یہ کہ ہم یہ ماننے کو تیار ہی نہیں کہ ہم بیک وقت دو متضاد منزلوں کے راہی بنے ہوئے ہیں۔ کیا ہم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ

اپنی فکر کو اپنے عمل سے ہم آہنگ کیے بغیر تعمیر و ترقی کے کسی سفر پر گامزن ہونے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا اور اس ہم آہنگی کا سوال اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہوتا جب تک اپنی کوتاہی تسلیم نہ کر لی جائے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنی غلطی فوراً مان لی جائے اور اپنے نظریے اور رویے کے اس تضاد کو ختم کر دیا جائے جس نے ہمیں اندر ہی اندر سے اتنا کھوکھلا کر دیا ہے کہ ملک کی سلامتی کو ایک مرتبہ پھر بڑے شدید خطرات لاحق ہو چکے ہیں۔ اس مقام پر جوش سے کہیں زیادہ ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہے اور ہوش کا تقاضا اس حقیقت کا ادراک کرنے میں ہے کہ قومیں نظریے کے بغیر تو رہ سکتی ہیں لیکن ملک کے بغیر نہیں رہ سکتیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ نظریے کو بچاتے بچاتے ہم ملک کو ہی کھو دیں؟

روزنامہ جناح، 14/9/2009

شرم تم کو مگر نہیں آتی

ایک ''بڑے افسر'' کے پاس ایک چھوٹا سا کام پڑ گیا۔ان سے ملاقات ہوئی، اپنا مسئلہ بتایا تو فرمانے لگے کہ ایک ہفتے تک وہ بہت مصروف ہیں اس لیے اس مسئلے پر بات نہیں کر سکتے۔میں نے کہا کہ چلو یہی بتا دیں کہ یہ مسئلہ حل ہوگا بھی کہ نہیں، اگر نہیں ہوگا تو میں آئندہ آپ کو زحمت ہی نہ دوں؟ انہوں نے فرمایا کہ اس بارے میں اگلے سوموار کو ہی کوئی بات ہوسکتی ہے۔

اگلا سوموار آیا تو سوچا کہ پہلے فون کر کے ''صاحب'' کا پروگرام پوچھ لوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ شدید گرمی میں راولپنڈی کے پہلے کونے سے اسلام آباد کے آخری کونے تک پہنچوں تو معلوم ہو کہ موصوف تشریف ہی نہیں لائے؟ ان کے پرائیویٹ سیکریٹری نے بتایا کہ وہ گیارہ بجے آتے ہیں لیکن وہ دو بجے کے قریب آئے اور میں پانچ بجے کے لگ بھگ ان سے بات کرنے میں کامیاب ہوا، انہوں نے فرمایا کہ'' کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ اگلے منگل کو آئیں، میری مصروفیت تاحال ختم نہیں ہوئی بلکہ کچھ اور بڑھ گئی ہے''؟ میں نے کہا کہ بالکل آ جاؤں گا لیکن اس مرتبہ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ملاقات کا وقت طے کر لیا جائے کیونکہ میرا آج کا پورا دن ضائع ہو گیا ہے اور آپ سے ملاقات بھی نہیں ہوئی؟ انہوں نے چار بجے کا وقت دے دیا۔

اگلے منگل کو میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا، وہ کام ادھورا چھوڑ کر راولپنڈی لوٹ آیا اور ٹھیک چار بجے ان کے دفتر پہنچ گیا لیکن وہ دفتر میں تھے ہی نہیں، کافی دیر ان کا انتظار کیا لیکن وہ تشریف نہیں لائے، پرائیویٹ سیکریٹری نے کہا کہ کچھ معلوم نہیں کس وقت آئیں گے، نہ ہی یہ بتا کر گئے ہیں کہ کدھر جا رہے ہیں۔میں مایوسی کے عالم میں ان کے کمرے سے نکل آیا لیکن عمارت سے باہر نکلتے ہوئے وہ مجھے مل گئے، میں نے کہا کہ آپ نے مجھے چار بجے کا وقت دیا تھا؟ وہ بولے کہ بڑا اچھا ہوا گر آپ اگلے منگل کو

آ جائیں؟ میں نے کہا کہ اگر آپ اتنے ہی مصروف تھے تو اپنے پرائیویٹ سیکریٹری کے ذریعے مجھے اطلاع کروا دیتے تاکہ میں راولاکوٹ سے بھاگم بھاگ واپس نہ آتا، اب مجھے اپنے ادھورے کام کی تکمیل کے لیے کل پھر راولاکوٹ جانا پڑے گا اور یہ سفر اسقدر دشوار ہے کہ اس کا اندازہ آپ نہیں کر سکتے؟ وہ بولے کہ ذہن میں ہی نہیں رہا۔ میں نے کہا کہ چلیں جو ہوا سو ہوا لیکن اب کہیں ایسا نہ ہو کہ اگلے منگل کو آپ تو مل جائیں لیکن مسئلہ پھر بھی حل نہ ہو، آپ مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتے کہ میرا کام ہوگا کہ نہیں، اگر ہوگا تو کوئی بات نہیں میں ایک مرتبہ پھر آ جاؤں گا بصورتِ دیگر وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟ انہوں نے فرمایا کہ ضرور ہوگا ورنہ میں آپ کو بار بار کیوں بلاتا؟

اگلے منگل کو پہنچا اور پرائیویٹ سیکریٹری نے انہیں میرے آنے کی اطلاع دی تو انہوں نے انتظار کرنے کے لیے کہا، دفتر میں ایک ملاقاتی اور بھی موجود تھا۔ ہم دونوں کو انتظار کرتے کرتے پورا ایک گھنٹہ ہو گیا، میرے برعکس دوسرے ملاقاتی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، کہنے لگے کہ پونے دو بجے بلایا تھا اور تین بج گئے ہیں، میں لاہور سے اسلام آباد آیا ہوں، واپس بھی جانا ہے، نہ جانے کتنے کام ادھورے پڑے ہیں لیکن ان لوگوں کو کسی دوسرے کے وقت کی کوئی قدر ہی نہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کی عمر کیا ہے؟ انہوں نے بتایا 26 سال۔ میں نے کہا کہ آپ میں اور مجھ میں یہی فرق ہے کہ آپ ابھی نوجوان ہیں، سرکاری معاملات کے اسرار و رموز سے واقفیت نہیں رکھتے ورنہ میری طرح سکون سے بیٹھے ہوتے؟ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ اگر آپ کا کام ہونا ہوتا تو آپ کو اتنا انتظار کیوں کروایا جاتا؟ وہ بولے کہ آپ بھی تو انتظار کر رہے ہیں تو کیا آپ کا کام بھی نہیں ہوگا اور اگر نہیں ہوگا تو اس انتظار کا کیا مطلب؟ میں نے کہا کہ مجھے اس بات کا اندازہ ہو چکا ہے کہ میرا کام بھی نہیں ہوگا لیکن کیا کروں کہ وزیر صاحب سے میرا کوئی تعلق نہیں اور ان صاحب نے جھوٹی ہی سہی لیکن امید ضرور دلائی ہوئی ہے جو ٹوٹ گئی تو بھی ایک کالم تو نکل ہی آئے گا؟ انہوں نے پوچھا کہ لیکن میں کیا کروں؟ میں نے کہا کہ فی الحال تو

آپ یہ بتائیں کہ کیا منسٹر صاحب تک آپ کی کوئی رسائی ہے؟ وہ بولے کہ کچھ کچھ ہے۔ میں نے کہا تو پھر آپ ان کے پاس کیوں نہیں جاتے، یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟

وہ ہونہار نوجوان جس نے اپنا نام گوہر اقبال بتایا، مجھے بڑا اچھا لگا، ذہین تو وہ دکھائی دے ہی رہا تھا لیکن اس میں بڑا اعتماد بھی تھا اور آگے بڑھنے کی بہت لگن بھی تھی، اس نے بتایا کہ وہ دو صدارتی ایوارڈ حاصل کر چکا ہے اور کئی ممالک میں پاکستانی نوجوانوں کی نمائندگی بھی کر چکا ہے۔ ہماری گفتگو جاری تھی کہ اندر سے (مزید نصف گھنٹہ گزرنے کے بعد) نوجوان کا بلاوا آ گیا، وہ اندر چلا گیا لیکن باہر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی، وہ مسکرا رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا تو مسکراتے ہوئے ہی بولا کہ آپ نے درست فرمایا تھا، میرا کام نہیں ہوا؟ میں بھی مسکرانے لگا اور وہ بولا کہ اب میں آپ ہی کے مشورے پر عمل کروں گا اور منسٹر صاحب سے ہی کوئی رابطہ لڑانے کی کوشش کروں گا۔ اس نے جانے سے پہلے مجھ سے میرا کارڈ مانگا جو دیتے ہوئے میں نے کہا کہ میں آپ کو پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ آپ ایک نہ ایک دن ضرور اس شخص سے بڑے مقام پر پہنچیں گے جس نے آپ کو بلاوجہ اتنا انتظار کروایا، صحیح بدلہ لینے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ کسی کے ساتھ ایسا سلوک نہ کریں جیسا آپ کے ساتھ ہوا، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ بھی اسی جیسے بن جائیں؟ وہ مسکراتے ہوئے بولا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا اور خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد مزید 40 منٹ گزر گئے لیکن مجھے ''صاحب'' کا دیدار نصیب نہ ہوا، پھر پتہ چلا کہ موصوف کھانا کھانے جا رہے ہیں، وہ باہر نکلے تو میں سامنے چلا گیا، مجھے دیکھ کر وہ چونکے اور بولے کہ میرے ذہن میں ہی نہیں رہا کہ آپ بھی بیٹھے ہیں، بہرطور میں آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا لیکن آپ کا کام فی الوقت نہیں ہوسکتا۔ میں نے کہا کہ جناب یہ بات کیا آپ پہلے نہیں بتا سکتے تھے جبکہ میں نے اس کے بارے میں آپ سے کئی مرتبہ پوچھا بھی؟ وہ بولے کہ ''میں نے سوچا تھا کہ آپ کا کام ہو جائے گا''۔ میں نے کہا کہ آپ نے تقریباً ایک

مہینہ مجھے اپنے دفتر کے چکر لگوائے لیکن پھر اپنے کمرے میں بلوانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی؟ کم از کم آج تو انتظار نہ کرواتے؟ آپ تو فقط ''افسری'' ہی کرتے ہیں لیکن مجھے تین جگہ محنت مزدوری کرنی پڑتی ہے، آپ کو اندازہ نہیں کہ آپ نے میرا کتنا وقت برباد کروایا اور اس سے مجھے کتنا نقصان ہوا؟ انہوں نے ناگوار لہجے میں کہا کہ آپ کا کارڈ میرے پاس ہے، میں کچھ عرصے بعد آپ سے رابطہ کروں گا۔ میں بے اختیار مسکرانے لگا اور ان سے یہ کہتے ہوئے اجازت چاہی کہ آپ کا کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہوگا۔ واپسی پر اپنے عزیز دوست ضرار الحسن کی یہ بات بار بار یاد آئی کہ پاکستان میں کسی سرکاری افسر یا سیاستدان سے کوئی کام پڑ جائے تو اس کے پاس جانے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لیا کریں کہ آپ کا کام کرنے سے اُس کی ذات کو کیا فائدہ ہوگا اور اگر کوئی فائدہ نہیں ہوگا تو وہ آپ کا جائز کام بھی کیوں کرے گا؟ اور میں اس سوچ میں کھو گیا کہ جس ملک کے سیاستدانوں اور افسروں کا حال یہ ہو اسے تباہ و برباد کرنے کے لیے کسی دوسرے کو کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

روزنامہ جناح، 3/7/2009

حقیقت یہی ہے

ہم شروع دن سے ہی ایک عجیب طرح کی کنفیوژن کا شکار ہیں۔1949 میں متفقہ طور پر ''قرار دادِ مقاصد'' پاس کرتے ہیں اور ایک جمہوری ملک بننے کا تہیہ کرتے ہیں لیکن پھر اس قرارداد کے ہوتے ہوئے بھی 1970 تک ملک میں جنرل الیکشن نہیں ہونے دیتے؟ ایک طرف 1971 کی ذلت آمیز شکست کا سوگ مناتے ہیں اور سقوطِ ڈھاکہ پر آنسو بہاتے ہیں لیکن دوسری طرف جنرل یحییٰ اور جنرل نیازی کو قومی پرچم میں لپیٹ کر دفناتے ہیں اور 21 توپوں کی سلامی بھی پیش کرتے ہیں؟ جمہوریت کا سبق بھی پڑھاتے ہیں اور تعلیمی اداروں کے نام ڈکٹیٹروں کے نام پر رکھنے میں بھی قباحت محسوس نہیں کرتے؟ جنرل پرویز مشرف کو فساد کی جڑ بھی قرار دیتے ہیں اور اس پر سرکاری اعزاز و اکرام کی بارش بھی کرتے ہیں؟ ذوالفقار علی بھٹو کی موت کو ''عدالتی قتل'' بھی کہتے ہیں اور انہیں موت کی سزا سنانے والے ''قاتل ججوں'' کو سرکاری مراعات سے بھی نوازتے رہتے ہیں؟ قائدِ عوام کا یومِ شہادت بھی باقاعدگی سے مناتے ہیں اور ان کے قاتل ضیاالحق کو خزانہ سرکار سے پنشن ادا کرنے میں بھی بے قاعدگی نہیں ہونے دیتے؟ بے نظیر بھٹو کے قتل کو سوچی سمجھی سازش قرار دیتے ہیں لیکن اس سازش سے پردہ اٹھانے کے لیے اتنا بھی نہیں کرتے کہ ان ''سرکاری اہلکاران'' سے ہی کچھ پوچھ گچھ کر لیں کہ جنہوں نے جائے واردات سے وقوعے کے فوراً بعد ساری دنیا کے سامنے قتل کے ثبوت مٹا ڈالے؟ جمہوریت کے علمبردار بھی بنتے ہیں اور آمریت کو فروغ دینے والی آئینی ترمیم بھی ختم نہیں کرتے؟ معاشی زبوں حالی کا رونا بھی روتے ہیں اور شاہ خرچیوں سے بھی باز نہیں آتے؟ ''بال ٹمپرنگ'' ہمیں ہضم نہیں ہوتی لیکن آئین سے ٹمپرنگ کرنے والوں کو سلامی پیش کرتے ہیں اور ٹرکوں کے پیچھے ان کے پورٹریٹ بنواتے ہیں؟

اپنی بہن بیٹی کو فلم میں کام کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے لیکن فلمی لوگوں کو Celebrity قرار دیتے ہیں؟ ہماری اداکائیں ہندوستان جا کر ''وہی کچھ'' کریں جو

پاکستان میں کرتی ہیں تو ہماری قومی غیرت پر حرف آجاتا ہے لیکن کرپشن اور بدامنی کے نت نئے ریکارڈ بنانے سے ہماری انا مجروع نہیں ہوتی؟ ہماری کرکٹ ٹیم کوئی ٹورنامنٹ ہار جائے تو ساری قوم سوگ میں ڈوب جاتی ہے اور کرکٹر منہ چھپاتے پھرتے ہیں لیکن ناکام ریاستوں کی فہرست میں شامل ہونے سے کسی کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا؟ ہندوؤں سے نفرت کرتے ہیں اور ہندو ثکافت سے پیار؟ ہندوستان سے دشمنی بھی جاری رکھنا چاہتے ہیں اور ہندوستانی فلموں اور ڈراموں کے بغیر بھی نہیں رہ سکتے؟

ہر وقت امتِ مسلمہ کی رٹ لگائے رکھتے ہیں لیکن صوم وصلوۃ کے طریقے پر بھی متفق نہیں ہوتے؟ ایک ایک گلی ایک ایک محلے میں کئی کئی مسجدیں بنا رکھی ہیں اور ایک دوسرے کی مسجد میں نماز پڑھنا بھی حرام سمجھتے ہیں؟ صفائی کو ایمان کا حصہ مانتے ہیں لیکن گندگی پھیلانے میں اتنے ماہر ہیں کہ قربانی کے جانوروں تک کی گندگلیوں اور سڑکوں پر ہی چھوڑ دیتے ہیں (ہماری صفائی کا اندازہ کسی کمیونٹی واش روم میں جا کر بھی آسانی سے کیا جا سکتا ہے)؟ ایک خدا پر ایمان لانے کا دعوی کرتے ہیں لیکن اتنے فرقوں، ذاتوں اور برادریوں میں بٹے ہوئے ہیں کہ گنتی محال ہوگئی ہے؟ نعت میلاد کی محفلیں شان وشوکت سے منعقد کرتے ہیں لیکن صداقت اور امانت کی راہ پر چلنے کا نام نہیں لیتے جو نبی کریمؐ کے کردار کی بنیاد تھی؟ ناموسِ رسالت کے نام پر گوجرہ کے بے گناہ ولاچار عیسائیوں کو زندہ جلا دیتے ہیں لیکن جھوٹے بددیانت اور ظالم حکمرانوں کی راہ میں پلکیں بچھاتے ہیں؟ بے بس ومعصوم لڑکیاں کبھی زندہ درگور کر دی جاتی تو کبھی جیتے جی جلا دی جاتی ہیں، مدرسوں کے طالب علم بچے مولویوں کے تشدد سے ہلاک ہو جاتے ہیں لیکن ہمارا جذبہء جہاد افغانستان میں جاگتا ہے؟ اہلِ اقتدار اپنی عیاشیوں پر اٹھنے والی رقم کبھی ہم پر ٹیکس لگا کر پوری کرتے ہیں تو کبھی بجلی گیس پٹرول کی قیمتیں بڑھا کر لیکن ہمارا احتجاج عربوں پر اسرائیل کی جانب سے ڈھائے جانے والے مظالم کے خلاف ہوتا

ہے؟ ''لا اکراہ فی الدین'' (دین میں زبردستی نہیں) کے اصول کو بھی ایمان کا حصہ ٹھہراتے ہیں اور ڈنڈے کے زور پر من پسند اسلام کے نفاذ کو بھی جہاد قرار دیتے ہیں؟

اس سب کے باوجود ہم خود کی زندہ قوم مانتے ہیں؟ اگر ہم زندہ قوم ہوتے تو ہماری سب سے بڑی ''جمہوری'' پارٹی کیا اپنے بانی قائد کے قاتل کو علامتی پھانسی کی سزا نہ دلواتی، ان ججوں کے خلاف مقدمے قائم نہ کرواتی جنہوں نے اس کے ''جوڈیشیل مرڈر'' کا حکم دیا جبکہ یہ پارٹی تین مرتبہ اقتدار میں آ چکی ہے؟ ذولفقار علی بھٹو کی حکومت سمیت کتنے ہی جمہوری دور آئے لیکن کیا کسی نے بھی فوجی آمروں کے خلاف غداری کے مقدمے درج کروائے جنہوں نے کھلم کھلا آئین کو پامال کیا اور اپنے حلف سے غداری کی؟ بفرضِ محال ان کے خلاف کیس نہیں چلائے جا سکتے تو کیا انہیں ملنے والے اعزازات بھی واپس نہیں لیے جا سکتے، ان کے ناموں پر قائم اداروں اور جگہوں کے نام بھی تبدیل نہیں کیے جا سکتے تھے؟ اگر ہم زندہ قوم ہوتے تو کیا ان جرنیلوں کو مربعے الاٹ کیے جانے پر زمین آسمان ایک نہ کر دیتے جنہوں نے آدھا ملک گنوا دیا؟ اگر ہم زندہ قوم ہوتے تو کیا حکمرانوں کو یہ اندھیر مچانے کی اجازت دیتے کہ وہ ہمارے نام پر قرض لے کر عیاشیاں کریں اور اس سے بھی پیٹ نہ بھرے تو ہمارا خون چوسیں؟ اگر ہم زندہ قوم ہوتے تو کیا ہمارے ہیرو سائنسدان اور مفکر نہ ہوتے، ہمارے یہاں آئین و قانون کی بالا دستی نہ ہوتی، میرٹ کا بول بالا نہ ہوتا، ہم خودداری و خودمختاری کی راہ پر گامزن نہ ہوتے؟ اگر ہم توحید کے متوالے ہوتے تو کیا ہم میں وحدت نہ ہوتی؟ اگر ہمیں ناموسِ رسالت کا پاس ہوتا تو کیا ہم میں سچائی، امانت داری اور انصاف پسندی رچی بسی نہ ہوتی؟ اگر ہمیں اسلام سے رغبت ہوتی تو کیا ہمارا ملک امن و سلامتی کا گہوارا نہ ہوتا؟ ہم خود کو زندہ قوم سمجھتے ہیں لیکن ہم جیسی مردہ قوم شاید کوئی اور نہ ہو؟

روزنامہ جناح، 26/2/2010

دہشت گردی کا اہم ترین اور فراموش شدہ پہلو

میں نے اپنی زندگی کے چار قیمتی برس شمالی وزیرستان میں گزارے جو آجکل دہشت گردی کی جنگ کا محور بنا ہوا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں کیڈٹ کالج رزمک میں زیرِ تعلیم تھا اور روس نے افغانستان پر تازہ تازہ حملہ کیا ہوا تھا۔ حملے سے پہلے یہاں کے لوگ مالی طور پر کافی مستحکم ہوا کرتے تھے جس کی بنیادی وجہ سمگلنگ کی فراوانی تھی۔ یہ سمگلنگ روس سے شروع ہو کر فاٹا کے تمام بڑے چھوٹے باڑا بازاروں میں پھیل جاتی تھی۔ میرانشاہ، درہ آدم خیل اور حیات آباد کے باڑا بازار بہت مشہور ہوا کرتے تھے جہاں روسی اشیا کی وہ بہتات ہوتی تھی کہ انسان تصور نہیں کرسکتا۔ ان تینوں بازاروں میں جانے کا موقع درجنوں بار ملا، ایک مرتبہ میں نے روسی ساخت کے دو عدد ''اے سی'' بھی خریدے جن کا رنگ سفید ہوا کرتا تھا، شاید آپ یقین نہ کریں لیکن گودام میں ایئر کنڈیشنوں کا اتنا بڑا انبار لگا ہوا تھا کہ لگتا تھا جیسے سارے روس کے اے سی یہیں جمع کر دیے گئے ہیں۔ مختلف قسم کی روسی اشیا کے علاوہ باڑا بازاروں میں جو چیز کثرت سے بکتی تھی وہ چرس اور شراب تھی (چرس تو ساری کی ساری اپنی ہی بنائی ہوئی ہوتی تھی البتہ شراب کی بعض اقسام روسی سے بھی ہوا کرتی تھیں)۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ افغانستان پر روسی پیش قدمی سے پہلے فاٹا (بالخصوص وزیرستان) کی معیشت کا تمام تر دارومدار سمگلنگ پر ہوا کرتا تھا۔ سمگلنگ پر نہ ہوتا تو کس پر ہوتا کہ زیادہ تر علاقہ بنجر ہے جہاں زراعت نہ ہونے کے برابر تھی اور کسی قسم کی صنعت کاری کا تو دور دور تک کہیں کوئی سراغ ہی نہ ملتا تھا، بس اسلحہ سازی ہی ہوا کرتی تھی۔ یہاں کے لوگ اسلحہ بنانے کے ہی ماہر نہیں تھے بلکہ اسے چلانے میں بھی ثانی نہیں رکھتے تھے۔ بندوق کو مرد کی شان سمجھا جاتا تھا اور کوئی بھی ''مرد'' ایسا دکھائی نہیں دیتا تھا جس کے کندھے پر بندوق اور گولیاں نہ لٹک رہی ہوں۔ انتہا درجے کے روایت پرست تھے، مذہب بھی روایات ہی کا حصہ تھا جس کے ساتھ والہانہ وابستگی کا عالم یہ تھا کہ جو لوگ چرس اور شراب بیچتے تھے وہ بھی پنجگانہ نماز کے اتنے

پابند تھے کہ پیشانیوں پر محرابیں بنی ہوئی تھیں۔کئی منشیات فروشوں نے اپنے وزیٹنگ کارڈ تک چھپوائے ہوئے تھے جن میں سے کئی پر چرس کے معیاری ہونے کی شرطیہ ضمانت کے علاوہ پراپرائٹر کے نام کے پیچھے حاجی بھی لکھا ہوتا تھا۔ان سیدھے سادے لوگوں میں کئی خوبیاں بھی تھیں۔مثلاً وہ بڑے ہی مہمان نواز اور قول کے پکے تھے۔مہمان اور قول کی حفاظت میں جان تک قربان کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے، بالعموم سچ بولتے تھے اور امانت دار بھی تھے۔ان میں منافقت کا نام ونشان تک نہیں تھا۔بلا کے بہادر، بے باک اور صاف گو تھے۔سب سے بڑھکر یہ کہ اپنی آزادی سے عشق کرتے تھے، یہ الگ بات ہے کہ ان کی آزادی بے مہار بھی تھی اور آوارہ بھی، دشمن سے انتقام ضرور لیتے تھے، معاشرہ قبائلی تھا اور مختلف قبائل میں ایسی شدید دشمنی تھی کہ درجنوں لوگ اس کے بھینٹ چڑھ جاتے تھے۔ان لوگوں کے گھر ہوتے تو مٹی کے تھے لیکن ان میں باقاعدہ طور پر مورچے بنائے جاتے تھے،کئی قبائل کے پاس تو توپیں تک موجود تھیں جو لڑائی میں بے دریغ استعمال کی جاتی تھیں۔دشمنی کی آگ کئی کئی نسلوں سے بھڑک رہی تھی لیکن اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش بزدلی کے زمرے میں آتی تھی۔

افغانستان پر روسی حملے کے بعد سمگلنگ میں بڑی تیزی سے کمی واقع ہوتی چلی گئی جس سے کم وبیش ہر کنبے کا کوئی نہ کوئی فرد ضرور منسلک تھا، باڑا بازاروں کی رونق ماند پڑ گئی، بے شمار لوگ بے روزگار ہو گئے اور اس بنجر علاقے کے طول وارض میں غربت نے ڈیرے ڈالنے شروع کر دیے۔یہ وہ حالات تھے جب امریکہ نے ''جہادی اسلام'' کی ترویج کے لیے کثیر فنڈ مختص کیے اور ضیاالحق نامی آمر کو اپنا آلہءکار بنا کر اپنے من پسند اسلام کی اشاعت وتبلیغ پر مامور کر دیا،سی آئی اے کی سرپرستی میں ''مردِ مومن مردِ حق'' نے مسلح جہاد کو فروغ دینے والے مذہبی مدرسوں کا جال بچھا دیا،لوگوں نے اسلام کے نام پر جوق در جوق اپنے بچے ان مدرسوں میں امریکی عزائم کے بھینٹ چڑھنے کے لیے داخل کروانے شروع کروا دیے کیونکہ ایک طرف تو وہ مفلسی وبے روزگاری کی چکی میں پس رہے تھے اور دوسری طرف اپنی اُن روایات سے اندھا

لگاؤ رکھتے تھے جن میں اسلام اور اسلحہ بنیادی حیثیت کے حامل ہیں، پھر انہیں اپنے ''ازلی و ابدی دشمن'' روس سے انتقام بھی تو لینا تھا۔ دال روٹی کا مسئلہ ایک مرتبہ پھر عارضی طور پر حل ہو گیا کہ جو لوگ سمگلنگ کی کمی سے بے روزگار ہوئے تھے جہادی قافلوں میں برسرِ روزگار ہو گئے۔

روس کی شکست کے بعد امریکی مفادات بھی تبدیل ہو گئے، جہادی مدرسوں کا بجٹ بڑی حد تک بند کر دیا گیا، امریکہ تو خیر امریکہ تھا ہمارے اپنے حکمرانوں نے بھی یہ نہ سوچا کہ مدرسوں کے بند ہونے کے بعد یہ لاکھوں لوگ جو بندوق چلانے کے علاوہ کوئی ہنر جانتے ہی نہیں کہاں جائیں گے اور اپنے بیوی بچوں کو کیا کھلائیں گے؟ اس حد تک ضرور کیا گیا کہ کچھ ''مجاہدین'' کو افغانستان کے محاذ سے ہٹا کر کشمیر کے محاذ پر بھیج دیا گیا لیکن امریکہ نے جلد ہی اس کی بھی مخالفت شروع کر دی کیونکہ ''نیو ورلڈ آرڈر'' میں امریکہ کسی صورت بھی بھارت کی ناراضگی مول نہیں لے سکتا تھا جس کا ساتھ چین کو حساب کتاب میں رکھنے کے لیے بڑی ضروری حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اس کے بعد ہوا یہ کہ جن ''مجاہدوں'' کو امریکہ نے اپنے قابو میں لازمی طور پر رکھنا تھا ان کے علاوہ باقی تمام مجاہد بالواسطہ یا بلاواسطہ ان ممالک کے ہتھے چڑھ گئے جو پاکستان سے حساب چکتا کرنا چاہتے تھے یا جو ان جنگجوؤں کو کسی اور مقصد کے تحت استعمال کرنا چاہتے تھے۔ مجاہدین میں دو طرح کے لوگ تھے، ایک طالب اور سپاہی جبکہ دوسرے معلم اور کمانڈر، پہلی طرح کے مجاہدوں کو تو آج تک بھی یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کس کے لیے کام کر رہے ہیں (بے چارے بس یہی جانتے ہیں کہ خدا اور رسولؐ کے حکم کی بجا آوری میں جہاد کر رہے جس سے دنیا میں تنخواہ اور آخرت میں جنت ملتی ہے) البتہ دوسری طرح کے مجاہد بڑی اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں لیکن ہر دو طرح کے مجاہدوں کے پاس کچھ اور کرنے کی کوئی ''آپشن'' ہی نہیں، چنانچہ وہ ''مرتا کیا نہ کرتا'' کے مصداق اپنی اپنی ''عاقبت'' سنوارنے میں مصروفِ عمل ہیں۔ اس پر ستم یہ کہ فوجی حملوں کے ذریعے ان کے عزیز و اقارب کو

بڑی تعداد میں مار کے ان کی انتقام لینے کی ''ان بلٹ'' صفت کو بھی مکمل طور پر ابھارا جا چکا ہے؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات سے چھٹکارا کیسے پایا جائے؟ تو بات یہ ہے کہ کچھ ٹھیک کرنا اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک یہ تسلیم نہ کرلیا جائے کہ کچھ غلط ہوا ہے لیکن ہم تو ابھی تک یہی ماننے کو تیار نہیں کہ ہم وہی کاٹ رہے ہیں جو ہم نے خود بویا؟ اگر ہم وزیرستان اور اس طرح کے دیگر علاقوں کو مفلسی کے دلدل سے نکال لیتے تو کیا وہاں خودکش حملہ آور پیدا ہوتے؟ اور اگر ہوتے بھی تو کیا ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر نہ ہوتی؟

جان لیجئے کہ غربت اور دہشت گردی ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں یعنی جب تک غربت موجود ہے دہشت گردی بھی موجود رہے گی لیکن عوام کی غربت کیسے مٹائی جائے کہ حکمرانوں کی بھوک ہی مٹنے کا نام نہیں لیتی؟

روزنامہ جناح 2009

پاکستان کا بانیء اول

''رات کو جب میں آسمان کی طرف دیکھتا ہوں تو اس حصے کی پرواہ نہیں کرتا جو نیلا نیلا اور ڈراؤنا سا دکھائی دیتا ہے، میری توجہ ستاروں پر مرکوز ہوتی ہے جو چمکتے ہیں اور معشوقانہ انداز میں ہمیں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ کیا تم اپنی قوم میں اس قسم کے لوگ پیدا کیے بغیر جو ستاروں کی طرح چمکتے ہوں، اپنی قوم کو معزز اور دوسری قوموں کی نگاہوں میں باعزت بنا سکتے ہو؟'' یہ خوب صورت وخوب سیرت بات سر سید احمد خان نے کہی تھی جسے علامہ اقبال نے شعر کی زبان میں کچھ اسطرح بیان کیا کہ

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

تحریک پاکستان کا مطالعہ ذرا توجہ سے کیا جائے تو یہ حقیقت سورج کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ 14 اگست 1947 کو برِصغیر میں وطنِ عزیز کی صورت جو جہانِ تازہ پیدا ہوا اس کی نمود سر سید کے افکارِ تازہ سے ہی ہوئی۔ 1857 کی جنگِ آزادی میں یہ ادراک اور کسے حاصل تھا کہ شکست ہوگئی تو سارا نقصان مسلمانوں کو ہوگا اور فتح ہوئی تو سارا فائدہ ہندو اٹھائیں گے؟ مسلمانوں کو نقصان اس لیے ہوگا کہ انگریزوں نے انہی سے اقتدار چھینا تھا جس کی بدولت ''بغاوت'' کا بنیادی الزام ان کے سر آنا ایک فطری سی بات تھی نیز ہندوؤں کے برعکس مسلمان انگریز تہذیب وثقافت سے نفرت کا کھلم کھلا اظہار اس حد تک کرتے تھے کہ انگریزی تعلیم کے حصول تک کو کفر قرار دیا جاتا تھا، اور ہندوؤں کو فائدہ اس لیے ہوگا کہ مغربی طرز کی جمہوریت میں حکومت اکثریت کو ملتی جو انہی کے پاس تھی اور ہندو سیاسی، سماجی ومعاشی اعتبار سے اتنا آگے تھے کہ مسلمان میرٹ کی بنیاد پر بھی ان سے مقابلہ نہیں کر سکتے تھے نیز مسلمانوں کے برعکس انہیں ان انگریزوں کا قرب بھی حاصل تھا جنہیں اقتدار کی منتقلی میں کلیدی کردار ادا کرنا تھا۔ سر سید چاہتے تھے کہ مسلمان احتجاجی سیاست کی لاحاصل جدوجہد کو ترک کر

کے اپنی تعلیم وتربیت پر زور دیں اور پہلے اس قابل ہو جائیں کہ انگریزوں کے تسلط سے نکلنے کے بعد انہیں کوئی دوسرا غلامی کی بیڑیاں نہ پہنا سکے۔ یہی وجہ تھی سر سید نے مسلمانوں کو جنگِ آزادی میں شمولیت اختیار کرنے سے منع کیا، اکثر لوگوں نے ان کی بات نہ مانی لیکن جنہوں نے مانی وہ اپنی جان پر کھیل کر بھی انگریز خاندانوں کو مقامی لوگوں کے قہر سے بچاتے رہے۔

جنگِ آزادی ناکام ہوئی تو وہی ہوا جس کی پیش گوئی سر سید پہلے ہی کر چکے تھے، ہندوؤں نے اس ''میوٹنی'' کا ذمہ مسلمانوں کو ٹھہرا دیا اور انگریز تو ان کی بات ماننے کے لیے پہلے سے ہی تیار بیٹھے تھے۔ ہماری تاریخ کے اس نازک موڑ پر بھی سر سید نے جس دُور اندیشی کا ثبوت دیا وہ کوئی اور نہ دے سکا، آپ نے ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' اور ''وفادار ہندوستانی مسلمان'' کے عنوانات سے دو سیر حاصل پمفلٹ لکھ کر انگریزوں کے دلوں میں ہمارے خلاف بھڑکتی ہوئی نفرت کی اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی جسے ہمارے دشمنوں کی عقلمندی اور دوستوں کی بیوقوفی نے ہوا دے رکھی تھی۔ سر سید نے ایک طرف تو بڑی روشن دلیلوں سے انگریزوں کو یہ باور کرایا کہ بغاوت کے ذمہ دار مسلمان نہیں بلکہ انکی اپنی ظالمانہ پالیسیاں ہیں اور دوسری طرف بڑی واضح مثالوں سے ان کی توجہ ان مسلمانوں کی جانب مبذول کروائی جو جان جوکھم میں ڈال کر انگریزوں کی حفاظت کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ''رسالہ در طعام اہلِ کتاب'' لکھ کر قرآن وسنت سے استدلال کرتے ہوئے انگریزوں (نصاری) کے ساتھ مل جل کر کھانے پینے کو جائز قرار دیا جسے حرام سمجھا جاتا تھا اور ''رسالہ تہذیب الاخلاق'' میں بڑے مدبرانہ انداز میں ان جہالت آمیز رسومات وروایات وتوہمات کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا جو مسلمانوں میں قدامت پرستی کو فروغ دے رہے تھے۔

انگریزی تعلیم کے خلاف ہمارے ''جلیل القدر علماء کرام'' کے عالمانہ فتووں کی بدولت ہمارا حال یہ تھا کہ 1875 کے ہندوستان میں صرف 20 مسلمان گریجوایٹس تھے جبکہ ہندوؤں

میں یہ تعداد 850 کے لگ بھگ تھی۔ یہ وہ دور تھا جب سر سید نے چندہ اکٹھا کر کر کے اور کفر کے فتوے کھا کھا کے ''محمڈن اینگلو اورینٹل سکول علی گڑھ'' کی بنیاد رکھی جسے دو سال بعد ہی (1877) میں کالج کا درجہ مل گیا اور اس کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی کے ساتھ کر دیا گیا۔اس کالج کا نام جس دانشمندی سے رکھا گیا اسی سے اس کے قواعدِ کار بھی بنائے گئے اور پرنسپل کے علاوہ کم از کم دو یورپی پروفیسروں کو رکھے جانے کی شرط عاید کی گئی (سکول کا ہیڈ ماسٹر بھی کوئی یورپی ہی بن سکتا تھا)۔یہی وجہ تھی ایک طرف تو کالج کا افتتاح وائسرے ہند نے کیا جس سے اس کی ساکھ اور مالی حالت بڑی بہتر ہوئی اور دوسری طرف انگریزوں کے زیرِ عتاب آنے والے مسلمان نوابوں نے اس کے لیے دل کھول کر چندہ دیا ورنہ ہر سال تعلیمی وظائف پر اٹھنے والی لاکھوں روپئے کی خطیر رقم کا بندوبست کیسے ہوتا اور اسے بعد ازاں پہلی مسلم یونیورسٹی کا درجہ کیونکر ملتا؟ یہی وہ ادارہ ہے جو علی گڑھ یونیورسٹی کے نام سے دنیا بھر میں مسلمانوں کی عزت و توقیر کا باعث بنا اور جس کے لیے قائدِ اعظم فرمایا کرتے تھے کہ ''مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تحریکِ پاکستان کا اسلحہ خانہ ہے''۔

اس ادارے کو بنانے سے پہلے سر سید اپنی ''سائنٹیفک سوسائٹی'' کے ذریعے بلند پایہ اور مستند انگریزی کتابوں کے ترجمے آسان اردو میں کرا چکے تھے،غازی پور میں ''وکٹوریہ سکول'' کھولنے کا تجربہ کر چکے تھے اور ''سہ روزہ علی گڑھ گزٹ اور انجمن ترقیءِ مسلمانانِ ہند'' کے ذریعے مسلمانوں میں اس جدید تعلیم کے حصول کا شعور کافی حد تک بیدار کر چکے تھے جو آزادی کے سفر میں سنگِ میل کی حیثیت اختیار کر کے ہماری تاریخ میں امر ہوگئی۔

سر سید دو قومی نظریے کے بھی اولین معمار ہیں۔1885 میں کانگرس بنی تو سر سید نے مسلمانوں کو اس میں شریک ہونے سے منع کیا اور اس میں شامل ہونے کی دعوت کے جواب میں اس کے صدر بدر الدین طیب جی کو لکھا کہ ''میں نیشنل کانگرس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں۔کیا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہندوستان میں جو مختلف ذاتوں،فرقوں اور مذاہب کے افراد

رہتے ہیں ایک قوم کے افراد ہیں یا ایک قوم بن سکتے ہیں اوران کے دینی وملی اغراض ومقاصد ایک ہو سکتے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیز ماممکنات میں سے ہے اور جب یہ ناممکن ہے تو پھر نیشنل کانگریس بھی کوئی چیز نہیں ہوسکتی اور نہ ہی یہ ساری قوموں کے لیے یکساں طور پر سود مند ہو سکتی ہے''۔

کانگریس کے جواب میں ہی سر سید نے 1886 میں ''مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی'' بنالی جسے غیر اعلانیہ و غیر رسمی طور پر مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرنے والی ایک سیاسی جماعت کا درجہ حاصل تھا،1906 میں اسی سوسائٹی کے سالانہ اجلاس میں'' آل انڈیا مسلم لیگ'' کا قیام عمل میں آیا جو آگے چل کر مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بن گئی۔ جی ہاں وہی'' آل انڈیا مسلم لیگ''، جس کے پلیٹ فارم سے علامہ اقبال نے 1930 میں پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا اور 1940 میں قائدِ اعظم نے قراردادِ پاکستان منظور کروائی۔

سر سید ہی وہ پہلے شخص تھے جس نے مسلمانوں کے لیے 16 جنوری 1888 میں (ان الفاظ کے ساتھ کہ ''واسرائے کونسل میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد متعین ہونی چاہیے۔ ہندو ممبروں کو ہندو منتخب کریں اور مسلمان ممبروں کو مسلمان'') اُن جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کیا جنہیں دو قومی نظریے کی بنیاد اور پاکستان کے لیے ''خونِ زندگی'' قرار دیا جاتا ہے، سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لیے الگ کوٹہ مقرر کیے جانے کا مطالبہ بھی انہوں نے ہی کیا۔

17 اکتوبر سر سید احمد خان کا یومِ ولادت ہے، کاش ہم اس دن کو عقیدت و احترام کے ساتھ منانے کا طریقہ سیکھ سکیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ دعا بھی مانگیں کہ کاش پاکستان میں ایک اور سر سید پیدا ہو جائے کیونکہ ہم ایک مرتبہ پھر جہالت کے اندھے غار میں قید ہو چکے ہیں اور ہمیں جہانِ تازہ کی نمود کے لیے افکارِ تازہ کی ضرورت درپیش ہے۔

روزنامہ جناح 17/10/2009

کیا عورت کم تر ھے

عورت کے بارے میں دنیا کی ہرقوم کے خیالات کم وبیش ایک ہی جیسے فرسودہ ہیں فرق صرف یہ ہے باقی قومیں وہ کہتی ہیں جوان کے صحیفوں میں درج ہے جبکہ مسلمان وہ نہیں کہتے جوقرآن میں لکھا ہے۔ یہودیوں اورعیسائیوں کے یہاں عورت کومرد سے کم تر اس لئے قرار دیا گیا کہ توریت کے بقول ’آدم اپنی تنہائی سے اداس رہنے لگا تھالہذا خدانے اس کی پسلی سے حوا(یہ لفظ قرآن میں نہیں) کو پیدا کیا تا کہ وہ اس کا دل بہلاتی رہے‘‘(پیدائش 2/21-25) ’’عورت ابلیس کا پیکر ہے کیونکہ اسی نے آدم کو جنت سے نکلوایا‘‘(پیدائش3/8-13)۔انجیل میں بھی یہی کچھ لکھا ہےلیکن قرآن اس کی تردید کرتے ہوئے ایک طرف تو یہ بتاتا ہے کہ جس طرح عورت کو پیدا کیا گیا بالکل اسی طرح مردکوبھی پیدا کیا گیا(1 / النساء)اوردوسری طرف جنت سے نکالے جانے کے لیےعورت اورمرد(دونوں) کو برابر کا قصوروارٹھہراتا ہے(36/البقرۃ)۔اس کے باوجودمسلمانوں میں بھی یہ عقیدہ عام ہے کہ عورت مرد سے کمتر ہےجس کی تائید میں اس قسم کی روایات پیش کی جاتی ہیں کہ حضوراکرمؐ نے (معاذ اللہ) فرمایا کہ ’’نحوست تین چیزوں میں ہے گھر، گھوڑا اور عورت‘‘(بخاری) ۔’’کتے، گدھے اور عورت کے سوا کوئی چیز نماز نہیں توڑتی‘‘ (ترمذی)۔’’عورت کے وضوسے بچاہواپانی مکروہ ہے‘‘(ترمذی)۔

ذرا سوچیے کہ کیا حضور اکرمؐ عورت کو کتے اور گدھے کے برابر قرار دے سکتے ہیں؟ آپؐ تو عورت کا اسقدراحترام کرتے تھے کہ حضرت عائشہؓ کے بقول ’’حضرت فاطمہؓ کے تشریف لانے پرکھڑے ہوجاتے ،انھیں چومتے اوراپنی جگہ بٹھاتے‘‘(ترمذی)اورمرداورعورت کی مساوات کےاسقدرقائل تھے کہ(حضرت عائشہ ہی کے بقول)ازواجِ مطہراتؓ کے کام اپنے ہاتھ سے کیا کرتے تھے(بخاری)۔جن لوگوں کے خیال میں حضوراکرمؐ نےعورت کومنحوس کہاوہ یہ بھی مانتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا’’جنت ماں کے پاؤں تلے ہے‘‘۔کیاماں عورت نہیں ہوتی ؟

حضوراکرمؐ کےنزدیک عورت کامقام دراصل کیا تھااس کااندازہ ان احادیثِ مبارکہ

سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جو قرآنی تعلیمات کے عین مطابق ہیں مثلاً ''جس کی بیٹی ہو وہ اسے زندہ درگور نہیں کرے، نہ اُسے ذلیل کرے نہ اپنے بیٹے کو اُس پر ترجیح دے اللہ تعالیٰ اُسے جنت میں داخل فرمائے گا'' (ابوداؤد۔ مشکوۃ)۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ میرے حسن سلوک کا زیادہ حقدار کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا تیری ماں۔ پھر تیری ماں۔ پھر تیری ماں۔ پھر تیرا باپ ''(مسلم)۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم قرآن کی روشنی میں روایات کو پڑھنے کے بجائے روایات کی روشنی میں قرآن کو پڑھتے ہیں۔ ایک آیت (الرجال قوامون علی النساء) کا ترجمہ کچھ اس طرح کیا جاتا ہے کہ ''مرد عورتوں پر حاکم و مسلط (قوامون) ہیں'' (34/النساء)۔ اس ترجمے کو درست تسلیم کر لینے سے (معاذ اللہ) کیا قرآن میں تضاد نہیں پیدا ہو جاتا ہے کہ قرآن میں یہ لکھا ہے کہ کسی انسان کو (چاہے وہ خدا کا نبی ہی کیوں نہ ہو) اس بات کا اختیار حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے (79/ال عمران) اور یہ بھی لکھا ہے کہ ''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں'' (71/التوبۃ)۔

قوامون کا ترجمہ ''حاکم و مسلط'' اس لئے کیا جاتا ہے کہ روایات میں اس کا مفہوم ''مسیطرین'' یعنی ''داروغے'' اور ''متسلطین'' یعنی ''عورتوں پر مسلط کیے گئے'' ہے (تفاسیر کشاف و جلالین)۔ ورنہ عربی لغت (لسان العرب، تاج العروس وغیرہ) کی رو سے قوامون کا مطلب ہے کفالت کرنے والے۔

مذکورہ آیت کا درست مفہوم یہ ہو گا کہ قرآنی تقسیم کار کی رو سے 'مرد عورتوں کے کفیل ہیں' کیونکہ عورتیں اپنے خاص فرائض کی انجام دہی کے دوران اکتساب رزق سے معذور ہو جاتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ ''مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اسلام میں مرد اور عورت کی قطعی مساوات ہے۔ بعض علماء مرد کی فوقیت کے قائل ہیں۔ جس آیت سے شک کیا جاتا ہے وہ مشہور ہے 'الرجال قوامون علی النساء۔ عربی محاورے کی رو سے اسکی یہ تفسیر صحیح معلوم نہیں ہوتی'' (اقبال

اورعورت۔ص ۸۷)''اگر آپ ان حقوق پر نظر ڈالیں جو اسلام نے عورتوں کو دیئے ہیں تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ اس مذہب نے عورت کو کسی طرح مرد سے ادنی نہیں رکھا'' (ایضاً ص ۹۰)۔

اسی آیت کے آخری ٹکڑے میں ہے کہ ''زبانی تنبیہہ کے باوجود عورتیں سرکشی کریں تو انہیں نظر بند کر دو۔ پھر بھی باز نہ آئیں تو انہیں جسمانی سزا دو (34/النساء) اور اس کا مطلب یہ نکالا جاتا ہے کہ اگر عورتیں اپنے شوہروں کی نافرمانی کریں تو شوہر انہیں مار بھی سکتے ہیں۔ یہ مفہوم بھی سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے کیونکہ یہاں بات میاں بیوی کی ہو ہی نہیں رہی بلکہ عام مردوں (الرجال) اور عام عورتوں (النساء) کی ہو رہی ہے۔ یعنی یہ حکم عائلی زندگی کے متعلق ہے ہی نہیں بلکہ معاشرتی زندگی کے متعلق ہے اور معاشرتی زندگی میں کسی کو سزا دینا کسی فرد کا کام نہیں بلکہ عدالت کا کام ہے۔ مثلاً قرآن میں جہاں یہ لکھا ہے کہ ''چور کے ہاتھ کاٹ ڈالو'' (38/المائدہ) ''زانی کو ایک سو کوڑے مارو'' (2/النور) تو کیا اس سے یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ جس کے ہاتھ بھی کوئی چور یا زانی لگے وہ اپنے طور پر ہی اسکے ہاتھ کاٹ دے یا اسے سو کوڑے لگا دے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان آیات میں ''کاٹ ڈالو'' اور ''مارو'' کا تخاطب عدالت کی طرف ہے۔ بالکل اسی طرح سرکش عورتوں کو سزا دینا بھی عدالت ہی کا کام ہے۔ رہا یہ سوال کہ سرکش عورتوں کو ہی سزا دینے کا حکم کیوں دیا گیا تو بات یہ ہے کہ یہ سورۃ ہی عورتوں کے متعلق ہے ورنہ قرآن سرکش مردوں کو بھی معاف نہیں کرتا (43/طٰہ)۔

عورت کو مرد سے کم تر ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ ''میت کے ترکے میں بیٹے کا حصہ بیٹی کے مقابلے میں دوگنا ہوتا ہے'' (11/النساء) لیکن اسی آیت میں یہ بھی تو لکھا ہے کہ ''اگر میت کی اولاد ہو تو اس کے ماں باپ کا حصہ برابر ہوگا اور اگر اولاد نہ ہو تو ماں کا حصہ باپ کے مقابلے میں دوگنا ہوگا'' (11/النساء)۔ کیا ''ماں'' عورت نہیں ہوتی یا ''باپ'' مرد نہیں ہوتا؟ وراثت میں مرد اور عورت کا حصہ مختلف حیثیتوں میں انکی مالی اور معاشرتی حالت کو سامنے رکھتے ہوئے مقرر کیا ہے جس سے یہ طے نہیں کیا جا سکتا کہ کون افضل اور کون کم تر ہے۔

یہ نکتہ بھی نکالا جاتا ہے کہ ایک مرد کو گواہی دو عورتوں کے برابر ہوتی ہے۔اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے ''جب آپس میں قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔۔۔۔۔ پھر اس پر دو مردوں کو گواہ بنا لیا کرو۔اور اگر دو مرد نہ مل سکیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنا لیا کرو تا کہ اگر ایک عورت الجھن میں پڑ جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے'' (282/البقرۃ)

اس بارے میں چار باتوں پر توجہ دیجئے۔پہلی یہ کہ دونوں عورتوں سے الگ الگ گواہی لینے کے لیے نہیں کہا گیا۔گواہی تو ایک ہی نے دینی ہے، ہاں اگر وہ الجھن کا شکار ہو جائے تو دوسری کا کام اسے یاد دلانا ہے لیکن وہ الجھن کا شکار ہی نہ ہو تو ظاہر ہے کہ دوسری کے بولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا، دوسری بات یہ کہ یہ حکم صرف قرض کے لین دین سے متعلق ہے ورنہ دیگر معاملات میں گواہی کے لیے مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں (4/النور، 156/النساء، 106/المائدہ، 2/الطلاق)، تیسری بات یہ کہ اسلامی معاشرے میں اکتساب رزق عام طور پر عورت کے ذمے نہیں ہوتا لہذا مالی معاملات میں عورت کا الجھن میں گرفتار ہونا کوئی عجیب بات نہیں۔اور چوتھی بات یہ کہ اگر عورت کی تربیت ایسی ہو جائے کہ اس بات کا اندیشہ ہی نہ رہے کہ وہ الجھن کا شکار ہوگی تو دوسری عورت کی موجودگی کی ضرورت ہی نہیں رہے گی بالکل ایسے ہی جیسے پانی میسر آ جائے تو تیمّم کا حکم ساقط العمل ہو جاتا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن کے بقول ''عورتوں کی چال بڑی گہری ہوتی ہے'' (28/یوسف) لیکن قرآن میں یہ بھی تو لکھا ہے کہ یہ قول خدا کا نہیں بلکہ زلیخا کے شوہر کا ہے جو اس نے زلیخا کی چالبازی کے حوالے سے کہا (27-25/یوسف)۔

ایک آیت کا یہ ٹکڑا بھی پیش کیا جاتا ہے کہ ''مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ حاصل ہے'' (228/البقرہ) لیکن پوری آیت کچھ اس طرح ہے کہ ''مردوں پر عورتوں کے حقوق (بالکل) ویسے ہی ہیں جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں۔البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ حاصل ہے وہ یہ کہ (مردوں کی عدت نہیں ہوتی جب کہ) عورتوں کی عدت ہوتی ہے''۔(228/البقرہ)

لیکن عورتوں کو بھی تو مردوں پر ایک درجہ حاصل ہے۔ وہ یہ کہ قرآن نکاح کے وقت عورت پر ''جہیز'' کی شرط تو عائد نہیں کرتا لیکن مرد پر ''مہر'' کی شرط ضرور عائد کرتا ہے (4,20,24/النساء، 236,237/البقرہ)

قرآن عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا زوج (یعنی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم) قرار دیتا ہے (11/الشوریٰ، 21/الروم) کیونکہ ''وہ ایک دوسرے میں سے ہیں'' (195/ال عمران) فرق صرف اتنا ہے کہ تقسیم کار کے اصول (جو ساری کائنات میں کارفرما ہے) کے مطابق عورت کے ذمے ایک کام ہے تو مرد کے ذمے دوسرا۔ بالکل ایسے ہی جیسے کان کا کام سننا اور آنکھ کا کام دیکھنا ہے۔ کیا کان کو آنکھ یا آنکھ کو کان سے افضل قرار دیا جا سکتا ہے؟

حضرت علامہ اقبالؒ کے بقول ''عورت کے بحیثیت عورت اور مرد کے بحیثیت مرد بعض خاص علیحدہ علیحدہ فرائض ہیں۔ ان فرائض میں اختلاف ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ عورت ادنیٰ ہے اور مرد اعلیٰ۔ فرائض کا اختلاف اور وجوہ پر مبنی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک مساوات کا تعلق ہے تو اسلام کے اندر مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں'' (اقبال اور عورت۔ ص ۸۸)

عورت کو مرد سے کم تر قرار دینا اسلامی تعلیمات سے انکار کے مترادف ہے کیونکہ قرآن کے مطابق پیدائش کے اعتبار سے ہر انسان (خود وہ مرد ہو یا عورت) یکساں طور پر واجب التکریم ہے (70/بنی اسرائیل) اور خدا کے نزدیک فضیلت کا معیار صرف اور صرف تقویٰ ہے (13/الحجرات)۔ اسی لیے تو حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ ''اللہ کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو متقی ہے'' (بخاری) ''اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے'' (مسلم)

روزنامہ خبریں، 10/3/2008

مایوس ہونے کی ضرورت نہیں

آئے روز ایسے لوگوں سے ملاقات ہوتی رہتی ہے جن کے حالات ان کا ساتھ نہیں دیتے۔انہیں ان کی تمام تر لگن اور ایمانداری کے باوجود وہ سب کچھ نہیں ملتا جو ملنا چاہیے۔کبھی سسٹم کی مجموعی خرابی آڑے آجاتی ہے تو کبھی کسی فرد کی انفرادی ہڈحرامی اور کرپشن ان کی محنت پر پانی پھیر دیتی ہے۔میں انہیں کہتا ہوں کہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں،کیا آپ نے کبھی پرندوں کو نہیں دیکھا؟ وہ کتنی جدوجہد اور کتنے خلوص سے ایک ایک تنکا نجانے کہاں کہاں سے اکٹھا کر کے اپنا گھونسلہ بناتے ہیں لیکن کوئی شریر بچہ ایک لمحے میں اسے توڑ دیتا ہے یا کوئی چیل،کوا،باز،سانپ انکے انڈوں اور بچوں کو کھا کر اسے اجاڑ دیتا ہے؟ پھر بھی وہ حوصلہ نہیں ہارتے،نہ گھونسلے بنانا بند کرتے ہیں نہ چہچہانا۔

میرے اپنے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا رہا کہ بڑی محبت کے ساتھ زندگی کی تصویر میں بار بار رنگ بھرنے کی کوشش کی لیکن رنگوں کے سوکھنے سے پہلے ہی کسی نے اسے خراب کر دیا۔کبھی اقربا پروری،رشوت اور سفارش کے باعث وہ سب کچھ کسی دوسرے کو مل گیا جو میرا حق تھا تو کبھی وسائل کی کمی عبور نہ ہونے والی رکاوٹ بن گئی لیکن جب سے میں نے ایک باپ بیٹے کی کہانی سنی ہے حوصلہ ہارنے کا سوال میرے قریب نہیں پھٹکتا اور میں ہار ہار کر بھی جیت جاتا ہوں۔یہ کہانی آج آپ کو بھی سنا دیتا ہوں۔

ایک ایتھلیٹ باپ کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اس کا بیٹا ایتھلیٹ بن کر ان تمام کامیابیوں سے ہمکنار ہو جن سے وہ خود نہیں ہو پایا،بیٹے کی اولین آرزو بھی یہی تھی کہ وہ باپ کے ادھورے خواب کو پورا کرے لیکن حالات و واقعات کو کچھ اور ہی منظور تھا۔بیٹا ایک حادثے میں ٹانگ تڑوا بیٹھا جو ٹھیک تو ہوئی لیکن کچھ اسطرح کہ جزوی معذوری ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی کا حصہ بن گئی۔

باپ بیٹے میں کچھ اسطرح کی محبت تھی کہ بیٹے کو اپنی ٹانگ کے ٹوٹنے سے کہیں زیادہ

دکھ اس بات کا تھا کہ باپ کا خواب چکنا چور ہو گیا جبکہ باپ کو اپنے خواب سے کہیں عزیز بیٹے کی آنکھوں کی وہ چمک تھی جو ماند پڑ چکی تھی۔ ایک روز بیٹے نے باپ کو بتایا کہ اس کے سکول میں اتھلیٹکس کے مقابلے ہو رہے ہیں اور وہ دوڑ میں حصہ لے رہا ہے۔ باپ کو حیرت بھی ہوئی اور تشویش بھی، حیرت اس لیے کہ ٹانگ سے معذور بچے کو مقابلے میں دوڑنے کی اجازت کیسے مل گئی اور تشویش اس لیے کہ وہ سب سے پیچھے بلکہ بہت پیچھے رہ جائے گا، ہوسکتا ہے وہ ریس مکمل بھی نہ کر سکے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے لنگڑاتے ہوئے دوڑتا دیکھ کر نا سمجھ بچے اس پر ہنسیں جس سے اس کا دل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے؟

باپ نے پرنسپل سے رابطہ کر کے بیٹے کے ریس میں حصہ لینے پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا تو جواب ملا کہ یہی خدشات انہیں بھی لاحق تھے لیکن جب بیٹے نے کہا کہ میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا یہ ہے کہ میرے والد صاحب مجھے ایک مرتبہ ریس میں حصہ لیتے ہوئے دیکھ لیں جس کے بعد چاہے مر ہی کیوں نہ جاؤں، تو اساتذہ کے دل میں یہ ڈر پیدا ہوا کہ کہیں اسے اجازت نہ دینے سے وہ سب کچھ نہ ہو جائے جو ہمارے خیال میں اجازت دینے سے ہو سکتا ہے؟

ریس کے روز باپ نے خود اپنے بیٹے کی نیکر اور شرٹ استری کر کے اسے دی، یہ کپڑے پہن کر بیٹے کی آنکھوں میں باپ کو یکدم وہ چمک دکھائی دی جس کی امید وہ کھو چکا تھا اور اسے محسوس ہوا کہ اتنی خوشی تو بیٹے کے ورلڈ چیمپین بننے پر بھی نہیں مل سکتی تھی۔ اس نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا تو اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو تیرنے لگے لیکن اس نے انہیں بہنے نہیں دیا اور بیٹے کو سینے سے الگ کرنے سے پہلے ہی پی لیا کہ کہیں بیٹے کا حوصلہ کمزور نہ پڑ جائے۔

ریس شروع ہونے سے پہلے بیٹے نے باپ کی طرف دیکھا، باپ نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ہلا کر اس کا خیر مقدم کیا اور اس کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ وہ بڑی جواں مردی اور جاں فشانی سے بھاگا لیکن ٹوٹی ہوئی ٹانگ نے ساتھ نہ دیا اور وہ گر گیا، اس نے بے چارگی اور مایوسی

کے عالم میں باپ کی طرف دیکھا لیکن وہاں اب بھی پہلے والی گرم جوشی ہی دکھائی دی، وہ ایک مرتبہ پھر اٹھا اور پوری قوت سے بھاگنا شروع کر دیا لیکن ٹانگ نے اس مرتبہ بھی ساتھ نہ دیا اور وہ ایک مرتبہ پھر گر گیا۔ وہ چار مرتبہ گرا لیکن چاروں مرتبہ اٹھ کر پہلے ہی جیسی شد و مد سے بھاگا، آخری نمبر پر تو آیا لیکن وہاں موجود لوگوں کی توقعات کے برعکس اس نے ریس ضرور مکمل کر لی۔

باپ نے فرطِ جذبات سے اسے گلے لگا لیا اور بہت پیار کیا لیکن اس مرتبہ وہ اپنے آنسو بیٹے کی نظروں سے نہ چھپا سکا۔ بیٹے نے بھری ہوئی آواز میں کہا کہ ابا مجھے بہت دکھ ہے کہ میں ریس جیت نہیں سکا، اگر میری ٹانگ خراب نہ ہوتی تو میں آپ کے لیے یہ ریس ضرور جیت لیتا اور اس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری ہو گئے۔ باپ نے اسے ایک مرتبہ پھر سینے سے لگا لیا اور کہا کہ بیٹا تمھاری ٹانگ ٹھیک ہوتی تو تم یہ ریس ایک ہی مرتبہ جیت سکتے تھے لیکن خراب ٹانگ کی وجہ سے تم نے یہ ریس چار مرتبہ جیتی، تم چار مرتبہ گرے لیکن ہمت ہارنے کے بجائے ہر مرتبہ اٹھ کر پہلے ہی جیسے حوصلے سے بھاگے، مجھے آج تم پر جتنا فخر ہے اتنا تمھارے ورلڈ چیمپین بننے پر بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کہانی کی سمجھ اگر آپ کو آ گئی تو یہ سمجھنے میں بھی مشکل نہیں ہو گی کہ آپ چاہیں تو آپ کی ہر ناکامی کامیابی میں تبدیل ہو سکتی ہے اور جن لوگوں کے حالات سازگار ہوتے ہیں وہ تو ایک مقابلہ ایک ہی مرتبہ جیتتے ہیں لیکن جنکے حالات سازگار نہیں ہوتے وہ تو کئی کئی مرتبہ فتح مند ہو سکتے ہیں۔

روزنامہ جناح، 13/7/2009

''دریچہ''

سید ضمیر جعفری کے بارے میں بشیر مراد اپنی عمدہ کتاب ''بے ادبیاں'' میں کیا خوب لکھتے ہیں کہ ''سید ضمیر جعفری کے نام سے ناواقفی اپنے ہی ضمیر سے ناآشنائی کے جرم میں شمار ہوتی ہے کہ دونوں میں غضب کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں کے نام ایک، کام بھی ایک، دونوں سچ بولتے ہیں، دونوں کی کوئی نہیں سنتا، دونوں بیدار رہنے پر بضد، دونوں کو لوگ آرام کا مشورہ دیتے ہیں۔ اصرار بڑھ جائے تو اچھے برے کی تمیز واضع ہو جاتی ہے۔ ایک مشورہ مان کر سونے پر تیار ہو جاتا ہے اور دوسرا مشورہ زن پر خندہ زن اپنی ہی ترنگ میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور یہی والا ضمیر جعفری کہلاتا ہے''۔

ضمیر جعفری کسی سے ملنے جاتے اور وہ نہ ملتا تو اس کے لیے کہ یہ رقعہ چھوڑ آتے کہ ''ضمیر حاضر، آپ غائب''۔ طبیعت کی شائستگی اور شستگی کے باعث انہوں نے (ان کے اپنے بقول) بڑھاپے کو کیلنڈر کے ساتھ نہ آنے دیا اور بڑھاپے میں بھی ایسی بھرپور زندگی بسر کی جیسی عام لوگ جوانی میں بھی نہیں کرتے۔ وہ اور میں، دن بھر کی شہر گردی کے بعد ایک رات 12 بجے کے قریب گھر لوٹے تو ان کے ایک دیرینہ دوست جہلم سے آئے ہوئے تھے۔ دوست نے گلے ملنے کے فوراً بعد ہلکے پھلکے انداز میں ان سے کہا کہ آپ کا انتظار کرتے کرتے پورا ایک دن بیت گیا، آپ سے ملے بغیر اس ڈر سے سویا بھی نہیں کہ کہیں صبح میرے اٹھنے سے پہلے ہی آپ پھر کہیں چلے نہ جائیں، آپ 80 سال کے ہونے والے ہیں پھر بھی بوڑھے نہیں ہو رہے؟ ضمیر صاحب صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے بڑی بے چارگی سے بولے کہ یار کیا کروں مصروفیت اتنی ہے کہ بوڑھا ہونے کی فرصت بھی نہیں ملتی۔

گھر لوٹنے میں زیادہ دیر ہو جاتی تو اماں جی (ضمیر صاحب کی اہلیہ) اپنی ڈانٹ سمیت انتظار کر رہی ہوتیں۔ وہ کچھ دیر ان کے سامنے بیٹھ کر بڑے تامل سے ان کی ڈانٹ سنتے، پھر جب محسوس کرتے کہ ان کے غصے میں کچھ کمی آ گئی ہے تو بڑی خاموشی کے ساتھ اٹھ کر

ہاتھ منہ دھونے اور کپڑے بدلنے چلے جاتے لیکن باتھ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھلا چھوڑ دیتے جہاں سے ہاتھ منہ دھوتے ہوئے بھی ہلکا پھلکا احتجاج ریکارڈ کرواتے رہتے تاکہ اماں جی کو یہ احساس ہوتا رہے کہ وہ ان کی باتیں سن رہے ہیں، باقی کی ڈانٹ تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر سنتے اور ڈانٹ سنتے سنتے ہی سو جاتے جس پر اماں جی بے اختیار مسکرانے لگتیں۔

ضمیر جعفری کے اندر ایک بڑا ہی شفیق انسان آباد تھا۔ میرے نام امریکہ سے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''امریکہ میں بہت آرام ہے، پزیرائی بھی بڑی ہو رہی ہے، پاکستانی روپئے کے حساب سے کمائی بھی کم نہیں مگر تمھارے اور انعام الحق جاوید اور ایک دو اور دوستوں کے بغیر یہاں جی نہیں لگتا ورنہ اگر میں چاہوں تو مجھے گرین کارڈ مل سکتا ہے جس کی خواہش میں اس ڈر سے نہیں کر رہا کہ کہیں مل ہی نہ جائے''۔

ضمیر جعفری کو بڑی خوبصورت باتیں آتی تھیں، مجھے لکھے ایک اور خط میں بشیر مراد کے لیے لکھا یہ پیغام دیکھیئے کہ ''مراد صاحب سے کہیے کہ وہ جو ہم نے ان سے کشمیر کے موضوع پر ایک اسٹیج ڈرامہ لکھنے کو کہا تھا تو مراد، ہماری یہ مراد کب پوری کریں گے؟ اس 'قلم گھسائی' کے لیے جیسا میں نے ان سے کہا 500 روپئے ان کی نذر کر دیے جائیں گے۔ یہ رقم وہ صاحب دیں گے جن کی یہ فرمائش ہے ورنہ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں''۔

ضمیر جعفری کی نثر کی طرح انکی شاعری بھی اپنی مثال آپ ہے، یہی ایک مزاحیہ شعر دیکھ لیجئے جس کا ثانی نہیں ملتا کہ

حضرتِ اقبال کا شاہین کب کا اُڑ چکا
اب کوئی اپنا مقامی جانور پیدا کرو

انہیں یونہی تو شہنشاہِ ظرافت نہیں کہا جاتا۔ یہ نایاب مصرعہ بھی انہی کا ہے کہ ''وہ تو خاموش تھے جہالت سے لوگ انہیں فلسفی سمجھنے لگے''۔ وہ زیادہ تر مزاحیہ شاعری کے حوالے سے جانے پہچانے جاتے ہیں لیکن سنجیدہ شاعری بھی بڑی عمدہ کرتے تھے، یہ اشعار دیکھیے کہ

کچھ ننگے بچے بے گھر ہو جائیں گے
کچے کوٹھوں پر موسم برسات کا ہے
آج کی دلہن کو جہیز میں مل نہ سکا
جوڑا جو کاتا ہوا ماں کے ہاتھ کا ہے

ضمیر جعفری اپنی مٹی سے بڑی محبت کرتے تھے۔انہیں کشمیر سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے اقوامِ متحدہ کی قراردادوں اور کشمیریوں کے استصوابِ رائے کے حق میں ایک یاداشت پر انہوں نے برِصغیر کے ہزاروں اہلِ قلم کے دستخط لیے اور یہ یاداشت اقوامِ متحدہ کو بھجوائی۔مسئلہ کشمیر ہی کی وجہ سے انہوں نے وہ مہان بھارتی ایوارڈ بھی ٹھکرا دیا جس کے لیے انہیں منتخب کیا گیا تھا۔

ضمیر جعفری نے اتنی کتابیں لکھیں جن کے نام بھی انہیں یاد نہیں تھے۔نام تو دور کی بات،انہیں تو اپنی تصانیف کی تعداد تک معلوم نہ تھی۔اس حوالے سے بس اتنا ہی کہا کرتے تھے کہ ''پچاس ساٹھ تو ہونی ہی چاہئیں''۔وہ ایک کالم نگار کی حیثیت سے بھی ایک طویل عرصے تک قلم سے منسلک رہے۔ان کے کالم ''ضمیر حاضر ضمیر غائب'' اور ''دریچہ'' کے عنوان سے چھپا کرتے تھے۔بشیر مراد نے کیا خوب لکھا کہ ''ضمیر جعفری کی پیرانہ سالی میں کوئی خشک سالی نہیں آئی،آپ کی عمر میں لوگوں پر بڑھاپا حاوی ہوتا ہے لیکن آپ بڑھاپے پر حاوی تھے اور اتنی بری طرح کہ بیچارے کو سر ابھارنے کا موقع ہی نہیں دیتے تھے''۔

ضمیر جعفری کو سٹر سے اترتے ہوئے اپنی ٹانگ نہ تڑوا بیٹھتے تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں جوان رہنے سے نہیں روک سکتی تھی۔اس حادثے کے اگلے روز راولپنڈی سی ایم ایچ میں ان سے پوچھا کہ جب آپ گاڑی سے اتر رہے تھے تو کیا گاڑی نے چلنے میں جلدی کر دی؟ وہ بڑی بے ساختگی اور معصومیت سے بولے کہ نہیں،میں نے اترنے میں جلدی کر دی تھی۔ٹانگ ٹوٹنے کے بعد ان کے اپنے بقول انہیں پہلی بار اس بات کا احساس شدت سے ہوا کہ وہ بوڑھے ہو

چکے ہیں۔ یہ حادثہ نہ ہوتا تو وہ یقیناً امریکہ بھی نہ جاتے جہاں سے واپس نہیں آ سکے۔ میں انہیں مرا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا، اس لیے ان کے جنازے میں شریک نہیں ہوا، نہ ہی آج تک ان کی قبر پر گیا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ اب بھی امریکہ میں ہی ہیں جہاں سے اچانک کسی روز ان کا کوئی خط موصول ہوگا یا آنے کی کوئی اطلاع آئے گی۔

بہت پریشان ہو جاؤں یا ان کی بہت یاد آئے تو کئی مرتبہ انہیں خواب میں دیکھتا ہوں، وہ مجھے سینے سے لگاتے ہیں، میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہیں اور میرا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ وہ اکثر اپنے یہ اشعار اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ مجھے سناتے ہیں کہ

دل کے کن کن ارمانوں سے اپنا پیار نبھاؤں میں
مٹی پر سوتے سوتے اٹھوں تو اڑنا چاہوں میں
جسم کا چاؤ اگن الاؤ روح میں سرد اداسی بھی
میں بستی کا باسی بھی میں جنگل کا سنیاسی بھی

روزنامہ خبریں، 18/5/2007

''ضمیر حاضر ضمیر غائب''

سید ضمیر جعفری 12 مئی کو ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے تھے۔ان کا انتقال امریکہ میں ہوا تھا۔انتقال سے پہلے وہ شدید علیل رہے۔آخری بار امریکہ گئے تو ائرپورٹ پر انہیں رخصت کرنے والا آخری دوست میں ہی تھا۔وہ خود تو امریکہ سے واپس نہ آسکے لیکن ان کے خط آتے رہتے تھے جو کسی بہت بڑے خزانے کی طرح آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ انکی علالت سے پہلے جو آخری خط انہوں نے مجھے لکھا اسے ان کی ہر برسی پر کم از کم دو مرتبہ ضرور پڑھتا ہوں،آج کے کالم میں وہی خط آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں،اپنی ذاتی یاداشتوں کے حوالے سے ان کے بارے میں بات چیت اگلے کسی کالم میں ہوگی۔

پیارے اسرار! دعائیں! تمہارا خط کل (13/09/96) کی سہ پہر کو ملا۔اور دو مرتبہ پڑھنے اور بیوی کو سنانے کے بعد میں اسی وقت یہ خط لکھنے لگ گیا جو کل (14/09/96) کو پوسٹ ہوگا۔کسی خط کے جواب میں اتنی عجلت ہم سے کم ہی سرزد ہوسکی۔مگر تمہاری تحریر دیکھنے کو ترسا ہوا بھی تو بہت تھا۔میں تمہارے سکوت پر خاصا پریشان ہو رہا تھا۔ایسا دن مجھ پر بھی نہیں آیا کہ تمہاری یاد میرے ہونٹوں سے بولی نہ ہو یا گزری نہ ہو۔خط لکھنے کا سوچتا تو یہ سوچ کر کل پر ملتوی کر دیتا کہ شاید آج کی ڈاک سے اسرار کا خط آجائے۔ یہاں ایک پریشانی سے بھی گزرنا پڑا۔اہلیہ کو دل کی تکلیف ہوئی تو انہیں ہسپتال میں داخل کرنا پڑا۔الحمداللہ اب روبصحت ہیں۔اور گھر پر علاج ہو رہا ہے۔یہاں (امریکہ) کی حکومت اپنے شہریوں کی تو اولاد کی طرح دیکھ بھال کرتی ہے مگر ہم جیسے ''سیاحوں'' کی کفیل نہیں ہوتی اور علاج اتنا مہنگا ہے کہ ڈاکٹر مریض کو حتی الوسعی مرنے تو نہیں دیتے مگر اس کا گھر اُجاڑ دیتے ہیں۔اکتوبر کے آواخر میں واپسی کا ارادہ ہے۔انشااللہ۔

اس خط سے آپ کی پریشانیوں کے علم سے دکھ ہوا مگر مجھے اسی خط سے آپ کی زندگی کا ایک روشن راستہ بھی نکلتا دکھائی دے رہا ہے،دیکھو! دل نہیں ہارنا۔تم ابھی زندگی کی دہلیز پر ہی تو

ہو۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ آپ سردار محمد ابراہیم خان کی نگاہ میں آ گئے۔ وہ انسانوں کے پارکھ بھی ہیں اور ذاتی و خاندانی اعتبار سے شرافت اور وضع داری کا اعلیٰ نمونہ بھی۔ میں نے تو جب یہاں امریکہ میں سنا کہ پیپلز پارٹی ان کو صدر بنا رہی ہے تو میں نے اس پارٹی کے سارے ''گناہ'' معاف کر دیے۔ ان کے صدر بننے سے آزاد کشمیر کا وقار بڑھ گیا ہے۔ سردار محمد ابراہیم خان کشمیر کی شناخت کی پہلی علامتوں میں سے ہیں۔

فدا صاحب کے حادثے کا آپ نے ائر پورٹ پر تذکرہ کیا تھا۔ یہ سن کر صدمہ ہوا کہ ان کو اتنی لمبی اذیت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جوان رعنا اور شریف سیدزادے تک ہماری دعائیں اور محبتیں پہنچا دیں۔ میری اہلیہ آپ کی طرح فدا کو بھی اپنے بچوں کی طرح سمجھتی ہیں اور آپ دونوں کے نام اپنی دعاؤں میں کبھی بھولتی نہیں۔ بشیر مراد، مسعود الحسن بخاری اور ایبٹ آباد کے میجر راحت بٹ تک میری دعائیں پہنچا دیں۔ ڈاکٹر انعام الحق جاوید کے کیا کہنے ہیں۔ یار باشی میں اپنی مثال آپ ہے۔ ہمارا تو وہ اسلام آباد میں ''وائے سرائے'' ٹھہرا۔ آپ سے یہ شخص بہت پیار کرتا ہے۔ مجھے بعض اوقات حیرت ہوتی ہے کہ محبتوں اور مراسم میں ریزہ ریزہ ہونے کے باوجود وہ سالم کا سالم اور پورے کا پورا موجود ہے۔

یہاں مجھے جو پزیرائی ملی اس پر اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ کینڈا گھوم آیا۔ 08 ستمبر کو نیویارک کی انجمن اردو نے ہمارا بھرپور ''جشنِ ضمیر'' منا ڈالا۔ اہتمام ایک اعلیٰ ہوٹل میں کیا گیا۔ پانچ سو مدعوئین کو عشائیہ دیا گیا۔ امریکہ میں مقیم ہر قابلِ ذکر ادیب اس تقریب میں موجود تھا۔ تقریبات کی صدارتوں کی مجھ پر بارش ہو رہی ہے۔ 11 ستمبر کو ایک ایسے عوامی جلسے کی صدارت کی آزمائش آ پڑی جس کا اہتمام جناب غلام مصطفیٰ جتوئی جناب حکیم محمد سعید جناب عبدالستار ایدھی اور جناب انصار برنی کے اعزاز میں کیا گیا۔ میں نے منتظمین سے عرض بھی کیا کہ صاحبو یہ صاحبان تو صدر لغاری کے قابو آنے والے نہیں۔ میں کس کھیت کی مولی ہوں ۔اللہ پاک نے آبرو رکھ لی۔

صدارت تو ں ہی کی نہیں مجھ پر ''ڈالروں'' کی بھی بارش ہو رہی ہے۔ میرے ساتھ میرے رب نے کچھ عجیب معاہدہ کر رکھا ہے کہ وہ مجھے تنگ دست بھی نہیں رہنے دیتا اور آسودہ بھی نہیں رہنے دیتا۔ اگر یہ روپیہ میرے ہاتھ لگ جاتا تو میں وطن آ کر دو تین برس فراغت سے بسر کر سکتا تھا۔ مگر چلو بیوی کے علاج میں بیٹے کا کچھ ہاتھ تو بٹا دیا۔ قدرت نے یہ انتظام بھی شاید اسی ضرورت کے لئے کیا تھا۔

تمہاری غزلیں نظمیں دیکھ کر جی بہت خوش ہوا۔ مصرعے پہلے سے زیادہ مضبوط ہیں اور اثر کا جمالیاتی ریشم اور زیادہ ملائم ہوا۔ ''اللہ ہو'' والی حمد بے حد اثر آفرین ہے۔ غزل میں کئی اشعار تڑپا دینے والے ہیں مثلاً

کس طرح تجھ کو دیکھ پاؤنگا
تو اگر دیکھتا رہا مجھ کو

غم نے کتنا بدل دیا اسرار
مجھ سے وہ پوچھتا رہا مجھ کو

کتنا بے بس ہوں تیرے آگے میں
بس یہی حوصلہ رہا مجھ کو

اسرار! ایک عجیب ماجرا ہوا۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک غزل کہی جو ابھی کہیں شائع نہیں ہوئی البتہ مشاعروں میں پڑھ چکا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ اسی زمین میں مگر چھوٹی بحر میں تم نے بھی غزل کہی۔ اسے کہتے ہیں دل کی دل سے راہ ہونا۔ اس زمین میں تم نے بڑے اچھے شعر نکالے مثلاً

کون ہے پیچھے ہمارا منتظر
لوٹ تو جائیں مگر کس کے لئے

ہمارے شعر کچھ اس طرح کے ہیں:

شب کے اندر ہے چراغانِ سحر کس کے لئے
سو نہیں سکتے ستارے رات بھر کس کے لئے
کیوں بھری چلتی ہوئی گلیاں ہیں ویراں اس قدر
منتظر ہیں شہر کی دیوار و در کس کے لئے
میں ہوں جس دنیا میں یا رب یہ بڑی تاریک ہے
آسماں پر ہیں ترے شمس و قمر کس کے لئے
اے مری خانہ بدوشی اے مری آوارگی
اتنا مشکل اس قدر لمبا سفر کس کے لئے
جب تمہارے لفظ ان ہونٹوں تک آتے ہی نہیں
شعر تو کہتے ہو میری جاں مگر کس کے لئے
کون ہے یہ جس کا استقبال ہے جاں سے عزیز
لوگ ہاتھوں میں لئے پھرتے ہیں سر کس کے لئے
دل میں کوئی آرزو ہی جب نہیں باقی ضمیر
پھر سجا رکھا ہے تو نے اپنا گھر کس کے لئے

والسلام

تمہارا ضمیر

110, MONTAGUE (ST:S)

Valley Stream (N.Y)

New York Zip 11580 U.S.A

روزنامہ خبریں، 15/5/2007

ایسا حکمران چاھیے

ورلڈ بینک کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ ''نسل کشی کا یہ کارکن معاشی آمریت قائم کرنے کی جدوجہد میں سرگرمِ عمل ہے'' اور انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ''یہ نیوٹرون بم ہے جو انسانوں کو تو مار دیتا ہے لیکن عمارتیں صحیح سلامت رہتی ہیں''۔

انہوں نے ایک ایسے باپ کی انگلی تھام کر زندگی کی راہوں میں چلنا سیکھا جو بیک وقت غریب بھی تھا اور تعلیم یافتہ بھی۔ ان کا دل بچپن سے ہی محنت کشوں کی محبت سے مالا مال اور جھولی علم کی خوشبو سے بھری ہوئی تھی۔ خاندانی پیشہ تو کھیتی باڑی تھا لیکن ان کے والد پڑھ لکھ کر درس و تدریس سے منسلک ہو گئے تھے۔ غیرت مندی اور خودداری کا بنیادی سبق انہوں نے اپنے والد سے ہی پڑھا بھی اور سیکھا بھی۔

ابتدائی تعلیم کے بعد نامساعد حالات نے فوج میں جانے پر مجبور کر دیا۔ ملٹری اکیڈمی میں ان کی کارکردگی شاندار رہی۔ کمیشن حاصل کرنے کے بعد وہ اپنی غیر معمولی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی بنا پر جلد ہی ان چاک و چوبند افسران میں شمار کیے جانے لگے جنہیں آگے چل کر جرنیلی کی دوڑ میں شامل ہونا ہوتا ہے لیکن ایک کتاب نے انکی ترجیحات کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ یہ کتاب جن دنوں انکے ہاتھ لگی وہ گوریلوں کے خلاف کاروائی میں مصروف ایک فوجی یونٹ میں تعینات تھے۔ ان دنوں کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں کہ ''پہاڑوں میں تاروں سے بھری ہوئی ایک خوبصورت رات تھی، میں اپنے کمرے میں پلیخانوف کی کتاب 'تاریخ میں فرد کا کردار' مشعل کی روشنی میں پڑھ رہا تھا۔ اس کتاب نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ میں فوج میں کیا کر رہا ہوں اور یہ سوچ کر میں اداس ہو گیا''۔

اس کتاب نے ان کے دل و دماغ میں معاشی ناہمواری اور طبقاتی تفریق کے خلاف سلگنے والی چنگاری کو ایسی ہوا دی کہ وہ بھڑک کر شعلہ بن گئی۔ اس شعلے نے اہلِ اقتدار سے مایوس کئی افسروں اور جوانوں کے اردگرد چھائی ہوئی تاریکی میں امید کی شمعیں روشن کر دیں۔ انہی ہم خیال

ساتھیوں کی مدد سے انہیں نے 1992 میں فوجی بغاوت کی، جو ناکام ہوگئی۔ان کے کئی ساتھی ہلاک ہوئے اور انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ دو سال قید کاٹنے کے بعد 1994 میں انہیں رہائی ملی تو انہوں نے جبر واستبداد کے خلاف سیاسی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔

ان کے سیاسی ایجنڈے میں غربت اور کرپشن کا خاتمہ سرِ فہرست تھا۔غربت اور کرپشن کی بنیادی وجہ امریکہ کو قرار دیتے تھے جو اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ان کے ملک میں حکومتیں بناتا اور گراتا رہتا تھا۔ان کے نصب العین کو اس لیے بڑی پزیرائی ملی کہ عوام کی اکثریت امریکہ نواز کٹھ پتلی حکومتوں کے ظلم سے تنگ آ چکی تھا۔1999 میں انہوں نے صدارتی الیکشن میں کامیابی حاصل کی اور تب سے آج تک کوئی انہیں ہرا نہیں سکا۔صدر بننے کے بعد انکی جدوجہد ختم نہیں ہوئی بلکہ ایک نئے دور میں داخل ہوگئی اور انہوں نے اپنے نصب العین کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔

انکے خیال میں جہالت کو مٹائے بغیر غربت اور کرپشن کا خاتمہ ناممکن ہے،اسی لیے انہوں نے تعلیم کے میدان میں ایسے انقلابی اقدامات کیے کہ صرف دو برس کے اندر پرائمری سکولوں میں داخلہ لینے والے بچوں کی تعداد میں کم وبیش 10 لاکھ کا اضافہ ہوا۔ وہ اپنے ملک کے تعلیمی نظام کو ترقی کے کس مقام پر لے آئے ،اس کا اندازہ اسی ایک بات سے با آسانی کیا جا سکتا ہے کہ وہاں اس سال کم وبیش 13 لاکھ سے زائد طالبِ علموں نے گریجوایشن کا امتحان پاس کیا، یہ تعداد جب وہ صدر بنے تھے، چند ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ تعلیمِ بالغاں کے مراکز بھی قائم کیے گئے جن سے صرف 7 برس کے دوران 15 لاکھ لوگ فیض یاب ہو چکے ہیں۔تعلیمی اصلاحات کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ ان کے ملک کی شرح خواندگی 94 فیصد تک پہنچ چکی ہے۔

معاشی پالیسی کی کامیابی کا احاطہ ان حقائق سے کر لیجئے کہ افراطِ زر 40 فیصد سے گھٹ کر 12 فیصد پر آ گیا اور معاشی ترقی کی شرحِ نمو جو ان کے دورِ حکومت کے پہلے دو برس میں 4 فیصد تک پہنچ گئی تھی ،اب 9 فیصد تک پہنچ چکی ہے۔انہوں نے اس دولت کا رخ عوام کو جانب موڑ دیا جو چند ہاتھوں میں محصور ہو چکی تھی۔تمام شہریوں کی صحت وتعلیم کے اخراجات حکومت نے

اپنے ذمے لے لیے۔غریب عوام کے لیے غذا فراہم کرنے والے مراکز قائم کئے گئے، جہاں سے ہرکسی کو بلاتخصیص ہر وقت پیٹ بھر کر کھانا ملتا ہے۔ چاہے کوئی کتنا ہی غریب کیوں نہ ہوا سے بھوکا نہیں رہنا پڑتا۔

وینز ویلا کی غریب عوام انہیں دیوتا کا درجہ دیتی ہے اور ان کا نام ہیوگوشاویز ہے جو امریکہ کو کرہ ءارض پر لعنت سمجھتے ہیں اور اس کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔انہوں نے وینز ویلا کی سرزمین کو امریکہ نواز لوگوں کے لیے اسقدر تنگ کر دیا کہ ان کی اکثریت وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئی۔سب سے پہلے انہوں نے تیل کی صنعت قومیائی اور پھر ورلڈ بینک اور انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ جیسے اداروں سے آزادی حاصل کر کے اپنے ملک کو خودمختاری کی راہ پر ڈال دیا تا کہ امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی جا سکے۔

انہوں نے روس اور چین کے ساتھ دفاعی تعلقات استوار کیے اور امریکہ کے خلاف ایک اتحاد بھی قائم کیا جس میں کیوبا، ارجنٹائن، برازیل، سپین، نکاراگوا وغیرہ شامل ہیں۔اس اتحاد کو مستحکم کرنے کے لیے انہوں نے وینز ویلا کی بے بہا دولت سے اتحادی ممالک کے قرضے تک اتارنے شروع کر دیے تا کہ وہ ان زنجیروں سے آزاد ہو سکیں جو انہیں امریکہ کا آلہ دار بننے پر مجبور کرتی ہیں۔وینز ویلا 75 ارب بیرل تیل اور 4.191 ٹریلین کیوبک فٹ گیس کے ذخائر رکھنے والا ملک ہے جہاں امریکہ نواز حکومتوں کی ناکامی سے امریکہ کی معیشت کو ایسا نقصان پہنچا کہ جس کی تلافی بظاہر ممکن دکھائی نہیں دیتی۔

شاویز نے تیسری دنیا میں شمار کیے جانے والے اپنے ملک کو بڑے مختصر سے عرصے میں صفِ اول کے ممالک میں لا کھڑا کیا اور اتنی طاقتور حیثیت حاصل کر لی کہ اقوامِ متحدہ کے اجلاس میں ساری دنیا کے سامنے امریکہ جیسے ملک کے بش جیسے حکمران کو ''شیطان'' کہہ کر پکارا لیکن کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔اپنے ملک میں انکی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ تین مرتبہ صدر منتخب ہو چکے ہیں، تیسری مرتبہ انہوں نے 65 فیصد ووٹ حاصل کیے جبکہ انکے حریف مینوئل روزلیس

صرف 30 فیصد لے سکے۔

شاویز کا نصب العین، مشہور امریکی دانشور سائمن بولیوار (1783-1830) کے اس سیدھے سادے سے فلسفے پر قائم ہے کہ ''دوسروں کے لیے ہرگز آلہء کار نہ بنو، اپنا معاشی اور سیاسی انقلاب خود برپا کرو اور ہر قسم کی آمریت اور شہنشاہئیت کے خلاف صف آرا ہو جاؤ''۔

ایسے ہی لیڈر کی ضرورت ہمیں بھی ہے اور فوری طور پر ہے جو پاکستان کو امریکہ کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بننے سے بچائے، جو اپنے ملک کے مفادات کو ہر دوسرے ملک کے مفادات پر ترجیح دے، جو وطنِ عزیز کے وسائل بیچ کر کھانے کے بجائے انکی حفاظت کرے، جو اپنی اور اپنے خوشامدیوں کی جیبیں بھرنے کی بجائے خزانہ ء سرکار میں اضافے کا باعث بنے، جو معاشی و معاشرتی مساوات کو فروغ دے، جو ہمیں غربت و بدامنی کے بے رحم چنگل سے نجات دلائے، جو تعلیم کو عام کرے، جو حقیقی جمہوریت کی راہ پر چلے، جو عوام کی رائے کو اپنی یا اپنے حواریوں کی رائے پر فوقیت دے اور پاکستان کو تیسری دنیا سے نکال کر پہلی دنیا میں پہنچا دے۔

روزنامہ خبریں، 28/12/2006

اک وہ اک ہم

ایک لڑکی نے مجھے ابھی موبائل پر بتایا ہے کہ اس کے کچھ اسلحہ بردار رشتہ داروں نے اس کے گھر کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اور وہ اپنی بوڑھی ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں سمیت ایک کمرے میں محصور ہو کر رہ گئی ہے، ان کی زندگی خطرے میں ہے۔ یہ بات برطانیہ سے آئے ہوئے میرے بہت ہی پیارے دوست سہیل بشیر نے مجھے بتائی اور میں نے پوچھا کہ وہ لڑکی ہے کون اور رہتی کہاں ہے؟ وہ بولے کہ برطانیہ سے آئی ہے، وہاں میرے پڑوس میں رہتی ہے، کچھ عرصہ میرے پاس ملازمت بھی کرتی رہی، بڑی مظلوم ہے، اس کی دکھ بھری داستان بعد میں سناؤں گا، فی الحال تو ہمیں اس کی مدد کے لیے کچھ کرنا چاہیے اور اس وقت وہ اپنے گاؤں میں ہے جو صوابی کا ایک نواحی علاقہ ہے؟

سہیل بشیر کی بات سن کر توجہ صوبہ سرحد میں تعینات ایک ایس ایس پی کی جانب منتقل ہوگئی جن سے کافی اچھی جان پہچان ہے، انہیں فون کیا اور مسئلہ بتایا تو وہ بولے کہ لڑکی کا گاؤں میرے علاقے سے تقریباً 100 کلومیٹر دور ہے، اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں نے کہا کہ میں نے آپ کو وہاں جانے کے لیے تو نہیں کہا، کیا آپ وائرلیس، موبائل یا ٹیلی فون کے ذریعے وہاں کی پولیس سے رابطہ نہیں کر سکتے؟ کیا رات کے ساڑھے بارہ بجے کسی معصوم و مجبور کی جان بچانا پولیس کے فرائض میں شامل نہیں؟ وہ بولے کہ میرا اپنا ضلع ہوتا تو اسے بچانا ضرور میرے فرائض میں شامل ہوتا لیکن یہ معاملہ تو کسی اور ضلع سے متعلق ہے؟ میں نے مذید وقت ضائع کرنے کے بجائے فون بند کر دیا، اس دوران سہیل بشیر کو لڑکی کا فون دوبارہ آ چکا تھا اور وہ یہ کہہ کر اس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے کہ ایک پولیس افسر سے بات ہو رہی ہے، تمھاری مشکل جلد آسان ہونے والی ہے۔ اسے خدا حافظ کہہ کر کے سہیل نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا، میں نے ایس ایس پی کے جواب سے آگاہ کیا تو وہ بڑی حیرانی اور پریشانی کے عالم

میں بولے کہ یار یہ کیسی پولیس ہے اِدھر ایس ایس پی کا حال یہ ہے کہ وہ آئیں بائیں شائیں کر رہا ہے اور اُدھر اس لڑکی کے بقول وہ گزشتہ ڈیڑھ گھنٹے سے متعلقہ تھانے کا نمبر ملا رہی ہے لیکن کوئی فون ہی نہیں اٹھا رہا؟ پھر اچانک کچھ سوچ کر ان کی آنکھیں چمک اٹھیں، وہ بولے کہ میرے ذہن میں ہی نہیں رہا کہ اس لڑکی کے پاس تو برطانیہ کی شہریت بھی ہے، مجھے برطانیہ کے سفارت خانے سے رابطہ کرنا چاہیے اور پھر انہوں نے وہاں کا نمبر ملا دیا، دوسری ہی گھنٹی پر ہی فون اٹھا لیا گیا۔ سہیل بشیر نے آپریٹر کو مسئلہ بتایا تو اس نے کہا کہ آپ مجھے لڑکی کا موبائل نمبر لکھوا دیجئے اور فکر مت کیجئے میں ابھی فرسٹ سیکریٹری کو جگا کر صورتحال سے آگاہ کرتا ہوں۔ اب سہیل بشیر مطمئن دکھائی دے رہے تھے، بولے کہ اب دیکھیئے گا کہ برطانوی سفارت خانہ اپنے شہری کے لیے کیا کرتا ہے اور پھر انہوں نے مجھے اس لڑکی کی داستان سنانی شروع کر دی۔

وہ لڑکی 13 برس کی تھی جب اس کی شادی اس کے ماموں زاد کے ساتھ کر دی گئی ،لڑکا اس شادی کے لیے تیار نہ تھا لیکن ماں باپ کی مرضی کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے، جہاں تک لڑکی کا تعلق ہے تو اس کی مرضی دریافت ہی نہیں کی گئی۔لڑکا برطانیہ کا شہری تھا اور لڑکی کو اس کے ساتھ برطانیہ جانا تھا، نکاح نامے پر لڑکی کی عمر جعلی لکھوائی گئی ،اسی عمر کے مطابق دیگر کاغذات بھی تیار کروائے گئے تاکہ پاسپورٹ پر بھی یہی تاریخ پیدائش درج کروائی جا سکے۔ برطانیہ لے جانے کے بعد دولہے نے دلہن کو دو سال تک اپنی قید میں رکھا، کام پر جانے سے پہلے لڑکا گھر کو باہر سے تالا لگا کر جاتا تھا،لڑکی کو کسی سے ملنے کی اجازت نہیں تھی اور اس کا واحد کام اپنے شوہر،اس کے گھر اور اس کی انگریز دوست لڑکیوں کا خیال رکھنا تھا۔ دو سال بعد وہ لڑکی کو واپس پاکستان لایا اور یہیں چھوڑ کر چلا گیا کیونکہ اس کا باپ فوت ہو چکا تھا جس کے ڈر سے وہ لڑکی کو طلاق نہیں دے رہا تھا اور واپس برطانیہ جانے سے پہلے اس نے لڑکی کا پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات

بھی پھاڑ ڈالے۔ لڑکی کا باپ بھی اللہ کو پیارا ہوگیا تو اس کے ''غیرت مند'' بھائی نے اس پر ظلم وستم شروع کر دیے کیونکہ وہ اسے گھر بٹھا کر لوگوں کی باتیں نہیں سن سکتا تھا۔ اسی دوران کسی نے لڑکی کو برطانوی سفارتخانے سے رابطے کا مشورہ دیا اور وہ کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔ سفارت خانے نے اسکی کہانی بڑی ہمدردی سے سنی اور اس کے نئے کاغذات تیار کروا کے اسے دوبارہ برطانیہ بھجوا دیا (جہاز کا ٹکٹ بھی سفارتخانے ہی نے دیا)، برطانیہ پہنچ کر اس لڑکی کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اسے جانا کہاں ہے، کسی نے اسے پولیس سٹیشن تک پہنچا دیا جہاں سے وہ عورتوں کے فلاحی سنٹر تک پہنچ گئی، اس سنٹر میں سات سالہ قیام کے دوران اس نے انگریزی بھی سیکھی اور کچھ پڑھنا لکھنا بھی جس کے بعد وہ اس قابل ہوگئی کہ اپنے قدموں پر کھڑی ہو سکے، اب وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں کرائے پر رہتی ہے اور محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتی ہے، اس کے مالی حالات بہتر ہوئے اور اسکی خبر 'غیرت مند' بھائی کو ہوئی تو اس نے ماں کی بیماری کا بہانہ کر کے پاکستان بلا لیا، وہ ماں سے ملنے آئی تو بھائی نے پیسے مانگنے شروع کر دیے، لڑکی نے انکار کر دیا تو اس نے ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کو ایک کمرے میں قید کر کے جان سے مارنے کی دھمکی دینی شروع کر دی، اور اس کے بعد کی صورتحال آپ کے سامنے ہے؟

یہ گفتگو جاری تھی کہ لڑکی کا فون آ گیا، اس نے بتایا کہ برطانوی سفارتخانے سے فون آیا تھا کہ ابھی سفارتخانے کی گاڑی بھیج کر مقامی پولیس کی مدد سے آپ کو آزاد کروا لیتے ہیں لیکن میں نے کہا کہ میری ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی چھڑایا جائے؟ انہوں نے کہا کہ ہم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ وہ تو برطانیہ کے شہری نہیں، لیکن میں بضد ہوں کہ وہ برطانوی شہری نہیں لیکن برطانوی شہری کے بہن بھائی اور ماں تو ہیں؟ وہ تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ فون کریں گے۔

سہیل بشیر کہنے لگے کہ دیکھو یہ ہوتے ہیں ملک اور یہ ہوتی ہیں قومیں، ہم برطانیہ

میں پیدا نہیں ہوئے اور برطانیہ کی حکومت کو سب سے زیادہ تنگ بھی ہم ہی کرتے ہیں لیکن پھر بھی وہ ہمارا خیال کس طرح رکھتی ہے؟ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا لڑکی کا فون ایک مرتبہ پھر آ گیا، اس نے بتایا کہ وہی پولیس جو میرا فون نہیں اٹھا رہی تھی، اپنے ایس ایچ او کی قیادت میں ہماری مدد کو آ پہنچی ہے، ایس ایچ کو ہدایت ہے کہ تمام کنبے کو بچایا جائے، وہ علاقے کے معززین کو اکٹھا کر رہا ہے تاکہ ہمارا مسئلہ حل کرا سکے۔ یہ سننے کے بعد ہم مطمئن ہو کر سو گئے۔

اگلے روز اٹھ کر سب سے پہلے اسی لڑکی کا پتہ کیا تو سہیل بشیر نے بتایا کہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے، وہ واپس برطانیہ جا رہی ہے اور جانے سے پہلے آپ سے بھی بات کرنا چاہتی ہے؟ اس لڑکی نے میرا شکریہ ادا کیا (جبکہ میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا تھا) اور مجھ سے کہا کہ آپ اخبار میں لکھتے ہیں تو میری کہانی لکھ کر تمام پاکستانی قوم سے اتنا ضرور کہیے گا کہ انگریزوں اور کافروں کو برا بھلا کہنے اور ان کے ساتھ مقابلے کا سوچنے سے پہلے ایک مرتبہ اپنے گریبان میں جھانک کر اپنے اور انکے کردار کا موازنہ ضرور کر لیا کریں۔ لڑکی کی اس بات پر کیا معلوم آپ کا ردِعمل کیا ہو لیکن میری گردن تو شرم سے جھک گئی؟

روزنامہ خبریں، 24/5/2007

ایسے لوگ روز پیدا نہیں ہوتے

انہیں دنیا سے رخصت ہوئے 40 برس بیت گئے لیکن وہ اپنی اس جدوجہد کے بل بوتے پر آج بھی زندہ و پائندہ ہیں جو انہوں نے رنگ، نسل اور مذہب سے بالاتر ہو کر تمام دنیا کے پسے ہوئے انسانوں کے لئے کی۔ وہ کیوبا کے رہنے والے نہیں تھے لیکن ان کا مجسمہ کیوبا کے ہر شہر میں آویزاں ہے۔ وینزویلا بھی ان کا وطن نہیں لیکن ان کی تصویر والی ٹی شرٹس وہاں کے ہیوگو شاویز جیسے عظیم صدر بھی پہننے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ انکا تعلق کانگو سے بھی نہیں تھا جہاں کی آزادی کی جنگ لڑنے کے لئے انہوں نے کیوبا کے اقتدار کو ٹھوکر ماردی۔ وہ بولیویا کے رہنے والے بھی نہیں تھے جہاں کے کمزور لوگوں کے لئے لڑتے لڑتے انہوں نے اپنی قیمتی جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔ ان کا اصل نام ارنیسٹو گیویرا تھا لیکن وہ گفتگو کے دوران ''چے'' کا لفظ کثرت سے استعمال کرتے تھے جسے ارجنٹینا میں ایسے ہی استعمال کیا جاتا ہے جیسے ہم ''ارے'' یا ''اے بھائی'' استعمال کرتے ہیں، اس لئے ان کا نام چے پڑھ گیا۔

چے 14 جون 1928ء کو ارجنٹینا کے شہر روزاریو میں پیدا ہوئے۔ وہ بچپن ہی سے کتنے مضبوط ارادے کے مالک تھے اس کا اندازہ اس ایک بات سے بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ دمے کا مریض ہونے کے باوجود وہ بڑے اچھے اتھلیٹ اور رگبی کے عمدہ کھلاڑی بن گئے۔ وہ شطرنج کے کھیل میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے اور انہیں شاعری سے بھی بڑی محبت تھی۔ پابلو نیرودا کی انقلابی شاعری نے انہیں ایک انقلابی کمانڈر بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

وہ بنیادی طور پر ایک ڈاکٹر تھے لیکن کسانوں اور مزدوروں کی خستہ حالی کو قریب سے دیکھ کر انہوں نے دنیا بھر کے پسے ہوئے طبقوں کی آزادی کے لئے استحصالی قوتوں کے خلاف لڑنے کا تہیہ کر لیا۔ کارل مارکس کو پڑھنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلح انقلاب کے بغیر ظلم کے دور کو کسی طرح بھی ختم نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اس نظریے کے بھی قائل تھے کہ لاطینی امریکہ کے ممالک کو ایک اکائی میں تبدیل کیے بغیر ظالمانہ معاشی نظام اور بیرونی قوتوں کی استحصالی

پالیسیوں سے نجات ممکن نہیں۔ 07 جولائی 1953ء کو انہوں نے لاطینی امریکہ کے ممالک ایکواڈور، بولیویا، ہونڈورس، پاناما، کوسٹاریکا، پیرو، نکاراگوا، السلواڈور اور گواٹے مالا کا تفصیلی دورہ شروع کیا جس کا اختتام (دسمبر 1954ء میں) گواٹے مالا پر ہوا۔ستمبر 1954ء کو وہ میکسیکو سٹی پہنچے جہاں انکی ملاقات کیوبا کے ان جلاوطن کارکنوں سے ہوئی جن میں فیڈل کاسترو کے چھوٹے بھائی راؤل کاسترو بھی شامل تھے۔انہی کے ذریعے چے کی ملاقات فیڈل کاسترو سے ہوئی۔ چے کاسترو سے اتنے متاثر ہوئے اور انہوں نے فوراً 26 جولائی کی اس تحریک میں شمولیت اختیار کر لی جس کا مقصد کیوبا کے امریکہ نواز حکمران کا تختہ الٹنا تھا۔ چے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر جلد ہی باغی فوج میں کاسترو کے بعد دوسرے اہم کمانڈر کی حیثیت سے تسلیم کر لیے گئے۔ 07 فروری 1959ء کو باغی فوج نے کیوبا سے امریکی ایجنٹوں کا خاتمہ کر دیا، جس کے بعد چے کو کیوبا کی شہریت کے ساتھ ساتھ حکومت میں انتہائی اہم عہدوں پر تعینات کیا جاتا رہا۔ وہ نیشنل بنک آف کیوبا کے صدر اور وزیر صنعت کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ دسمبر 1964ء میں چے نے کیوبا کی جانب سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کیا۔ 24 فروری 1965ء میں انہوں نے ''افروایشیائی سالمیت پر دوسرے اقتصادی سمینار'' میں شرکت کی اور اپنے خطاب کے دوران یہ تاریخ ساز الفاظ کہے کہ ''ہماری تادم مرگ جدوجہد کی کوئی سرحد نہیں ہے۔ہم دنیا کے کسی بھی خطے کے معاملات سے لاتعلق نہیں رہ سکتے۔ سامراج کے خلاف کسی بھی ملک کی فتح ہماری فتح ہے بالکل اسی طرح جیسے کسی بھی ملک کی شکست ہماری شکست ہے''۔ چے گویرا نے کیوبا کی حکومت میں اپنے تمام عہدوں سے استعفی دیتے ہوئے صدر فیڈل کاسترو کے نام یہ پیغام لکھا (جسے کاسترو نے 03 اکتوبر 1965ء کو ایک جلسے میں پڑھ کر سنایا) کہ ''میں اپنا فرض ادا کر چکا جس نے مجھے کیوبا کے انقلاب سے وابستہ کر رکھا تھا۔ اب میں آپ سے، تمام کامریڈوں سے، آپ کے عوام سے جو دراصل میرے اپنے ہیں، رخصت چاہتا ہوں''۔ کیوبا کی حکومت میں اپنی تمام ذمہ داریوں کو خیر آباد کہہ کر انہوں نے

لاطینی امریکہ کے دیگر ممالک کا رخ کیا تا کہ وہ پوری دنیا میں انقلاب برپا کرنے کے لئے اپنی جنگ کے نئے محازوں پر لڑ کر اپنے خواب کو سچ کرنے کی کوشش کرسکیں۔ الجیریا کی تحریک آزادی کے معمار صدر احمد بن بیلا نے چے سے کہا تھا کہ ''افریقہ میں انقلاب لانے کے لئے حالات بہت ساز گار ہیں اور چے کی رائے میں افریقہ سامراج کا سب سے کمزور لنک تھا۔ چنانچہ اب چے نے افریقہ پر توجہ مرکوز کرنے کا فیصلہ کرلیا''۔

وہ کانگو پہنچ گئے جہاں وہ کانگو اور دوسرے ممالک کے انقلاب پسند باغیوں کی مرکزی فوجی تربیت گاہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ جنوبی افریقہ اور کیوبا کے چند امریکہ نواز لوگ جو جلا وطنی پر مجبور کیے گئے تھے، جدید ترین مواصلاتی مشینری اور اسلحے کے ذریعے چے کی ناکامی کے لئے کانگو کی فوج کی معاونت کر رہے تھے۔ کانگو کی باغی تحریک کی ناکامی کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ مواصلاتی مشینری چے کی نقل وحرکت کا پتہ فوجیوں کو بر وقت دے دیتی تھی، یعنی چے کی سرگرمیاں امریکہ کی نظر سے پوشیدہ نہیں تھیں اور دوسری بنیادی وجہ چے کی اپنی ''کانگو ڈائری'' میں تحریر ہے کہ اپنے الفاظ کے مطابق کانگو کے باشندوں پر مشتمل فوجی دستوں کی نااہلیت، غیر لچک پزیری اور انکی اندرونی چپقلش تھی۔ بہرطور چے کی ڈائری کے پیش لفظ میں چے نے خود لکھا کہ ''یہ ایک ناکام مہم کی تاریخ ہے''۔ کانگو میں سات مہینے کے قیام نے چے کو بری طرح بیمار کر دیا۔ انکی دمہ کی تکلیف میں بھی خاصہ اضافہ ہو چکا تھا۔ فیڈل کاسترو اور انکے دیگر دوستوں نے انہیں واپس کیوبا بلانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن چے نے ان کی بات اس لئے نہیں مانی کہ فیڈل ایک جلسہ عام میں چے کا جو ارادہ لوگوں تک پہنچا چکے تھے چے اس سے دستبردار نہیں ہو سکتے تھے۔

ستمبر 1966ء کو وہ بولیویا جا پہنچے اور وہاں اپنی مسلح جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ 08 اکتوبر کو بولیویا کے فوجیوں کو ان کے مورچے کا پتہ چل گیا جس پر انہوں نے فوراً حملہ کر دیا گیا۔ اس حملے میں چے بری طرح زخمی ہوئے لیکن بچ نکلے۔ چے کی آخری لڑائی ان کے مرکزی پڑاؤ پر

ہوئی جہاں سے انہیں زخمی کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ پھر جب امریکہ نے انہیں مارے جانے کا احکام صادر فرمائے جن پر عمل درآمد کے لئے سارجنٹ تیران ان کے کمرے میں داخل ہوا تو (چے کی زندگی پر کتاب لکھنے والے) اینڈرسن کے بقول ''چے نے تیران کو آتے دیکھا تو کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے قتل کرنے کے لئے آئے ہو۔ بزدل! گولی چلاؤ، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم ایک مردمیدان کو مارنے والے ہو''۔ تیران کی گولیوں نے چے کے جسم کو چھلنی چھلنی کر دیا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیا سے رخصت ہو گئے، اس وقت ان کی عمر صرف 37 برس تھی۔ 12 اکتوبر 1967ء کو ان کے بھائی رابرٹو ان کی لاش لینے پہنچے تو بولیویا آرمی کے چیف نے انہیں بتایا کہ چے کی لاش کو نذرِ آتش کر دیا گیا ہے لیکن 15 اکتوبر 1967ء کو بولیویا کے صدر نے یہ بیان جاری کیا کہ چے کی لاش کسی خفیہ مقام پر دفن کر دی گئی ہے۔ 05 جولائی 1997ء کے نیویارک ٹائمز میں آیا کہ دو ماہرین سو فیصد یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ انہوں نے ایک اجتماعی قبر دریافت کی ہے جس میں پایا جانے والا ایک ڈھانچہ یقینی طور پر چے کی لاش کا ہے کیونکہ اس کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے ہیں اور چے کے بارے میں بھی یہ بتایا جاتا تھا کہ قتل کے بعد ان کی شناخت کے لئے ان کے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے گئے تھے۔ ماہرین کا دعویٰ ڈی این اے ٹسٹ سے سچ ثابت ہو گیا۔ 13 جولائی 1997ء کو چے کی لاش کا ڈھانچہ کیوبا کے دارالحکومت ہوانا لایا گیا، جہاں ان کی یاد میں ایک بہت بڑی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت فیڈل کاسترو نے کی۔ چے کا مقبرہ سانتا کلارا میں بنایا گیا جہاں چے کے ہاتھوں کیوبا کی امریکہ نواز حکومت کو شکست ہوئی تھی اور کیوبا میں انقلاب آیا تھا۔

چے گویرا آزادی کے ایک سچے متوالے اور صحیح معنوں میں ایک عظیم کمانڈر تھے جو دنیا کے ہر مظلوم کو اپنا دوست اور ہر ظالم کو اپنا دشمن مانتے تھے۔ کاش ان جیسے دو چار باغی اور پیدا ہوں جائیں لیکن ایسے لوگ روز پیدا نہیں ہوتے۔

روزنامہ خبریں، 17/4/2007

کاش

حریم کعبہ میں سناٹا تھا۔ دیکھا کہ ایک شخص تنہا محوِ عبادت ہے اور اونچی آواز سے کچھ پڑھ رہا ہے۔غور کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ محمدؐ رسول اللہ ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ موقعہ اچھا ہے، دیکھوں یہ شخص تنہائی میں کیا کرتا اور کیا کہتا ہے۔ دبے پاؤں آگے بڑھا۔محتاط تھا کہ وہ مجھے دیکھ نہ لیں، اس لئے میں غلافِ کعبہ میں چھپ گیا اور سرکتا سرکتا ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں مجھ میں اور ان میں غلافِ کعبہ کے سوا کچھ اور حائل نہ تھا۔ آپؐ نہایت جذب وکیف کے عالم میں کھڑے قرآن مجید کی یہ آیات پڑھ رہے تھے کہ ''قسم کھاتا ہوں میں ان چیزوں کی جنہیں تم دیکھتے ہو اور ان کی بھی جنہیں تم نہیں دیکھتے''۔ان الفاظ میں کچھ ایسا بلا کا اثر تھا کہ میں نے کہا کہ قریش جو کہتے ہیں کہ یہ شخص نہایت بلند پایہ شاعر ہے تو وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں، کہ اتنے میں آپؐ نے اگلی آیت پڑھی کہ ''بے شک قرآن اللہ کے عالی مقام رسول کا قول ہے، یہ کسی شاعر کا قول نہیں، تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو''۔ میں نے کہا کہ یہ تو اپنے شاعر ہونے سے بھی انکار کرتا ہے تو پھر جیسا قریش کہتے ہیں یہ کاہن ہوگا، کہ اتنے میں میرے کان میں یہ الفاظ پڑے کہ'' اور نہ ہی یہ کسی کاہن کا قول ہے، تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو''۔قرآن کے اسلوب نے مجھے حیرت میں ڈال دیا میں نے کہا کہ اگر یہ نہ کسی شاعر کا کلام ہے نہ کاہن کا تو پھر یہ ہے کیا؟ میرے دل کی اس بات کا جواب مجھے ان الفاظ میں ملا کہ ''یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اگر نبی نے خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی شہ رگ کاٹ ڈالتے، پھر تم میں سے کوئی ہمیں اس کام سے روکنے والا نہ ہوتا''۔آپؐ یہ پڑھتے جا رہے تھے اور مجھ پر ایک عجیب وغریب کیفیت طاری تھی۔ میں بے اختیار روتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ آپ نے نماز ختم کر لی اور گھر جانے کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ میں بھی دبے پاؤں آپؐ کے پیچھے ہولیا۔ گھر کے نزدیک پہنچے تو میں قریب ہوگیا۔ آپؐ نے آہٹ پا کر مڑ کر دیکھا تو مجھے پہچان لیا اور ڈانٹ کر کہا 'ابنِ خطاب! تم ایسے وقت

میں یہاں کیسے؟ اور میں نے کہا کہ یہ گواہی دینے کے لئے کہ آپؐ خدا کے سچے رسول ہیں۔

یہ ہے ابنِ اسحاق و مسند امام احمد بن حنبل کے مطابق (بحوالہ ہیکل) حضرت عمرؓ کے اپنے بقول انکے اسلام قبول کرنے کا واقعہ جو نبی کریمؐ کی اس خواہش کے تین دن بعد پیش آیا کہ "اے رب االعالمین! اسلام کو ابوجہل یا عمر ابنِ خطاب کے ذریعے تقویت بخش۔ ان دونوں میں سے تجھے جو بھی محبوب ہو اسے مشرف بہ اسلام فرما"۔ اس دعا سے اس بات کا اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں کہ حضرت عمرؓ، نبی اکرمؐ کی نگاہ اور عرب معاشرے میں کیا مقام وحیثیت رکھتے تھے۔ خاندانی لحاظ سے آپؓ کا تعلق قبیلہ عدی سے تھا جو قریش کے معزز ترین خاندانوں میں سے ایک تھا۔ پیشے کے اعتبار سے آپؓ ایک بڑے ہی کامیاب تاجر تھے اور آپؓ کا شمار قریش کے امیر ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔ آپؓ علم الانساب کے بھی ماہر تھے جسے عربوں کے یہاں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس فن میں آپؓ ایسا مقام رکھتے تھے کہ جب کوئی شخص قریش کے سامنے نسبی تفاخر کے لئے آتا تو اس کے مقابلے میں آپؓ کو پیش کیا جاتا۔ آپؓ کشتی لڑنے میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے اور یہ بھی عربوں کے یہاں بڑا فن سمجھا جاتا تھا۔ آپؓ قریش کے سفیر بھی تھے اور جنگوں وغیرہ کے معاہدوں میں ان کی نمائندگی کیا کرتے تھے۔ شعر وسخن کی محفلیں بھی آپؓ کے بغیر نامکمل سمجھی جاتی تھیں۔ مکّہ میں صرف 17 لوگ پڑھنا لکھنا جانتے تھے اور ان میں ایک حضرت عمرؓ بھی تھے۔ یہی وہ خصوصیات تھیں جن کے حسین امتزاج نے خلیفہ بننے کے بعد حضرت عمرؓ سے ایسی اصطلاحات کروائیں کہ جن کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

آپؓ آدابِ حکومت کو کس خوش اسلوبی سے سمجھتے تھے اس کا اندازہ آپؓ کے ان اقوال سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ طاقتور خائن اور کمزور دیانت دار، دونوں حکومت کے لئے نقصان رساں ہوتے ہیں۔ وہی حکومت درست رہ سکتی ہے جس میں نرمی ہو لیکن کمزوری کی وجہ سے نہیں اور سختی ہو لیکن استبداد کی وجہ سے نہیں۔ حکومت کے منصب کے لئے ایسا شخص سب سے زیادہ موزوں ہے کہ جب وہ اس منصب پر فائز نہ ہو تو قوم کا سردار نظر آئے اور جب اس پر فائز ہو

جائے تو انہی میں سے ایک فرد معلوم ہو۔ جس شخص میں تکبر دیکھو، سمجھ لو کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہے۔ جو شخص مسلمانوں کا امیر بنے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اچھے غلاموں کی طرح مخلص اور امین ہو۔ ایک حاکم کو اپنی رعایا کے لئے ایسا بننا چاہیے جیسا وہ خود رعایا ہو کر اپنے حاکم کو بنانا چاہے۔ جب تک سربراہ مملکت پر وہی نہ گزرے جو رعایا پر گزرتی ہے، اسے ان کی تکلیف کا احساس کیسے ہوسکتا ہے؟ اچھا حکمران وہ ہوتا ہے جس سے امن پسند لوگ بے خوف اور بدقماش خوفزدہ ہوں۔ جو شر پیدا کر کے غالب آیا وہ غالب نہیں، مغلوب ہے اور جو ناجائز طریقے سے کامیاب ہوا وہ کامیاب نہیں، ناکام ہے۔ حاکم کو انہیں باتوں کا حکم دینا چاہیے جن کا حکم خدا نے دیا ہے اور انہیں سے روکنا چاہیے جن سے اللہ نے روکا ہے۔ جب حاکم بگڑ جاتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے اور سب سے بدبخت حاکم وہ ہے جس کے سبب رعایا بگڑ جائے۔ جس حاکم کے محل کے دروازے عوام کے لئے بند ہو جائیں وہ قصر سعد نہیں قصرِ فساد ہے۔ حکومت کی اصلاح تین چیزوں سے ہوسکتی ہے، ذمہ داریوں کی ادائیگی، قوت کے ساتھ گرفت اور قرآن کے مطابق فیصلے۔ دولت کے اصلاح دو چیزوں سے ہوسکتی ہے، حق کے ساتھ لیا جائے اور باطل میں خرچ ہونے سے بچایا جائے۔ لوگوں کو ان کی ضرورت کے مطابق دو، مٹھی مٹھی دینے سے ان کے اخلاق درست نہیں رہ سکتے۔ بھوک سے مجبور ہو کر چوری کرنے والے کو سزا نہیں دی جائے گی، سزا اسے دی جائے گی جس نے اسے اس حالت تک پہنچایا۔ رعایا پر حکومت کے واجبات کی ادائیگی اس وقت لازم آتی ہے جب وہ حکومت کے رفاع عامہ سے مستفید ہوتی ہے۔ امیر المومنین اس وقت گیہوں کی روٹی کھا سکتا ہے جب اسے یقین ہو جائے کہ رعایا میں سے ہر ایک کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔ اگر فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر جائے تو عمرؓ سے اس کی باز پرس ہوگی۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت کی بات چلتی ہے تو اس بڑھیا کا واقعہ یاد آ جاتا ہے جو بڑی کسمپرسی کے عالم میں ایک خیمے میں رہتی تھی۔ ایک سفر کے دوران حضرت عمرؓ کا گزر وہاں سے ہوا۔ اس کی حالت دیکھ کر آپؓ نے اس سے پوچھا کہ تم نے اپنی حالت کی اطلاع خلیفہ تک کیوں

نہیں پہنچائی؟ اس نے جواب دیا کہ یہ میرا کام نہیں خلیفہ کا کام تھا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ خلیفہ کو اتنی دور کا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟ اور بڑھیا نے وہ جواب دیا جسے یاد کر کے حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں ہمیشہ آنسو آ جایا کرتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ خلافت کا مفہوم کیا ہے مجھے شام کی اس بڑھیا نے سکھایا۔ بڑھیا نے کہا تھا کہ اگر خلیفہ اپنی رعایا کے ہر فرد کے حالات کی خبر خود نہیں رکھ سکتا تو اسے چاہیے کہ وہ حکومت چھوڑ دے۔

کاش ہمارے کسی حکمران کو بھی حضرت عمرؓ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق ہو۔ اور کچھ نہیں تو کاش کوئی حکمران حضرت عمرؓ کا یہی ایک قول یاد رکھ سکے کہ حکومت کے زور کا مطلب تلوار نہیں، اس کا مطلب حق کے ساتھ فیصلہ اور انصاف کے ساتھ مواخذہ کرنا ہے۔ کاش ہم محرم الحرام میں حضرت عمرؓ کے یوم شہادت پر قرآن خوانیوں کے ذریعے ثواب کمانے کے بجائے ان کی کہی ہوئی باتوں پر عمل پیرا ہونے کا عہد کر سکتے۔

روزنامہ خبریں، 28/1/2007

نوعِ انسانی کا مشترکہ سرمایہ

انہوں نے کہا تھا کہ اگر ہم نے سائنس وٹیکنالوجی کو فروغ دے کر اپنی زراعت کو درپیش مسائل حل نہ کیے تو ایک روز ہمارے ہاتھ میں کشکول ہوگا اور ہم دنیا بھر میں رسوا ہو رہے ہونگے لیکن کسی نے ان کی ایک نہ سنی اور نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ ہم ایک زرعی ملک ہو کر بھی آٹے کو ترس رہے ہیں۔

وہ بین الاقوامی سطح کے سائنس دان تھے اور پاکستان کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن پاکستان میں ان کے ساتھ جو ہوا اس کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں کہ ’’جلد ہی یہ بات مجھے معلوم ہوگئی کہ کسی کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ میں کسی تحقیق میں مصروف ہوں یا نہیں، بی اے کے طالبِ علموں کو ریاضی پڑھانے کے علاوہ میرے فرائض میں کالج فٹ بال ٹیم کی نگرانی بھی تھی‘‘۔انہوں نے پاکستان میں ہر ممکن طریقے سے سائنس وٹیکنالوجی کو فروغ دینے کی کوشش کی جسکی ہمیں اشد ضرورت تھی لیکن ہم نے ہر ممکن طریقے سے ان کی حوصلہ شکنی کی اور ان پر زمین اتنی تنگ کر دی کہ انہیں انگلستان کی شہریت اختیار کرنا پڑی جہاں سے وہ موت کے بعد ہی لوٹ سکے۔

وہ نوبل انعام حاصل کرنے والے واحد پاکستانی ہیں اور ان کا نام ڈاکٹر عبدالسلام ہے۔آج آپ کو انہی کی کہانی سناؤں گا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میٹرک کا امتحان پنجاب یونیورسٹی لیا کرتی تھی اور انہوں نے اس امتحان میں اتنے نمبر لیے جتنے یونیورسٹی کی تاریخ میں کسی نے نہیں لیے۔ یہ ریکارڈ قائم کرنے کے بعد وہ لاہور سے اپنی جنم بھومی جھنگ واپس آئے تو سارا گاؤں ان کے استقبال کے لیے موجود تھا۔اسی گاؤں میں وہ 29 جنوری 1926 کو پیدا ہوئے۔

میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت میں پاس کر کے انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھائی کے لیے سکالرشپ حاصل کیا اور اسی ادارے سے ایم اے کا امتحان حسبِ معمول امتیازی

حیثیت میں پاس کیا۔سینٹ جونز کالج کیمبرج (St John's College,Cambridge) میں بھی سکالرشپ پر ہی داخلہ ملا جہاں سے 1949 میں ریاضی اور فزکس میں پہلی پوزیشن کے ساتھ آنرز کیا۔1950 میں فزکس کی پری ڈاکٹورل(Pre-doctoral) خدمات کے لیے کیمبرج سے سمتھس پرائز(Smith's Prize) حاصل کیا۔ان کی پی ایچ ڈی کا تھیسس 1951 میں شائع ہوا۔

اس کے فوراً بعد وہ پاکستان آ گئے اور 1952 میں پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ ریاضی کے سربراہ مقرر ہوئے۔اس عہدہ پر خدمات انجام دیتے ہوئے کم وبیش دو ہی برس گزرے تھے کہ وطن عزیز سے بڑی مجبوری کے عالم دوبارہ کیمبرج جانا پڑ گیا کیونکہ ان سے وہ کام نہیں لیا جارہا تھا جو وہ کرنا چاہتے تھے۔

1954 میں انہوں نے کیمبرج میں لیکچرار کی حیثیت سے کام شروع کردیا۔ 1957 میں امپیریل کالج لندن میں تھیوریٹیکل فزکس کے پروفیسر مقرر ہوئے۔امپیریل کالج میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ وہ انٹرنیشنل سینٹر برائے تھیورٹیکل فزکس کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔یہ مرکز (ICTP) ان کا اپنا قائم کردہ تھا جسے قائم تو پاکستان میں کرنا چاہتے تھے لیکن یہاں سے مایوس ہو کر اٹلی میں قائم کرنا پڑا۔یہ عظیم ادارہ آج بھی اعلی سطح پر فزکس کے فروغ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔

1968 میں انہیں ایٹمز پیس میڈل(Atoms Peace Medal) سے نوازا گیا جس کے ساتھ ملنے والی رقم انہوں نے سکالرشپ کی صورت میں آئی سی ٹی پی(ICTP) میں پڑھنے والے پاکستانی طالب علموں کے لیے وقف کردی۔1979 میں انہیں فزکس کا نوبل پرائز دیا گیا جس کے ساتھ ملنے والی رقم انہوں نے آئی سی ٹی پی میں پڑھنے والے ترقی پذیر ممالک کے طالب علموں کے نام کردی۔

ڈاکٹر صاحب، اٹامک انرجی کمیشن اور پاکستان سائنٹیفک کمیشن کا ممبر رہنے کے علاوہ 1961 سے 1974 تک چیف سائنٹیفک ایڈوائزر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے لیکن

پھر اپنے ساتھ ہونے والے سلوک سے دل برداشتہ ہو کر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب اقوام متحدہ کے لیے کام کرنے کے ساتھ ساتھ 'آئی سی ٹی پی' کے لیے بھی کام کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام اٹلی میں ہی گزارے اور 21/نومبر 1996 کو وہیں فوت ہوئے، ان کے جسدِ خاکی کو ان کی خواہش کے مطابق پاکستان میں دفنانے کی اجازت تو مل گئی لیکن بعد ازاں ان کی قبر کے کتبے کی تحریر تک چند لوگوں نے کھرچ ڈالی۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے بین الاقوامی سطح پر نوع انسانی کی بقاء اور دنیا کی ترقی کے لیے جو خدمات انجام دیں ان کے عوض وہ کسی بھی ملک میں عزت و وقار کے ساتھ دفنائے جاسکتے تھے لیکن انہوں نے آخری آرام گاہ کے طور پر بھی پاکستان ہی کا انتخاب کیا کیونکہ وہ اپنے وطن سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کے لکھے ہوئے 250 سائنسی مکالاجات ایسی سطح کے مستند سائنسی رسائل و جرائد میں شائع ہوئے کہ جن میں اس قسم کے دو تین مکالے چھپنے پر بھی اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل جاتی ہے۔ انہیں 27 بین الاقوامی یونیورسٹیوں نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی لیکن قائداعظم یونیورسٹی انہیں یہ ڈگری دینے لگی تو چند عناصر نے اس کے خلاف ایسے شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا کہ یونیورسٹی کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑ گیا۔ بہرکیف انکی موت کے دو سال بعد حکومتِ پاکستان نے ان کا نام پاکستانی سائنس دانوں کی فہرست میں شامل کر لیا اور محکمہ ڈاک کی جانب سے ان کا یادگاری ٹکٹ جاری ہوا۔ کاش ہم ڈاکٹر صاحب کی خدمات سے صحیح معنوں میں استفادہ کر سکتے اور انکی زندگی میں اس حقیقت کا ادراک کر لیتے کہ سائنس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، یہ رنگ و نسل سے بے نیاز ہو کر اپنا کام کرتی ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو ساری کی ساری دنیا سائنسی ایجادات سے مستفید نہ ہو رہی ہوتی؟ ڈاکٹر عبدالسلام نے کیا خوب کہا تھا کہ ''سائنسی سوچ بنی نوع انسان کا مشترکہ سرمایہ ہے''۔

روزنامہ جناح، جنوری 2009

جنرل مشرف سے یاد آیا

اسلم شروع شروع میں میرے چچا کے گھر کام کیا کرتا تھا، یہ ان دنوں کی بات ہے جب جنرل پرویز مشرف کی جانب سے ''وسیع تر ملکی مفاد'' میں کی گئی یہ تعریف بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی تھی کہ جس کے پاس اپنا موبائل ہوتا ہے وہ غریب نہیں ہوتا اور میں اسلم کے ہاتھ میں موبائل دیکھ کر اس سے یہ پوچھ بیٹھا تھا کہ کیا تمہاری کوئی لاٹری نکل آئی ہے جس نے تمہیں ایک دم امیر بنا دیا ہے؟ جواب میں اس نے بڑی حیرت سے پوچھا تھا کہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں امیر ہو گیا ہوں؟ اور میں نے اس کے موبائل کی طرف اشارہ کر کے اسے ''حقیقت'' سے آگاہ کیا تھا جس پر اس نے زور زور سے ہنستے ہوئے کہا تھا کہ سر! کیوں مذاق کرتے ہیں میں تو موبائل خرید کر اور بھی غریب ہو گیا ہوں، پہلے جو تھوڑے بہت پیسے بچ جاتے تھے اب اس کے کریڈٹ کارڈ پر خرچ ہو جاتے ہیں۔

آج کل اسلم اپنے ایک کزن رفیق کے ساتھ مل کر میری جنم بھومی راولاکوٹ میں، چپل کباب کی دُکان چلا رہا ہے، جہاں آنے کی دعوت وہ اس روز بطورِ خصوصی دینے آیا جب حمید نے اس سے میرا کالم ''ہری مرچ، حمید اور شوکت عزیز'' پڑھوا کر سنا، کہہ رہا تھا کہ چپل کباب میں ہری مرچ کی وافر مقدار نہ ہو تو گاہکوں کی تسلی نہیں ہوتی اور ہری مرچ قوتِ خرید سے باہر ہو چکی ہے؟ اسے میرا کالم بہت اچھا لگا تھا کیونکہ شوکت عزیز صاحب کے بارے میں اسکے جذبات بھی حمید ہی کے جیسے تھے جن کی پالیسیوں کا ''ٹرکّل ڈاؤن ایفیکٹ'' 300 روپے کلو ہری مرچ کی شکل میں حمید کی طرح اس تک بھی پہنچ چکا تھا۔

جس روز میں اسلم کی دکان پر گیا، لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے بے چارے کا گوشت خراب ہو گیا تھا جس کی مالیت اس کے بقول 15 ہزار روپے کے لگ بھگ تھی، اس کے باوجود وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ میں نے پوچھا کہ کاروبار کیسا چل رہا ہے تو بولا کہ پورا پورا دن بجلی نہیں آتی، ایسی لوڈ شیڈنگ میں کاروبار کیا چلے گا؟ اتنا طاقتور جنریٹر ہم خرید نہیں سکتے جس سے فرج

چلیے اور کہیں سے ادھار لے کر خرید بھی لیں تو اس میں ڈالنے کے لیے اتنا مہنگا پٹرول یا ڈیزل کیسے خریدیں؟ میں نے کہا کہ یار سارے ملک میں یہی حال ہے اور وہ بولا کہ سر آپ ٹھیک کہتے ہیں، ہم تو پھر بھی خوش قسمت ہیں کہ ٹھنڈے علاقے میں رہتے ہیں، دن کے تھکے ہارے کم از کم رات کو سو تو جاتے ہیں لیکن آپ جو پنڈی جیسے گرم علاقے میں رہتے ہیں کیا کرتے ہونگے؟ میں نے کہا کہ ہمارے تمھارے لیے تو پنڈی گرم علاقہ ہے لیکن پاکستان میں ایسے ایسے علاقے بھی ہیں جہاں کے لوگوں کو پنڈی بھی گرم نہیں لگتا۔

وہ کچھ پریشان ہو گیا اور بولا کہ سر پاکستان کا کیا بنے گا؟ میں نے کہا کہ یہی ہے وہ سوال جس کا جواب ہر پاکستانی ڈھونڈ رہا ہے۔ اس نے میری بات کاٹ دی اور بولا کہ سر میں نے آپ کا وہ کالم پڑھا تھا جس میں آپ نے لکھا تھا کہ امریکہ پاکستان کے پیچھے پڑا ہوا ہے، سر! امریکہ کو ساری دنیا میں تباہ کرنے کے لیے ہمارا ہی ملک ملا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ ملک تو اور بھی ہیں لیکن کسی نے کیا خوب کہا کہ ہم نے خود ہی ''سب سے پہلے پاکستان، سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگا لگا کر امریکہ کو اپنی جانب متوجہ کیا، ویسے ہمارے علاوہ بھی کئی ممالک امریکہ کے ہاتھوں تباہ ہو چکے ہیں (پاکستان سے پہلے امریکہ 1950 میں کوریا، 1954 میں گوئٹے مالا، 1958 میں انڈونیشیا، 1959 میں کیوبا، 1961 میں ویتنام، 1964 میں کانگو، 1965 میں پیرو، 1969 میں کمبوڈیا، 1973 میں لاؤس، 1980 میں ایلسلواڈور، 1981 میں نکاراگوا، 1983 میں گرینیڈا، 1984 میں لبنان، 1986 میں لیبیا، 1989 میں پانامہ، 1990 میں عراق، 1998 میں سوڈان، 1999 میں یوگوسلاویہ، 2003 میں پھر عراق اور اسکے بعد افغانستان، ''سب سے پہلے'' آنے کی دعوت قبول کر کے ان ممالک کا حشر نشر کر چکا ہے)۔

اسلم نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا کہ سر امریکہ ملکوں کو تباہ کیوں کرتا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ امریکہ دنیا پر اپنا راج قائم رکھنا چاہتا ہے جس کے لیے اسے وسائل کی ضرورت

بھی ہے اور حکمت عملی کی بھی۔ بعض ملکوں کو اس لیے تباہ کرتا ہے کہ ان کے وسائل پر قبضہ کر سکے اور بعض کو اس لیے کہ وہ اس کی حکمت عملی میں رکاوٹ ڈالتے ہیں یا ڈال سکتے ہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے وڈیرے اور جاگیردار اپنی طاقت جمائے رکھنے کے لیے ایک طرف تو مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعے دوسروں کی زمین جائیداد پر قبضہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور دوسری طرف اپنے خلاف آواز اٹھانے والوں کا گلا ہر ممکن طریقے سے دبانے کی کوشش کرتے ہیں؟

بات پوری طرح سمجھانے کے لیے میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ جس طرح وڈیروں اور جاگیرداروں نے مخصوص مفادات کے تحت کچھ خاص لوگ پال رکھے ہوتے ہیں جن کی مدد وہ اسی وقت تک کرتے ہیں جب تک انکے لیے کارآمد رہتے ہیں، اسی طرح امریکہ بھی ڈکٹیٹروں کو پالتا ہے جو کام کے نہ رہیں تو انہیں پہچاننے سے بھی انکار کر دیتا ہے۔ ایران کا رضا شاہ پہلوی، نکاراگوا کا اناس تاسیوسو، چلی کا جنرل پنوشے، فلپائن کا مارکوس، پانامہ کا جنرل نوریگا، عراق کا صدام حسین وغیرہ وغیرہ جنہوں نے امریکیوں پر پھول نچھاور کیے اور اپنے ہم وطنوں پر بم گرائے، تمام کے تمام امریکہ کی امداد کو ترستے ترستے دنیا سے کوچ کر گئے (رضا شاہ کے بینک اکاؤنٹس امریکہ نے بند کروائے اور وہ مصر، مراکش، بہاماس اور میکسیکو میں بھٹکتے بھٹکتے مرنے کے بعد قاہرہ کے اپنے بیڈروم میں بطور امانت دفنایا گیا، تاسیوسو کو بھی امریکہ آنے کی اجازت نہ ملی اور وہ جنگلوں بیابانوں میں چھپتے پھرتے ہلاک ہوا، پنوشے نے لندن میں پناہ لی لیکن برطانیہ کی حکومت نے اسے خود پکڑ کر چلّی کے سپرد کیا جہاں اسکے خلاف مقدمے چل رہے تھے اور وہ ہارٹ اٹیک سے مر گیا، مارکوس ہونولولو میں معمولی سے وظیفہ پر کچھ عرصہ زندہ رہا اور پھر ہلاک ہو گیا، نوریگا کو امریکہ کے کہنے پر 40 سال قید بامشقت ہوئی اور صدام حسین کو بھی امریکہ ہی نے سولی پر لٹکایا) آمریت کا انجام یہی ہوتا ہے۔

اسلم نے پوچھا کہ آمریت کیا ہوتی ہے؟ میں نے بتایا کہ آمریت میں ایک شخص

زبردستی حکمران بن کر ڈنڈے کے زور پر قوم کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتا ہے۔ آمریت کی ضد جمہوریت ہوتی ہے جس میں قوم اپنی خوشی سے ووٹ کے ذریعے اپنا حکمران چنتی ہے جو قوم کی مرضی کے مطابق چلتا ہے۔ یہ بات تمھیں کسی اور دن تفصیل کے ساتھ سمجھاؤں گا کیونکہ تم سے باتیں کرتے کرتے میں بھول ہی گیا کہ بجلی آ گئی ہے اور اس سے پہلے کہ یہ واپس چلی جائے مجھے ایک ضروری فوٹوسٹیٹ کروانی ہے؟

وہ بولا کہ سر لیکن اتنا تو بتا دیجئے کہ کیا جنرل مشرف کو سزا ملے گی؟ میں نے کہا کہ تاریخ تو یہی بتاتی ہے کہ امریکہ آمروں کو کبھی معاف نہیں کرتا بالخصوص ان کو جو اس کے کام آتے رہے ہوں اور کئی اہم رازوں سے واقفیت رکھتے ہوں؟ اسلم قدرے مطمئن نظر آنے لگا اور مجھے جنرل مشرف کے ذکر پر ایک مرتبہ پھر آسودہ حالی کی موبائل والی تعریف یاد آ گئی، میں نے بے ساختہ مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا کہ جنرل مشرف سے یاد آیا کہ تمھارے پاس پرانے والا موبائل ہی ہے یا نیا خرید لیا ہے؟ وہ بھی مسکراتے ہوئے بولا کہ نیا خرید لیا۔ میں نے کہا کہ اس کا مطلب ہے پاکستان پہلے سے بھی زیادہ خوشحال ہو گیا ہے اور وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

روزنامہ جناح، اگست 2009

زندگی نہ رہی تو معیارِ زندگی کیا رہے گا؟

دنیا میں خوراک کا بحران شدید سے شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے جس کی ایک بڑی وجہ زمین کا بڑھتا ہوا درجہ ٔحرارت ہے جو ایک خاص حد کے بعد اناج کی پیداوار کو براہِ راست متاثر کرتا ہے اور اس میں ایک ڈگری اضافے کے ساتھ پیداوار میں 10 فیصد کمی واقع ہوتی ہے جبکہ 2001 سے 2006 تک زمین کے درجہ ٔحرارت میں 0.2 ڈگری سینٹی گریڈ سالانہ کی رفتار سے اضافہ ہوا ہے جو اس سے پہلے کے زمانوں میں ہونے والے اضافے سے 100 گنا زیادہ ہے اور اسی کی وجہ سے خوراک کے ذخائر گھٹ کر آدھے رہ گئے ہیں۔

زمین کا درجہ ٔحرارت اس لیے بڑھ رہا ہے کہ جب ہم گاڑیاں چلانے، گھروں دفتروں کو روشن رکھنے یا کسی بھی دوسرے مقصد کے تحت پٹرول، ڈیزل، کوئلہ، قدرتی گیس یا بجلی جلاتے ہیں تو اس سے کاربن ڈائی آکسائڈ پیدا ہوتی ہے جو فضا میں شامل ہو کر زمین کے گرد لپٹے ہوئے اس کمبل کی موٹائی میں اضافہ کر دیتی ہے جو گرمی کو جذب کرتا ہے، اسی کو گلوبل وارمنگ کہتے ہیں جس سے انسان کو ایسا خطرہ لاحق ہے جیسا کسی بھی دوسری شے سے نہیں۔

گلوبل وارمنگ کتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کا اندازہ اسی سے لگا لیجئے کہ 1940 سے 2005 تک ہماری فضا میں موجود کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار میں جو غیر معمولی اضافہ ہوا وہ کسی بھی دوسرے دور میں ہونے والے اضافے سے 27 فیصد زیادہ ہے، یہ زہریلی گیس اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ جب یہ سمندروں میں مل کر پانی کو تیزاب (Carbonic Acid) میں تبدیل کر دے گی جو آبی حیات کو موت کے گھاٹ اتار دے گا اور ہم اور ہماری زمین پر بھی بارش کی شکل میں برسے گا۔

گلوبل وارمنگ پر قابو نہ پایا گیا تو انسان ایسے حالات سے دوچار ہو سکتا ہے کہ جن کے متعلق سوچ کر بھی دل دہل جاتا ہے اور روح کانپ اٹھتی ہے۔ کیا معلوم کتنے لوگ یہ جانتے

ہیں کہ درجہ حرارت کے بڑھنے سے بڑے بڑے برفانی گلیشیر پگھل رہے ہیں جس سے موجودہ صدی کے آخر تک سطحِ سمندر کی بلندی 3 فٹ بڑھ جائے گی اور سمندروں کے قرب و جوار میں آباد شہر زیرِ آب آ جائیں گے۔ گرین لینڈ کی برف جو سائنسدانوں کی توقعات سے زیادہ تیزی کے ساتھ پگھل رہی ہے اگر ساری کی ساری پگھل گئی تو سطحِ سمندر کی بلندی میں 23 فٹ اضافہ ہو جائے گا جس سے کیا قیامت برپا ہو گی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں؟ سمندری طوفان جو گزشتہ صدی کو نسبت دگنے ہو چکے ہیں اور بھی زیادہ ہو جائیں گے، سیلاب شدید تر سے شدید ترین ہونگے اور وہ بھی کچھ اسطرح کہ پانی کی جگہ تیزاب بہے گا۔ انواع واقسام کے خطرناک جراثیموں کی تعداد ناقابلِ یقین حد تک بڑھ جائے گی اور جان لیوا بیماریوں میں اسقدر اضافہ ہو جائے گا کہ ان سے بچنا ممکن نہ ہو گا۔ صدیوں کے سوئے ہوئے آتش فشاں پہاڑ لاوا اگلنے لگیں گے۔ سرسبز و شاداب علاقے بنجر و بیابان ہو جائیں گے، خشک سالیاں اور قحط آئے روز ہمارے دروازوں پر دستک دیں گے۔ متاثرہ لوگ جوق در جوق ہجرت پر مجبور ہوا کریں گے جنہیں پناہ دینے کا حوصلہ کسی میں نہیں ہو گا اور اس سے جنگ و جدل کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ انسان اناج کے دانے دانے اور پانی کے قطرے قطرے کے لیے ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگیں گے۔

کاربن کے اضافے پر قابو پانے کے لیے اقوامِ متحدہ نے ایک معاہدے ''کیوٹو پروٹوکول' کے ذریعے یہ تجویز کیا کہ دنیا کے تمام ممالک کے لیے کاربن کے اخراج کا ایک مخصوص کوٹہ مقرر کر دیا جائے اور اس کوٹے کی خلاف ورزی کرنے والے کو جرمانہ ادا کرنا پڑے لیکن امریکہ (جو دنیا میں سب سے زیادہ کاربن خارج کرتا ہے) اور آسٹریلیا نے اس معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا جس کے بعد اسکی افادیت اس لیے ختم ہو جاتی ہے کہ ان دو ممالک کی کاربن ڈائی آکسائڈ ایک طرف اور باقی ساری دنیا کی ایک طرف۔ امریکہ کو منانے کے لیے اقوامِ متحدہ نے کیوٹو پروٹوکول میں اس حد تک ترمیم کی پیشکش بھی کی کہ اگر کوئی

ملک اپنے کوٹے سے کم کاربن پیدا کر رہا ہے تو اس سے باقی کا کوٹا کوئی دوسرا ملک خرید سکتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ امریکہ کو یہ سہولت مہیا کی گئی کہ وہ دیگر ممالک سے کاربن خارج کرنے کا کوٹہ خرید کر کرہ ءارض کے منہ پر کالک مل سکے لیکن امریکہ نے اس پیشکش کو بھی تا حال شرفِ قبولیت نہیں بخشا۔ امریکہ ایک طرف تو دنیا کا رکھوالا بنتا ہے اور ''انسانی حقوق کی خلاف ورزی'' کی پاداش میں کبھی کسی کی گردن پر پاؤں رکھتا ہے تو کبھی کسی کی لیکن دوسری طرف محض اپنے عیش وآرام کے لیے تمام نوعِ انسانی کو موت کے منہ میں دھکیل رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اب امریکہ ہوش سے کام لے کیونکہ وہ اپنے جاہلِ مطلق صدر بش سے نجات حاصل کر چکا ہے اور باراک اباما نے اپنی ابتدائی تقریر میں گلوبل وارمنگ کا تزکرہ خصوصیت سے کرتے ہوئے اس سے نمٹنے کو اپنی ترجیحات کا اہم حصہ قرار دیا۔

خدا کرے کہ اس سلسلے میں کوئی مثبت پیش رفت سامنے آ سکے لیکن اگر نہ بھی آئے تو بھی ہمیں وہ سب کچھ ضرور کرنا چاہیے جو اپنی سطح پر کیا جا سکتا ہے اور چھ نہایت اہم کام ایسے ہیں جو نہ صرف انفرادی طور پر بھی کیے جا سکتے ہیں بلکہ ان سے آج کے مہنگے دور میں ہماری جیب پر پڑنے والا بوجھ میں بھی کم ہوسکتا ہے۔ پہلا یہ کہ اپنی گاڑی کے انجن اور ٹائروں کو بہترین حالت میں رکھنے کی کوشش کیجیئے تا کہ یہ کم ڈیزل، پٹرول یا گیس کھائے۔ دوسرا یہ کہ گاڑی کا استعمال کم کر دیجیئے جو اسطرح کیا جا سکتا ہے کہ کبھی اپنے بچوں کو کسی دوست یا پڑوسی کے بچوں کے ساتھ اور کبھی دوست یا پڑوسی کے بچوں کو اپنے بچوں کے ساتھ سکول بھیج دیا کیجیئے تا کہ دو کے بجائے ایک گاڑی استعمال ہو، دفتر جانے آنے کے لیے بھی اسی فارمولے پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ تیسرا یہ کہ بجلی کے بلبوں کی جگہ انرجی سیور لگا لیجیئے اور بجلی کا استعمال ہر ممکن حد تک کم کر دیجیئے۔ چوتھا یہ کہ سردیوں میں نہانے کے لیے شاور کا استعمال مت کیا کیجیئے اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو ایسا شاور استعمال کیجیئے کہ جس کے سوراخ چھوٹے ہوں تا کہ گرم پانی کا استعمال کم سے کم ہو کیونکہ جتنا کم پانی استعمال ہوگا اسے گرم کرنے کے لیے اتنا ہی کم ایندھن بھی درکار ہوگا۔ پانچواں یہ کہ

گھر کے آس پاس زیادہ سے زیادہ درخت لگایئے جو کاربن ڈائی آکسائڈ چوسنے، آکسیجن خارج کرنے اور درجہ حرارت کم کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔اور چھٹا یہ کہ دوستوں اور عزیزوں کو گلوبل وارمنگ، اسکے نقصانات اور اس سے بچنے کے طریقوں سے آگاہ کرنے کو زندگی کا مشن بنا لیجئے جو کسی بہت بڑے جہاد سے کم نہیں۔

جو لوگ اس اندیشے کے پیشِ نظر کاربن کے اخراج پر قابو نہیں پانا چاہتے کہ ہمارا معیارِ زندگی گر جائے گا وہ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ زندگی ہی نہ رہی تو معیارِ زندگی کیسے رہے گا؟

روزنامہ جناح،26/2/2009

شاهد آفریدی،کرکٹ اور این آر او

آسٹریلیا کی کرکٹ ٹیم کے ہاتھوں ہماری ٹیم کے چاروں شانے چت ہونے پر ایک صاحب نے شدید غم و غصے کے عالم میں مجھ سے کہا کہ کرکٹ ٹیم کو سخت سے سخت سزا دی جانی چاہیے اور میں یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ ایسی کونسی سزا ہوسکتی ہے جو کرکٹ سے لگے آپ کے زخموں کو مندمل کر سکے؟ کیا کرکٹرز کو کسی ایسی سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا جائے جہاں سے چیف سیکریٹری پنجاب کی گاڑی نے گزرنا ہو، تاکہ انہیں کچل کر وہ رکنے کی زحمت بھی گوارا نہ کریں اور ہمارے ''سابق ہیروز'' کو اپنی حیثیت و حقیقت کا صحیح اندازہ ہو سکے؟ یا کیا کھلاڑیوں کو ان صاحب کے گھر ملازم کرا دیا جائے جو قانون دان ہو کر بھی ''چائلڈ لیبر'' جیسی غیر قانونی حرکت میں کچھ اسطرح ملوث رہے کہ لیبر کرتے کرتے بے چارے چائلڈ کا خاتمہ ہی ہو گیا لیکن جب انکے خلاف مقدمہ قائم ہوا تو ان کی حمایت میں اتنے قانون دان (اپنے فلک شگاف نعروں سمیت) برسرِ ہڑتال ہو گئے کہ ''کالے'' کوٹوں کی گنتی محال ہو گئی؟ یا کیا کرکٹ ٹیم کو پنجاب پولیس کے حوالے کر دیا جائے جو پہلے گرفتاری ڈالے بغیر چوکوں اور چھکوں کی موسلا دھار بارش کرے اور بعد میں گرفتاری ڈال کر پولیس مقابلہ کروا دے؟

وہ صاحب بولے کہ آپ کچھ بھی کہیں لیکن اس معاملے میں پوری تحقیقات ہونی چاہئیں؟ میں نے کہا کہ آپ نے بجا فرمایا لیکن یہ تحقیقات کرے گا کون؟ آپ خدا کو حاضر ناظر جان کر فرمایئے کہ کیا ہمارا کوئی تحقیقاتی ادارہ ایسا ہے جس کی تحقیقات پر یقین کیا جا سکے؟ اگر ہوتا تو کیا شہید محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کی تحقیقات اقوامِ متحدہ سے کروائی جاتیں؟ آپ ستر ارب ڈالر سے زائد کے قرضوں اور روپئے کی مقابلے میں ڈالر کی بلند ترین تاریخی قیمت کو گواہ مان کر بتایئے کہ کیا ہماری استطاعت اتنی ہے کہ کرکٹ ٹیم کی ناکامی کی تحقیقات بھی اقوامِ متحدہ سے کروائیں، بفرضِ محال کروا بھی لیں تو ''کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک'' کے

مصداق ان تحقیقات کے مکمل ہونے تک زندہ کون رہے گا؟

ان صاحب نے کہا کہ آپ پہلے پاکستانی ہیں جو کرکٹ ٹیم کی شکست پر سنجیدہ دکھائی نہیں دیتے، کیا آپ کو شاہد آفریدی کی ''بال ٹمپرنگ'' کا ملال بھی نہیں جس نے پوری قوم کی عزت خاک میں ملا دی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ کاش ہم جسطرح کرکٹ کے معاملے میں سنجیدہ ہیں ویسے ہی دیگر معاملات میں بھی سنجیدہ ہوتے؟ کاش ہم جسطرح اس کھیل میں ناکامی پہ مغموم ہیں ویسے ہی تعلیم وتربیت، علم وآگہی، تخلیق وتجدید اورتہذیب واخلاق میں اپنی شکست پر بھی دُکھی ہوتے؟ آپ خود ہی فرمایئے کہ اگر ہم یہ کرکٹ سیریز جیت بھی جاتے تو کیا انسانی ترقی کے انڈکس میں ہماری پوزیشن بہتر ہوجاتی؟ بلکہ اگر ہم کرکٹ کا ہر مقابلہ بھی جیت جائیں تو بھی کیا وطنِ عزیز کے طول وارض میں پھیلی لاقانونیت اور کرپشن ختم ہوجائے گی؟ ذرا سوچیے کہ کیا چین کی کوئی کرکٹ ٹیم ہے؟ کیا جاپان نے کبھی کوئی کرکٹ سیریز جیتی؟ لیکن ہر دوممالک کہاں ہیں اور ہم کہاں ہیں جبکہ ہم دوورلڈ کپ بھی جیت چکے ہیں؟ میں یہ نہیں کہتا کہ کھیل بری چیز ہے لیکن زندگی کے ہر شعبے میں کھیل کُود پر انحصار بھی تو اچھی بات نہیں، آئین وقوانین میں کھیل کود، عدل وانصاف میں کھیل کود، معیشت ومعاشرت میں کھیل کود، تاریخ جغرافیے میں کھیل کود، (اورتواور) ہم مذہب کے ساتھ کھیلنے سے بھی دریغ نہیں کرتے؟

انہوں نے کہا کہ میں سمجھا نہیں؟ میں نے گزارش کی کہ سیدھی سی بات ہے، جومقام قوم کرکٹرز کو دیتی رہی وہ سائنسدانوں اور مفکروں کو دے دیتی تو آج ملک دیکھنے کے قابل ہوتا۔ وہ بڑی بیزاری سے بولے کہ بات کہاں سے چلی تھی اور آپ اسے کہاں لے گئے؟ میں نے عرض کی کہ بات اب بھی وہیں کی وہیں ہے اور حیرت ہے ان لوگوں پر جو یہ سمجھتے ہیں کہ شاہد آفریدی نے ''بال ٹمپرنگ'' کر کے قوم کی عزت خاک میں ملا دی ہے، کیا قوم کی کوئی عزت تھی؟ جن قوموں کی عزت ہوا کرتی ہے کیا ان کے ساتھ بین الاقوامی ایئرپورٹوں پر ویسا ہی سلوک کیا جاتا ہے جیسا ہمارے ساتھ ہوتا ہے؟ شاہد آفریدی کوئی آسمان سے تو نہیں

اترا، ہمارے ہی معاشرے میں پروان چڑھنے والا ایک انسان ہے،.جی ہاں وہی معاشرہ جس کے رگ و ریشے میں کرپشن لہو کی طرح دوڑتی پھرتی ہے اور جہاں کے لوگ عادتاً بھی کرپٹ ہوتے ہیں، جہاں کی حکومتیں قومی دولت لوٹنے والوں کے حق میں این آر او جیسے قوانین بناتی ہیں اور قومی دولت ہی لٹا کر انکا دفاع بھی کرتی ہیں،اس سے بڑی ''ٹمپرنگ'' بھی کیا کوئی ہو سکتی ہے؟ اور اس ٹمپرنگ کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جو ایک ''جمہوریہ'' کی آئین جیسی مقدس ترین دستاویز کے ساتھ آئے روز کی جاتی ہے،کون نہیں جانتا کہ اس ٹمپرنگ کی سزا موت ہے لیکن یہ ٹمپرنگ کرنے والوں کو کیا'' گارڈ آف آنر'' کے ساتھ رخصت نہیں گیا؟ اور ان سے پہلے جنہوں نے یہ ٹمپرنگ کی کیا انکی برسیاں نہیں منائی جاتیں؟ شاہد آفریدی کی بال ٹمپرنگ بھی کوئی ٹمپرنگ ہے؟ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ شاہد آفریدی نے قوم کی عزت میں اضافہ کیا تو کیا یہ غلط ہوگا جبکہ این آر او کے اجرا اور اٹارنی جنرل آف پاکستان کے ذریعے اس کے دفاع سے ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ''ٹمپرنگ'' ہماری قومی ترجیح ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ ''ٹمپرنگ'' کے جرم میں پی سی بی کی جانب سے شاہد آفریدی کو سنائی جانے والی ہر سزا سراسر ناانصافی کے مترادف ہوگی بلکہ اگر بین الاقوامی کرکٹ ایسوسی ایشن شاہد آفریدی کو کوئی سزا سنائے تو کیا انصاف کا تقاضا یہ نہیں کہ پی سی بی قومی دولت سے وکیل کر کے ان کا تحفظ کرے؟ جن لوگوں کو یہ گلہ ہے کہ پی سی بی میں تقرریاں سیاسی بنیادوں پر ہوتی ہیں اور کھلاڑیوں کے انتخاب میں بالعموم میرٹ کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھا جاتا وہ کیا یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ ہمارے ملک میں کونسی جگہ ایسی ہے جہاں سیاست نہ چلتی ہو اور میرٹ چلتا ہو؟ ہمارے ملک پر جب تک قانون کی بالادستی قائم نہیں ہوتی کیا ہمارا کوئی ایک ادارہ بھی ٹھیک طریقے سے چل سکتا ہے؟ کیا ''جزو'' کو ''کل'' سے الگ کر کے تجزیہ کیا جانا چاہیے؟ اگر ہم نے اپنے معاشرے پر آئین کی حکمرانی قائم کر دی تو کیا سب کچھ خود بخود درست نہیں ہو جائے گا؟

ان سوالوں کے جواب میں وہ صاحب خاموش ہو گئے،تو میں نے یہ کہتے ہوئے گفتگو

کو سمیٹنا شروع کر دیا کہ ہماری کرکٹ ٹیم آسٹریلیا گئی تو میں نے بھی اپنی تمام تر توجہ کرکٹ پر مرکوز کر کے یہ امید باندھ لی تھی کہ ہوسکتا ہے ہم یہ سیریز جیت کر اپنے سارے مسائل حل کر لیں۔ بالکل ویسے ہے جیسے 1992ء کے ورلڈ کپ میں کامیابی حاصل کر کے ہم نے ملک سے کرپشن، اقربا پروی، ناانصافی، جہالت اور قدامت کا خاتمہ کر دیا تھا یا جیسے گزشتہ برس ٹونٹی ٹونٹی کے ورلڈ چیمپین بن کر ہم نے لوڈ شیڈ نگ، مہنگائی، غربت اور لاقانونیت سے نجات حاصل کر لی تھی لیکن افسوس کہ ہماری بیٹنگ اور فیلڈ نگ نے ہمارا ساتھ نہ دیا، اتنے تھوڑے رنز بنے اور اتنے زیادہ کیچ ڈراپ ہوئے کہ کراچی میں امن وامان کی صورتحال بھی بہتر نہ ہوسکی۔ میں بھی آپ ہی کی طرح پریشان ہوں، فرق صرف اتنا سا ہے کہ آپ کی پریشانی اور طرح کی ہے اور میری اور طرح کی

اپنا اپنا فراق ہے لیکن
حال تیرا وہی جو میرا ہے

آپ کو یہ رنج ہے کہ ساری کرکٹ ٹیم کو بالعموم اور شاہد آفریدی کو بالخصوص سخت سے سخت سزا کیوں نہیں دی جا رہی اور مجھے یہ غم ہے کہ کرکٹرز کا کیس بھی این آر او کے تحت ختم کیوں نہیں کر دیا جاتا؟

روزنامہ جناح، 11/2/2010

بے رحم ہاتھ

ہمارے آس پاس ہمارے شہر ہمارے ملک میں جگہ جگہ حکیموں اور ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کی دکانیں دکھائی دیتی ہیں جن میں سے کئی کے بڑے بڑے اشتہار اخبارات اور رسائل کی زینت بھی بنتے ہیں، ان کا دعوی یہ ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی بیماری ایسی نہیں جس کا علاج ان کے پاس نہ ہو، علاج بھی بڑا ہی موثر، بڑا ہی آسان اور بڑا ہی سستا، جسکا کوئی سائڈ ایفکٹ بھی نہیں۔ اسی لیے بے شمار لوگ طرح طرح کی بیماریاں لے کر بڑی امید کے ساتھ ان حضرات کے پاس جاتے ہیں لیکن کیا کوئی یہ بھی جانتا ہے کہ ان میں سے اکثر کی حقیقت کیا ہے اور جن ادویات کا استعمال یہ ہم پر کرتے ہیں وہ کہاں تیار کی جاتی ہیں؟

پاکستان میں 130 ہومیو پیتھک میڈیکل کالج اور 33 روایتی طب کے تعلیمی ادارے ہیں لیکن اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور اور ہمدرد یونیورسٹی کے علاوہ کوئی بھی ہائر ایجوکیشن کمیشن سے منظور شدہ نہیں۔ یہی وہ ادارے ہیں جہاں ہومیو پیتھی اور طب کی 5 سالہ تعلیم دی جاتی ہے اور اس کے لیے پری میڈیکل کے ساتھ ایف ایس سی کا حامل ہونا ضروری ہے ورنہ باقی تمام اداروں میں چار سالہ کورس کروائے جاتے ہیں جن میں داخلہ لینے کے میٹریکولیٹ ہونا بھی کافی ہوتا ہے۔ میٹرک بھی حال ہی میں سائنس کے ساتھ ضروری قرار پائی ہے ورنہ پہلے تو ہومیو پیتھک ڈاکٹر یا یونانی اور آیورویدک طبیب بننے کے لیے ''آرٹس کے ساتھ میٹرک'' بھی کافی ہوا کرتی تھی۔

یورپ میں ہومیو پیتھی ایک specialised شعبے کا درجہ رکھتی ہے ہے جسے کوئی عام آدمی اختیار نہیں کر سکتا بلکہ ایلو پیتھک ڈاکٹر ہی اختیار کر سکتے ہیں، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ایم بی بی ایس کے بعد جسطرح آنکھ کی، جلد کی یا کوئی بھی دوسری سپیشلا ئزیشن کی جاتی ہے ویسے ہی ہومیو پیتھی کو بھی پڑھا جاتا ہے۔

آرٹس کے ساتھ میٹرک کرنے کے بعد چار سالہ کورس اور پھر کسی بھی مریض کا علاج

کرنے کا لائسنس ایک ایسا کام ہے جس کی مثال کسی بھی مہذب معاشرے میں نہیں مل سکتی؟ کئی کے پاس تو چار سالہ ڈپلومہ بھی نہیں۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ ہم یہ کام شوقیہ کرتے ہیں۔ کیا دنیا میں کہیں اور بھی ایسا ہوتا ہوگا کہ لوگوں کی صحت سے کھیلنا کسی کی Hobby ہو؟

یونانی، آیورویدک اور ہومیو پیتھک تعلیم اور ادویات پر جو نام نہاد نگرانی ہوتی ہے وہ نیشنل کونسل برائے ہومیوپیتھی اور نیشنل کونسل برائے طب کے ذریعے ہوتی ہے جنکے ممبران کی اکثریت انہی تعلیمی اور ادویات ساز اداروں کے مالکان پر مشتمل ہوتی ہے۔

وطنِ عزیز میں اس وقت تقریباً ایک لاکھ تیس ہزار ہومیو پیتھک ڈاکٹر اور 45000 طب کے Practitioners موجود ہیں لیکن یہ تمام بھی اپنی اپنی کونسل کے پاس بھی رجسٹرڈ نہیں۔ نجانے کتنوں نے پیشہ ورانہ تعلیم ایسے اداروں سے حاصل کر رکھی ہے جہاں داخلے سے فراغت تک کوئی مستند معیار سرے سے مقرر ہی نہیں۔ نہ امتحان کا کوئی ٹھوس طریقہ کار، نہ تعلیم کا کوئی مستند نظام، نہ کسی بورڈ یا یونیورسٹی سے affiliation۔ ان میں بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو اشتہارات کے ذریعے ایسی ایسی بیماریوں کے علاج پر اتھارٹی ہونے کا دعوی کرتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے مثلاً شوگر یا ہیپاٹائٹس سی کا علاج جبکہ ہر دو کونسلز کے موجودہ اور کچھ سابق صدور (جن سے میں ملا) نے بذاتِ خود مجھ سے کہا کہ اگر لبلبہ کام کرنا چھوڑ دے تو اس کا کوئی علاج نہیں ہوسکتا، نہ ہی ہیپاٹائٹس سی کے وائرس پر کسی ہومیو پیتھ یا طبیب کا زور چل سکتا ہے؟

ہومیو پیتھک اور طب کی جن ادویات کا بے دریغ استعمال ہم پر کیا جاتا ہے ان کے متعلق بھی کوئی قانون لاگو نہیں۔ اس حساس ترین معاملے میں جو تھوڑی بہت قانون سازی قیامِ پاکستان کے 58 سال بعد یعنی 2005 میں سٹینڈنگ کمیٹی سے منظور ہوئی وہ تا حال قومی اسمبلی سے پاس نہیں ہوسکی اور جب تک یہ قانون لاگو نہیں ہو جاتا جس کا جہاں بھی جی چاہے وہ اپنی مرضی کی کوئی بھی دوا بنا سکتا ہے، اور تو اور اگر وہ یہ دوا دکان میں بیٹھ کر تیار کرے تو بھی اسے اس کام سے روکنے کا کوئی قانون موجود نہیں۔ ان ادوایات کی تیاری میں جو خام مال استعمال کیا جاتا

ہے اس کے لیے بھی کوئی قانون وضع شدہ نہیں کہ اگر وہ مال صحیح نہ ہو تو ادویات ساز کے خلاف کیا کارروائی کی جائے گی؟ یہی وجہ ہے کہ ان ادویات میں Steroids کا کھلا استعمال کر کے لوگوں کو بیوقوف بنانے، انکے مدافعتی نظام کو کمزور کرنے اور انکی صحت کو بگاڑنے کی شکایات آئے روز سننے کو ملتی ہیں۔ اسی طرح جو کُشتے بنائے جاتے ہیں ان میں metal اور دیگر دھاتوں کا استعمال کیا جاتا ہے جو درست پراسیسنگ نہ ہونے کی وجہ سے انتہائی نقصان دہ ہوتی ہیں۔

کچھ ادارے عمدہ معیار کی ادویات بھی بنا رہے ہیں، ان اداروں کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ وہ کام جو ہمارے یہاں کہیں بھی کرنے کی کھلی چھٹی ہے اس کے لیے کتنے خاص اور حساس انتظامات کی ضرورت ہوتی ہے، جو نہ ہوں تو مختلف قسم کے بیکٹیریا اور جراثیم ادویات میں داخل ہو کر انہیں کھانے والوں کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچاتے ہیں۔

بین الاقوامی ادارہ برائے صحت کے اشتراک سے قومی ادارہ برائے صحت نے پاکستان میں روائتی ادویات بنانے والی کمپنیوں کے نمائندگان کے تعاون سے رہنما اصول تو بنائے لیکن ان کی حیثیت قانون کا درجہ نہیں رکھتی یعنی ان پر کوئی عمل کرے یا نہ کرے یہ اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس اقدام سے بھی خاطر خواہ نتائج برامد نہیں ہو سکے۔

ہمارے یہاں انگریزی ادویات بھی بالعموم قانون کے مطابق نہیں بنائی جاتیں لیکن انکے متعلق کوئی قانون کم از کم موجود تو ہے جس پر کسی وقت بھی عملدرآمد کرایا جا سکتا ہے لیکن روایتی طریقہء علاج کا کوئی قانون تو سرے سے موجود ہی نہیں، اسے جلد از جلد پاس کیا جانا چاہیے اور اس پر عملدرآمد کو بھی یقینی بنانا چاہیے جس کا اختیار ہمارے پاس نہیں لیکن کیا ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ جعلی حکیموں اور ڈاکٹروں کے بے رحم ہاتھوں میں اپنی نبض تھمانے سے اجتناب کریں؟ اور کچھ نہیں تو انہیں معائنہ کروانے سے پہلے انکی تعلیم اور رجسٹریشن کے کاغذات ہی دیکھ لیا کریں، جنہیں دیکھنا آپ کا حق ہے اور جنہیں دکھانا ان کا فرض؟

روزنامہ جناح، 22/5/2009

شاپنگ بم

اگر آپ کو پتا چل جائے کہ پلاسٹک کا تھیلا کتنی خطرناک صفات کا حامل ہے تو یقین مانیے کہ آپ اسے شاپنگ بیگ کے بجائے شاپنگ بم کہنا شروع کر دیں۔ جس فیکٹری میں یہ بنتا ہے وہاں کام کرنے والے مزدوروں کی صحت کو اس میں موجود کیمیکلز کی وجہ سے ہر وقت خطرہ لاحق رہتا ہے۔ جو گوشت، سبزیاں پھل وغیرہ اس میں ڈال دیے جاتے ہیں ان سے کرومیم، کیڈمیم اور کاپر کی آمیزش کے باعث الرجی اور کئی دوسری بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ جس کچرے کے ڈھیر میں اسے پھینک دیا جاتا ہے وہاں موجود بچھی کچھی سبزیوں کے ساتھ کوئی جانور یا پرندہ اسے بھی کھالے تو اس کی انتڑیوں میں گھس کر اسے ہلاک کر دیتا ہے۔ جن سیوریج لائنوں اور نالیوں سے اسکا گزر ہو جاتا ہے وہ رُک جاتی ہیں اور ان سے گزرنے والا گند باہر نکل کر گلی کوچوں اور سڑکوں میں پھیل جاتا ہے۔ ندی نالوں اور دریاؤں میں بہہ کر سمندروں تک پہنچ جاتا ہے تو وہاں آباد آبی مخلوقات کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے جو اسے نگلنا تو جانتی ہیں لیکن یہ نہیں جانتیں کہ اسے ہضم کرنا کرہِ ارض کے کسی بھی جاندار کے بس کی بات نہیں۔ زمین کے اوپر رہتا ہے تو اس میں بارش کا پانی بھر جانے کے بعد یہ ملیریا اور ہیپاٹائٹس جیسے جان لیوا امراض پھیلانے والے مچھروں کی کالونی کا روپ دھار لیتا ہے اور زمین کے اندر چلا جاتا ہے تو اسے بانجھ کر کے چھوڑ دیتا ہے۔ اسے ''ڈی کمپوز'' ہونے میں ایک ہزار سال بھی لگ سکتے ہیں۔ اسے جلایا بھی نہیں جا سکتا کہ اسے جلانے سے ایسی گیسیں پیدا ہوتی ہیں جو انسانی صحت کے لیے بڑی نقصان دہ ہوتی ہیں۔

بنگلہ دیش میں پلاسٹک کے تھیلے پر پابندی کے مطالبے نے اس وقت زور پکڑا جب 1988 اور 1998 میں اس نے سیوریج لائنوں کو روک کر سیلاب سے ہونے والے نقصان میں ناقابل تلافی اضافہ کر دیا۔ کینیا میں اسکی مخالفت کی وجہ اس سے پھیلنے والا ملیریا تھا جس نے اس علاقے کو ایسی شدید لپیٹ میں لے لیا کہ ہسپتالوں میں داخل ہونے

والے 50% مریض ملیریے کا شکار ہوتے تھے۔ اور نیپال میں اس کے خلاف اس وقت آواز اُٹھائی گئی جب اسے وہاں پائی جانے والی ماحولیاتی آلودگی کی بنیادی وجہ قرار دیا جانے لگا۔

ہندوستان کی کئی ریاستوں نے پلاسٹک کے تھیلے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ ہما چل پردیش، گوا اور سکھم میں یہ پابندی اس وقت لگائی گئی جب اس تھیلے نے ان صحت افزا مقامات کو بدنما و آلودہ کر کے سیاحت کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ دہلی، پنجاب اور مہاراشٹرا میں یہ پابندی اس وقت لگائی گئی جب کچرے کے ڈھیروں سے اسے نگل کر ہر سال سینکڑوں مویشی بالخصوص گائیں ہلاک ہونے لگیں اور ممبئی میں یہ پابندی اس وقت لگائی گئی جب وہاں طوفانی بارشوں کے دوران نالیوں کو بند کر کے اس نے سیلاب کو انتظامیہ کے قابو سے باہر کر دیا۔ نیز وہاں کہ ساحلوں سے ایسی مچھلیوں اور کچھووں کی لاشیں کثرت سے ملنے لگیں جن کے منہ سے آدھا شاپنگ بیگ باہر نکلا ہوتا تھا اور آدھا انکی انتڑیوں میں جا کر انکی موت کا سبب بن چکا ہوتا تھا۔

بعض ممالک میں اس پر پابندی لگانے کے بجائے اسے بنانے والی فیکٹریوں پر بھاری سرچارج/ٹیکس عائد کر دیا گیا ہے جس سے آئر لینڈ میں پہلے 6 مہینے کے دوران ہی اسکے استعمال میں 90% کمی اور ڈنمارک میں 66% کمی واقع ہوئی ہے۔ آسٹریلیا میں بھی اس سلسلے میں قانون سازی کی جارہی ہے جہاں ہر سال 6 ارب شاپنگ بیگ استعمال کیے جاتے ہیں اور نیوزی لینڈ بھی آسٹریلیا کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔

پلاسٹک کے تھیلے کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ بنانے والے اب اسے اتنا باریک بناتے ہیں کہ اسکی ری سائکلنگ بھی ممکن نہیں اسی لئے تو ہندوستان کی وزارت ماحولیات نے کئی علاقوں میں اسکی فیکٹریوں کو اسے ایک خاص سائز (8x12 انچ و 20 مائکرون چوڑائی) میں بنانے پر پابند کر دیا ہے تا کہ استعمال کے بعد اس سے پلاسٹک کی دیگر اشیا بنائی جا سکیں اور یہ آلودگی میں اضافے کا باعث نہ بنے۔ لیکن یہ تجربہ امریکہ میں پہلے ہی ناکام ہو چکا

ہے جہاں ہر سال استعمال ہونے والے 100 ارب شاپنگ بیگوں میں سے صرف 0.6% ''ری سائکل'' کیئے جا سکے اس لئے کہ انہیں گلی کوچوں میں سے اکٹھا کرنا ممکن نہیں ہو سکا۔

جنوبی افریقہ کی حکومت نے بھی شروع شروع میں پلاسٹک کے پتلے اور غیر معیاری شاپنگ بیگ پر پابندی لگائی تا کہ ایک طرف تو قیمت بڑھنے سے اس کی پیداوار میں کمی واقع ہو اور دوسری طرف معیار میں بہتری کی وجہ سے ایک تھیلا کئی کئی بار استعمال کیا جا سکے لیکن اس تجربے کی ناکامی کے بعد اب وہاں بھی اس پر مکمل پابندی لگانے کے بارے میں سوچا جا رہا ہے۔ جنوبی افریقہ میں ہر سال پلاسٹک کے 8 ارب شاپنگ بیگ استعمال کیے جاتے ہیں اور گلی کوچوں میں یہ تھیلا اتنی کثرت سے دکھائی دیتا ہے کہ وہاں کے لوگ اسے از راہِ مذاق اپنا ''قومی پھول'' قرار دیتے ہیں۔

پاکستان میں بھی کہیں کہیں شاپنگ بیگ کے استعمال پر پابندی عائد ہے۔ مثال کے طور پر گوجرانوالہ کینٹ اور اٹک آئل ریفائنریز میں اسکی جگہ کاغذ کا تھیلا استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ تجربہ ایک جگہ کامیاب ہو سکتا ہے تو دوسری جگہ کیوں کامیاب نہیں ہو سکتا؟

پلاسٹک کے تھیلے سے نجات کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس پر مکمل پابندی لگا کر اس کی جگہ کاغذ، کپڑے اور پٹ سن کے تھیلوں کو فروغ دیا جائے۔ پٹ سن کا تھیلا اس لئے بہتر انتخاب ہو گا کہ یہ کاغذ سے پائیدار اور کپڑے سے سستا ہوتا ہے۔ ''فیکٹری مالکان'' کی ''ناراضگی'' کے علاوہ پلاسٹک کے تھیلے پر پابندی میں سب سے بڑی رکاوٹ اسے بنانے والے مزدوروں کی بے روزگاری ہو سکتی ہے لیکن اس طرح تو منشیات پر پابندی لگاتے ہوئے اُن سے وابستہ لوگوں کی بے روزگاری کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔ ویسے بے روزگاری کا سوال اس لئے پیدا ہی نہیں ہونا چاہیے کہ ان مزدوروں کو کاغذ، کپڑے اور پٹ سن کے تھیلے بنانے والی فیکٹریوں میں برسرِ روزگار کیا جا سکتا۔

پلاسٹک کا تھیلا کتنی تیزی سے ہمارے گرد گھیرا تنگ کر رہا ہے اسکا اندازہ اس بات سے

بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں ہر سال پلاسٹک کے جتنے تھیلے استعمال کیے جاتے ہیں انہیں ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا جائے تو ایک محتاط اندازے کے مطابق ،زمین کے گرد 3083 مرتبہ لپیٹا جا سکتا ہے۔

شاپنگ بیگ ایک ایسا بم ہے جو ہمیں مکمل طور پر تباہ و برباد کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے اور ایسا کرنے کے لیے اسے پھٹنے کی ضرورت بھی نہیں۔اسے استعمال کرنے سے پہلے کم از کم اتنا ضرور سوچ لینا چاہیے کہ اس سے بروقت چھٹکارا حاصل نہ کیا گیا تو ایک نہ ایک روز یہ کرہ ارض سے زندگی کا نام و نشان تک مٹا دے گا۔

روزنامہ خبریں،7/4/2008

انتباہ

ایک رات کچھ دیر سے گھر واپسی ہوئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہمارے سامنے والے محل نما مکان کے صحن میں شراب اور شباب کی محفل گرم ہے۔ جام چھلک رہے ہیں، طوائفیں ناچ رہی ہیں۔ یہ سب کچھ میرے کمرے سے صاف صاف دکھائی بھی دے رہا تھا اور سنائی بھی دے رہا تھا، جسکی وجہ سے میری اہلیہ اسقدر سہمی ہوئی تھیں کہ کمرے کو اندر سے کنڈی لگا رکھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ زاروقطار رونے لگیں۔ رو رو کر جی کچھ ہلکا ہوا تو بولیں کہ ٹی وی پر اس بچے کو دکھا رہے تھے جس کا والد خودکش حملے کی زد میں آ کر شہید ہو گیا۔ وہ بچہ ہمارے بیٹے ہی کے جتنا ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اس بے چارے نے کوئی جرم نہیں کیا لیکن ساری زندگی کتنی بڑی سزا بھگتے گا اور اسکی ماں کس قیامت سے گزرے گی؟ اسی دوران سامنے والوں نے بدتمیزی و بیہودگی کا طوفان اٹھا دیا۔ ناچ گانے سے پہلے یہ لوگ شراب پی کر ایک دوسرے کو ماں بہن کو ننگی ننگی گالیاں اتنی اونچی آواز میں نکال رہے تھے کہ اڑوس پڑوس میں شاید ہی کسی کو سنائی نہ دی ہوں۔ شکر ہے آپ آ گئے ورنہ میں اسقدر ذہنی دباؤ کا شکار تھی کہ یوں لگ رہا تھا جیسے ''نروس بریک ڈاؤن'' ہو جائے گا۔ یہ باتیں میرے ایک قاری نے اپنی بیوی کے حوالے سے مجھے فون پر بتائیں اور یہ سوال مجھ سے بھی پوچھا اور قارئین سے بھی پوچھنے کے لیے کہا کہ اس واقعے کے بعد وہ مکان بدلنے کے سوا کیا کر سکتے ہیں؟ پولیس کا حال کسی سے پوشیدہ نہیں اور اڑوس پڑوس سے کوئی توقع اس لیے نہیں کی جا سکتی کہ صدیوں کی غلامی نے ہمارا مزاج ان لوگوں جیسا بنا دیا ہے جنہیں کسی جرم کے بغیر سر بازار مرغا بنا کر جوتے مارے جانے لگے تو وہ اس ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے کے بجائے اس بات پر احتجاج کرنے لگے کہ جوتے مارنے والوں کی تعداد بہت کم ہے جس کی وجہ سے انہیں جوتے کھانے کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے؟

ان صاحب کی بات سے مجھے یاد آیا کہ ایک رات دفتر سے واپسی پر میرے آگے کوئی بارات جا رہی تھی جو راستے میں ایک جگہ رکی تو اتنی فائرنگ کی گئی کہ کان بند ہو گئے اور میں اس

سوچ میں کھو گیا کہ کیا دنیا کی کوئی اور قوم بھی ایسی ہو گی جو پیشہ ور ڈاکوؤں اور قاتلوں کی طرح اپنی خوشیاں منائے؟ اور ایسے ملک کا کیا بنے گا جو تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑا ہو لیکن اس کے شہری شراب کے نشے میں دُھت، ہوائی فائرنگ کے ذریعے خوشی کے شادیانے بجاتے پھریں؟

جسطرح ''نیٹو'' کے روپ میں امریکہ نے ہم پر نشانہ باندھ رکھا ہے ایسے ہی ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے لبادے میں کبھی برطانیہ بھی ہمارے وسائل کی تاک میں تھا جب ہم گلی کوچوں میں کبوتر اڑایا کرتے تھے اور ہمارے حکمران اپنے جوتے بھی خود نہیں پہنتے تھے۔ سینکڑوں برس بیت گئے لیکن ہم بے حسی کے دلدل سے نکلنے کے بجائے کیا اس میں اور بھی بری طرح نہیں دھنس گئے؟

میں نے ان صاحب سے کہا کہ آپ کتنی بار گھر تبدیل کریں گے؟ گھر تبدیل کر کر کے تھک گئے تو کیا ملک تبدیل کریں گے؟ اور ملک تبدیل کریں گے تو کیا سارے کے سارے عزیز و اقارب کو بھی ساتھ لے جائیں گے یا کچھ کو پاکستان میں ہی بدتمیزی و بیہودگی کے بھینٹ چڑھنے کے لیے چھوڑ جائیں گے؟ بہر طور میں آپ کا سوال اپنے تمام قارئین تک ضرور پہنچاؤں گا، انکی توجہ اس عظیم ارشادِ باری تعالی کی جانب بھی مبذول کرانے کی سعی کروں گا کہ خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی حالت خود بدلنے کی کوشش نہیں کرتی، اور انہیں 'انتباہ' کے عنوان سے لکھی اپنی یہ نظم بھی سناؤں گا کہ

جب خون بہے دریاؤں میں
پر تری زمیں بے رنگ رہے
جب درد بچھا ہو گلیوں میں
تو محوِ رباب و چنگ رہے
جب حشر بپا ہو دنیا میں

تو ساکت بے آہنگ رہے
برپا ہو جنگ آزادی کی
تلوار تری پہ زنگ رہے
جب نام ہوس کا چاہت ہو
معیارِ فضیلت دولت ہو
قانونِ ضرورت رشوت ہو
اسبابِ تجارت مذہب ہو
ایمان روایت ہو جائے
انصاف بغاوت ہو جائے
حق بات حکایت ہو جائے
جب علم جہالت ہو جائے
جب آنکھوں والے اندھے ہوں
جب کانوں والے بہرے ہوں
جب فکر و عمل کی راہوں پر
تقلید کے اندھے پہرے ہوں
جب علم و ہنر کے آنگن میں
سب بنجر موسم ٹھہرے ہوں
جب امن کا سورج کھو جائے
جب ظلم کے بادل گہرے ہوں
جھوٹوں کے سوا سب جھوٹے ہوں
سچوں کے سوا سب سچے ہوں

ہوں انساں بدتر حیواں سے
شہروں سے جنگل اچھے ہوں
اوروں کے جو گھر تعمیر کریں
وہ فٹ پاتھوں پر بستے ہوں
ہوں آنگن جو مزدوروں کے
اوروں کے لئے وہ رستے ہوں
جو سب کا رزق کریں پیدا
وہ رزق کو آپ ترستے ہوں
معصوم کسانوں کے آنسو
جب نانِ جویں سے سستے ہوں
ہو وقعت سونے چاندی کی
انساں بے وقعت ہو جائے
ہو اپنا پیٹ بھرا لیکن
ہمسایہ بھوکا سو جائے
جب ایسی ساعت آتی ہے
دم بھر میں صدی لُٹ جاتی ہے

روزنامہ جناح،18/7/2008

روشنی سے ڈرتے ہیں

اس میں کچھ شک نہیں کہ مغربی قوتیں اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے کھلی بدنیتی کا مظاہرہ کر رہی ہیں لیکن اس کا مطلب کیا یہ ہے کہ ہم اپنے گریبان میں جھانکنا بند کریں؟ ہمارے بارے میں اہلِ مغرب کا رویہ ضرور منفی ہے لیکن اس میں کیا ہمارا کوئی قصور نہیں؟ کیا آگ کے بغیر دھواں اڑ سکتا ہے؟ کیا ایک ہاتھ سے تالی بج سکتی ہے؟ آپ کی خدمت میں چند اقتباسات پیش کرتا ہوں جو میں نے ان جانے مانے تاریخ دانوں اور ادیبوں کی کتابوں سے لیے جن میں کوئی ایک بھی مسلمان نہیں، ان پر توجہ فرمایئے اور سوچیے کہ جب ہم تعریف کے قابل تھے تو کیا ہمارے ''دشمن'' بھی ہماری عظمت کے گیت نہیں گاتے تھے؟

''تہذیب کا وہ عالی شان محل جس کی تعمیر میں چار ہزار سال لگے گرنے کے قریب پہنچ چکا تھا اور نوعِ انسانی پھر اسی چنگیزیت کی طرف لوٹنے والی تھی، جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا اور آئین وضوابط کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ عیسائیت نے جس قانون کو رائج کیا تھا وہ وحدت و یکجہتی کے بجائے بے اطمینانی، اختلاف، بربادی اور ہلاکت کا باعث بن رہا تھا۔ ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند و بالا درخت جس کی ہری بھری شاخیں کبھی ساری دنیا پر سایہ فگن تھیں اور سائنس و لٹریچر کے سنہری پھولوں سے لدی ہوئی تھیں، اب لڑکھڑا رہا تھا۔ ان حالات میں کیا کوئی ایسا جذباتی کلچر پیدا کیا جا سکتا تھا جو نوعِ انسانی کو ایک مرتبہ پھر ایک نکتہ پر جمع کر دے اور اس تہذیب کو مٹنے سے بچالے؟ اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہیے تھا کہ پرانی رسومات و آئین سب مردہ ہو چکے تھے اور انہی جیسے اور قوانین مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا۔ یہ امر موجبِ حیرت و استجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر عرب کی سرزمین سے پیدا ہو جبکہ اس کی اشد ضرورت تھی'' (Denison-Emosion as the basis of civiliation)

''محمدؐ نے ایسی حکومت کی بنیاد رکھی جسے تمام کرۂ ارض میں پھیلنا تھا اور جس میں سوائے عدل و انصاف کے کسی دوسرے قانون کو رائج نہیں ہونا تھا۔ آپؐ کی تعلیم تمام انسانوں کی

مساوات، باہمی تعاون اور عالمگیر اخوت تھی'' (Lerouge-Life of Mohammad)۔''اسلام اس دنیا کے لیے نجات و سعادت کا پیغام تھا جو جسمانی و ذہنی مصائب میں مبتلا اور غلامی سے چکنا چور تھی۔ جس عالمگیر حکومت کی بنیاد اسلام نے رکھی اس میں نسلی امتیاز کو کوئی دخل نہ تھا۔اس کا ایک ہی قانون تھا،سب کے لیے یکساں عدل و محبت''(George Rivorie-Vesages Del Islam)۔

''عیسائیت اور اسلام صلیبی جنگوں کے سلسلہ میں ایک دوسرے کے قریب آئے۔صلیب کے نیم وحشی سپاہیوں نے دیکھا کہ مسلمان اگرچہ مذہبی طور پر (ان کے نزدیک) مارے جانے کے قابل ہیں لیکن وہ ایک ایسی تہذیب کے مالک ہیں، جو ان کی اپنی تہذیب سے بدرجہا فائق ہے۔مسلم ثقافت کا یہی اثر تھا جس نے ازمنہء وسطیٰ کی تاریکیوں کا خاتمہ کر کے عہدِ حاضر کی روشنی کا آفتاب طلوع کیا'' (F.J.C Hearushaw.The Science of History)۔

''مسلمانوں نے صرف ملکوں کو فتح نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنی فتح کردہ زمینوں میں اسلام کے بیج بوئے۔ان بیجوں سے مساجد کا وجود سامنے آیا۔ ہر مسجد میں اپنا مکتب تھا۔علم کے متلاشی سیاسی مدبرین سے بھی زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔کتب خانے اور رسدگاہیں زندگی کا لازمی جزو بن چکی تھیں۔ یہ انسانی ذوق کا ایک نیا کھیل تھا جو نہایت جوش و انہماک سے کھیلا گیا،اس کھیل کو یونانی بھی مسلمانوں جیسی خوبی سے نہ کھیل سکے۔انہی عربوں سے یورپ نے زندگی کی ابتداء پائی اور فلکیات، نباتات، کیمیا، قانون، ریاضی، طب اور فلسفہ کا پہلا سبق لیا''(Dorsey-Civilization)۔''یورپ کے جدید لوگوں کا گہوارا اٹلی نہیں بلکہ اندلس تھا۔وہاں روما کی تہذیب گرتے گرتے چنگیزیت کی حد تک پہنچ چکی تھی یہاں دنیائے اسلام (بغداد، قرطبہ، قاہرہ) تہذیبی و ذہنی تحریکوں کا مرکز بن رہی تھی۔انہی شہروں میں وہ زندگی نمودار ہوئی جسے انسانی ارتقاء میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنا تھا، یہ نئی تہذیب محسوس طور پر سامنے

آئی تو دنیا حیاتِ نو سے شنا سا ہوئی۔ یہ بات یقینی ہے کہ مسلمانوں کے بغیر یورپ اس خصوصیت کو حاصل نہ کر سکتا جس نے اسے ارتقائی مراحل میں بلند ترین سطح پر لا کھڑا کیا‘‘(Briffault-Making of Humanity)۔

’’جدید تحقیق نے ہمیں اس نتیجہ پر پہنچایا ہے کہ یورپ کے علماء نشاۃ ثانیہ سے پہلے یونانی فلسفہ، ریاضی، فلکیات اور دیگر علوم کے متعلق جو کچھ جانتے تھے ان کا منبع لاطینی کتابیں تھیں اوران کا سرچشمہ عربی علوم تھے، جس قوت نے عربوں کے دل میں ان علوم کا شوق پیدا کیا وہ قرآنِ کریم تھا۔ (نہ صرف یہ فنی علوم بلکہ) لسانیات، شاعری اورادب کی دوسری شاخیں بھی قرآنِ کریم کی اشاعت کے ساتھ ہی نمودار ہوئیں اوراس طرح جس ادبی تحریک کی ابتدا ہوئی اس سے علم و ہنر اور ذہانت وفطانت کے شاندار ثمرات سامنے آئے‘‘(Margoliouth)۔

ان جامع بالذات تحریروں کو ہو سکے تو ایک مرتبہ پھر پوری توجہ سے پڑھیے اورآج کے مسلمانوں کو درپیش ان اہم ترین سوالوں کے جواب تلاش کیجئے کہ ہم کیا اب بھی عدل وانصاف کے سوا کسی قانون کو نہیں مانتے؟ کیا اب بھی ہماری تعلیم تمام انسانوں کی مساوات، باہمی تعاون اور عالمگیر اخوت ہے؟ کیا اب بھی ہماری ترجیحات میں نسلی امتیاز کو خاطر میں نہیں لایا جاتا؟ کیا اب بھی ہمارا واحد قانون سب کے لیے یکساں محبت ہے؟ مسیحی دنیا نے مسلم تہذیب کو اپنی تہذیب سے بدرجہا فائق مان کراس کے اوصاف اپنائے تو فائدہ کسے ہوا؟ ہم یورپی علوم کو بہتر جان کر ان سے استفادہ کریں گے تو اس سے کیا ہماری اپنی ہی بھلائی نہیں ہوگی؟ اگر ہماری علمی وسائنسی ترقی کو اپنا کر یورپ تاریکیوں سے اجالوں میں آ گیا تو کیا یورپ کی علمی وسائنسی ترقی سے ہمیں بھی اپنے اندھیروں میں شمع روشن نہیں کرنی چاہیے؟ کیا اب بھی ہماری مساجد کے ساتھ مکتب ہیں؟ کیا اب بھی ہماری مساجد میں فلکیات، نباتیات، کیمیا، قانون، ریاضی، طب اور فلسفہ کے اسباق پڑھائے جاتے ہیں؟ کیا اب بھی ہمارے یہاں سائنسدانوں اور مفکروں کو حکمرانوں سے زیادہ مقام دیا جاتا ہے؟ کیا اب بھی علم و ہنراور عقل وفکر مسلمانوں کا وطیرہ ہے؟ علامہ اقبال کا ایک شعر

یاد آ رہا ہے کہ

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر

ان سوالوں کے جواب ہمیں ہماری زندگی کے اس بند دریچے کی طرف لے جائیں گے جسے کھولنے سے ہم ڈرتے ہیں، شاید اس لیے کہ ہمیں اندھیرے میں رہنے کی عادت پڑ چکی ہے اور ہماری بینائی اب روشنی کا سامنا نہیں کرسکتی؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ اس دریچے کے ایک طرف ہمارا آج ہے دوسری طرف کل، ایک طرف دنیا ہے دوسری طرف آخرت۔ اور کیا آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کے بقول دنیا کا اندھا آخرت کا بھی اندھا ہوتا ہے؟ یقین مانیے کہ ہم نے یہ دریچہ نہ کھولا تو ہمارا حال بھی تاریک رہے گا اور مستقبل بھی۔ ہمت کیجئے اور آج اس دریچے کو کھول ہی دیجئے۔ آپ کی آنکھیں چندھیائیں گی ضرور لیکن تھوڑی ہی دیر میں آپ کو روشنی اچھی لگنے لگے گی اور پھر ہم اندھیرے سے ڈرنے لگیں گے بالکل ویسے ہی جیسے اب روشنی سے ڈرتے ہیں۔

روزنامہ خبریں، جولائی 2007

راستہ اب بھی کُھلا ھے

امریکی جارحیت اور اس پر ہماری قوم کے ردِعمل نے ان دو بھائیوں کی کہانی یاد دلا دی جن کا قصور یہ تھا کہ ان کا دکاندار باپ انہیں جاگیردار کی مرضی کے خلاف کالج میں داخلے کے لئے شہر بھیج رہا تھا۔ جاگیردار کے غنڈوں نے انہیں بہت مارا اور بہت بے عزت بھی کیا۔ جاگیردار نے تو پورے گاؤں کے سامنے ان کے آباؤ اجداد تک کو برا بھلا کہا۔

چھوٹے بھائی اکرم کے برعکس بڑے بھائی اسلم کا خیال یہ تھا کہ انہیں جاگیردار کے خلاف اپنے دل میں پائے جانے والے جذبات کو تعلیم کے حصول میں استعمال کرنا چاہیے تاکہ وہ معاشی و معاشرتی اعتبار سے اس مقام تک پہنچ جائیں جہاں وہ خود پر ہونے والے ظلم کا بدلہ لے سکیں اور آئندہ کوئی انہیں مارنے یا ان کے آباؤ اجداد کو بُرا بھلا کہنے کی جرات نہ کر سکے۔ اسلم نے اکرم کو بہت سمجھایا کہ ہمیں جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا چاہیے لیکن اکرم کی جذباتی طبیعت نے اسکی عقل پر پردہ ڈال رکھا تھا، اس نے اسلم کی بات نہیں مانی اور شہر جانے کے بجائے گاؤں میں ہی رہ گیا۔

اتنا تو اکرم بھی جانتا ہی تھا کہ جاگیردار سے مقابلہ اس اکیلے کی بس کی بات نہیں، چنانچہ اس نے گاؤں والوں سے مدد مانگی۔ وہ بے چارے کیا مدد کرتے؟ انکا تو بال بال جاگیردار کے قرض میں جکڑا ہوا تھا اور جو روکھی سوکھی انکے بیوی بچوں کو ملتی تھی وہ بھی جاگیردار کے کھیتوں سے ہی آتی تھی۔ انہوں نے بھی اسے بہت سمجھایا کہ ہم لوگ ابھی اس قابل نہیں کہ ظلم کا حساب لے سکیں لیکن اکرم کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا، اس نے جاگیردار کے ساتھ ساتھ گاؤں والوں کو بھی بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اور پھر ایک رات یہ سوچ کر کہ کیوں نہ اس روکھی سوکھی روٹی کا ہی کام تمام کر دیا جائے جو گاؤں والوں کو جاگیردار کی غلامی پر مجبور کرتی ہے، وہ کھلیانوں میں آگ لگا کر گاؤں سے بھاگ گیا۔ جلتی ہوئی تیار فصلوں میں غریب کسانوں کو اپنا سب کچھ جلتا ہوا دکھائی دیا۔ ایک کسان کا بیٹا ماکھا بھی اکرم ہی کی طرح جذباتی تھا، اس نے

طیش میں آ کر اکرم کے والد کی دکان کو آگ لگا دی۔ اکرم کے والد کو دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ اسکی خبر اکرم کو ہوئی تو اس نے جاگیردار کے ساتھ ساتھ ماکھے کو بھی اپنی ہٹ لسٹ میں شامل کرلیا۔ پھر تقریباً ایک برس بعد اچانک اکرم اپنے چند بندوق بردار دوستوں کے ساتھ گاؤں آیا اور دن دیہاڑے ماکھے کو قتل کر کے فرار ہو گیا۔ کچھ ہی عرصے میں اکرم ''اکو ڈاکو'' کے نام سے مشہور و معروف ہو گیا اور ان لوگوں کو بھی بُرا لگنے لگا جو اس کے ہمدرد ہوا کرتے تھے۔ پھر جب اُس نے جاگیردار کے چند غنڈوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تو جاگیردار کو اس سے خطرہ محسوس ہوا اور اس نے تھانیدار کے ساتھ مل کر اسے پولیس مقابلے میں مروا دیا۔ اس کی لاش پر آنسو بہانے والا فقط اسلم ہی تھا جو والد کی وفات کے بعد پہلی مرتبہ گاؤں آیا تھا۔

شہر میں اسلم کو محنت مزدوری کرنی پڑی لیکن اس نے تعلیم کا سلسلہ نہ ٹوٹنے دیا۔ مشقت کر کر کے اور پڑھ پڑھ کے جب وہ تھک جاتا تو اسے اپنی درد بھری داستان یاد آ جاتی اور جاگیردار سے انتقام کی لگن اسے تازہ دم کر دیتی۔ ''بی اے'' کرنے کے بعد اسے ایک دفتر میں کلرک کی نوکری مل گئی جس کے ساتھ ساتھ اس نے "C.S.S" کی تیاری شروع کر دی اور پہلی ہی کوشش میں یہ امتحان امتیازی حیثیت میں پاس کر لیا۔ پھر ایک روز وہ ''ایس پی'' کی حیثیت سے اپنے گاؤں میں داخل ہوا تو جاگیردار کو بھی پھولوں کے ہار سمیت اپنا منتظر پایا جو اسے اب نہیں پہچانتا تھا۔ اسلم کو جاگیردار کے خلاف وہ ٹھوس ثبوت اکھٹے کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا جن کی بنا پر عدالت نے اسے عمر قید کی سزا دی۔ اسلم نے اپنی ہوش مندی اور جواں مردی سے جاگیردار کو کیفر کردار تک پہنچایا اور اپنے اعلیٰ کردار کی وجہ سے وہ جلد ہی دشمنوں میں بھی احترام کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ اس طرح وہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں کوئی اس کے آباؤ اجداد کو بُرا بھلا کہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

عہد حاضر کے جاگیردار، امریکہ نے پاکستان کو بھی کم و بیش ویسے ہی مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں کبھی اسلم اور اکرم کھڑے تھے۔ اسی دوراہے پر امریکہ نے 1945 میں جاپان کو بھی لا

کھڑا کیا تھا۔ جاپانیوں نے اسلم کے راستے پر چل کر دن رات کی انتھک محنت ولگن سے سائنس ٹیکنالوجی اور دیگر علوم میں اپنالوہا منوایا، ایمانداری وسچائی سے معاشی ومعاشرتی استحکام حاصل کیا اور دنیا کے افق پر اتنی طاقتور اور باکردار قوم کی صورت اُبھرے کہ کوئی انہیں میلی آنکھ سے دیکھنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا لیکن افسوس کہ ہم اکرم کے راستے پر چل کر اپنا حال بھی تباہ کرنا چاہتے ہیں اور مستقبل بھی۔

کاش ہم یہ سمجھ سکیں کہ انسان جسکے ٹکڑوں پر پلتا ہو اس سے آنکھ اٹھا کر کبھی بات نہیں کر سکتا، امریکہ کا مقابلہ اونچی اونچی تقریروں اور زوردار کے نعروں سے نہیں کیا جا سکتا کہ اسکے لیے پہلے وہ کشکول توڑنا ہوگا جس میں امریکہ ڈالروں کی بھیک نہ ڈالے تو ہماری زندگی کا کاروبار معطّل ہو جاتا ہے اور اسے توڑنے کے بعد حوصلے اور قربانی کے ایک بڑے ہی مشقت طلب اور صبر آزما دور سے گزرنا ہوگا۔ اگر ہم منافقت، جھوٹ، بددیانتی، ناانصافی، رشوت خوری، چور بازاری اور قدامت پرستی سے اجتناب کر سکیں تو یقین مانیے کہ ہمیں ایک آزاد، خود مختار اور باوقار قوم بننے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ کاش ہم امریکہ کے خلاف اپنے دلوں میں پائے جانے والے جذبات کے دھارے کو منفی کے بجائے مثبت سمت میں موڑ سکیں اور اس سے پہلے کہ پولیس مقابلے میں مارے جائیں، اکرم کے راستے کو چھوڑ کر اسلم کا راستہ اپنالیں جو اب بھی کھلا ہے۔

روزنامہ خبریں،11/9/2006

خدا ہم پر رحم کرے

جسٹس عارف اقبال بھٹی کو قتل کر دیا گیا تھا، کون نہیں جانتا کہ وہ لاہور ہائی کورٹ کے جج تھے اور ان کا گناہ یہ تھا کہ انہوں نے دو بے گناہ عیسائی لڑکوں کو (ماتحت عدالت کی جانب سے سنائی گئی) موت کی سزا سے بری کر دیا تھا۔ لڑکوں کے خلاف اس الزام کے ساتھ توہینِ رسالت کا کیس بنایا گیا تھا کہ انہوں نے نازیبا کلمات ''لکھ'' کر حضور اقدسؐ کی شان میں گستاخی کی۔ لاہور ہائی کورٹ میں عیسائی لڑکوں کی وکیل محترمہ عاصمہ جہانگیر تھیں جنہوں نے اسی گاؤں کے کئی مسلمانوں کی گواہی سے یہ ثابت کیا کہ جن لڑکوں کو گستاخانہ کلمات تحریر کرتے ہوئے ''دیکھا گیا'' وہ لکھنا پڑھنا ہی نہیں جانتے۔ لڑکوں کے حوالے سے اس قسم کی باتیں بھی اخبارات میں آئیں کہ کسی نے اپنی اُس شرمناک حرکت پر پردہ ڈالنے کے لیے انہیں توہینِ رسالت کے کیس میں پھنسایا جس کے وہ چشم دید گواہ بن چکے تھے۔

غالباً اسی قسم کے واقعات کی وجہ سے ہندوستان کے نامور سکالر مولانا وحیدالدین خان کا خیال یہ ہے توہینِ رسالت کے حوالے سے مسلمانوں کا موجودہ رویہ بذاتِ خود توہینِ رسالت کے مترادف ہے؟ مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو کم از کم اتنا تو سوچنا چاہیے کہ اس ضمن میں حضورِ اکرمؐ کی اپنی سنت کیا ہے؟ کیا نبی مبارکؐ ان لوگوں کے حق میں بھی دعا نہیں مانگتے تھے جو آپؐ کی دل آزاری کرتے تھے؟

اس بڑھیا والا معاملہ تو ہمارے نصاب کی کتب میں بھی شامل ہے جو حضورؐ پر دیوار کے پیچھے سے کوڑا کرکٹ پھینک دیا کرتی تھی لیکن جواب میں کیا آپؐ نے اُسے کبھی کچھ کہا؟ سولی پر لٹکانا تو دور کی بات نبیؐ نے تو اسے کبھی بددعا تک نہ دی بلکہ اس نے کوڑا کرکٹ پھینکنا بند کر دیا تو پریشان ہو گئے کہ کہیں بیمار نہ پڑ گئی ہو اور ایسا ہی تھا جس کے بعد کسے معلوم نہیں کہ آپؐ اس کی تیمارداری کے لیے اس کے گھر چلے گئے اور جب یہ پتہ چلا کہ اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تو اس کے گھریلو کام کاج تک کرنے شروع کر دیے، بڑھیا نے آپؐ کا چہرہ مبارک کبھی نہ

دیکھا تھا اس لیے پہچان نہ سکی، پھر جب وہ ٹھیک ہوگئی تو اس نے حضورؐ سے کہا کہ تم بہت اچھے لڑکے ہو بس محمدؐ سے دور رہنا کیونکہ میں نے سنا ہے وہ اچھا آدمی نہیں، حضورؐ نے فرمایا کہ اور اگر میں یہ کہوں کہ میں ہی محمدؐ ہوں؟ تو بڑھیا بولی کہ پھر میں تم پر ایمان لے آؤں گی اور وہ مسلمان ہو گئی۔ آپ خود ہی سوچیے کہ اگر نبیؐ اس گستاخ بڑھیا کو برا بھلا کہتے یا کوئی سزا دیتے تو کیا وہ اسلام قبول کرتی؟ یہ بھی فرمایئے کہ آپؐ کے نقشِ قدم پر چلنا کیا ہمارا اولین فریضہ نہیں؟ اور یہ بھی بتایئے کہ جو شخص کسی ذاتی مفاد یا عناد کے لیے توہینِ رسالت کو ڈھال بنائے، کیا اس سے بڑا گستاخِ رسول بھی کوئی ہوسکتا ہے؟

طائف کے نمرودوں اور فرعونوں کو یاد کیجئے جنہوں نے دعوتِ حق کے جواب میں نبی اکرمؐ سے انتہائی استہزا آمیز اور حقارت انگیز گفتگو کی، یہی نہیں بلکہ جب آپؐ واپس لوٹنے لگے تو اوباش اور بازاری قسم کے لوگ راستے کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے اور آپؐ پر پتھروں کی بارش شروع کر دی یہاں تک کہ آپؐ کے جوتے لہو سے بھر گئے، آپؐ زخموں سے نڈھال ہو کر بیٹھتے تو آپ کو پکڑ کر کھڑا کر دیتے اور پھر پتھر مارنے لگتے، اسکے ساتھ ساتھ (نعوذ باللہ) گالیاں بکتے، تالیاں بجاتے اور شور مچاتے لیکن آپؐ نے کیا ان کے حق میں ہدایت کی دعا ہی نہیں مانگی؟ اور پھر جب یہ موقع آیا کہ آپؐ کے ایک اشارے پر طائف کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جاتی تو کیا آپ نے انہیں معاف نہیں کر دیا؟

کیا ہمیں مکہ بھی یاد نہیں جہاں اس وقت جو لوگ آباد تھے ان سے بڑا گستاخِ رسول کیا آج تک کہیں پیدا ہوا؟ ان سے زیادہ حضورؐ کی دل آزاری کیا آج تک کسی نے کی؟ لیکن فتحِ مکہ کے بعد آپؐ نے ''توہینِ رسالت'' کا قانون نافذ کر کے لوگوں کو سولی پر لٹکانے کے بجائے عام معافی کا اعلان کر دیا اور فرمایا کہ ''آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو''؟

کیا ہم لوگ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ اگر نبیؐ اسلام کے ناقدین کو پھانسی لگاتے یا زندہ جلا دیتے، اپنی بات تلوار کی نوک پر منواتے اور خدا کی عزت ڈنڈے کے زور پر کرواتے

تو کیا اسلام کو وہ عزت و رتبہ نصیب ہوتا جس نے ابوسفیان جیسے بدترین دشمنوں کے دل بھی موم کر دیے اور وہ پوری رضا و رغبت کے ساتھ اسلام کے دائرے میں داخل ہوئے؟ طائف اور مکہ کے لوگوں کو معاف کرنے سے اسلام کی جڑیں کتنی مضبوط ہوئیں، یہ استحکام کیا ان کافروں پر ویسے مظالم ڈھانے سے حاصل ہوسکتا تھا جیسے انہوں نے مسلمانوں پر ڈھائے تھے؟

نبی اکرمؐ نے تمام عمر قرآنِ کریم کی پیروی کی اور دین کی دعوت و تبلیغ میں ہمیشہ خدا کے وضع کردہ اصول ''لا اکراہ فی الدین'' (256 البقرۃ) یعنی دین میں زبردستی کی گنجائش نہیں، کو مدِ نظر رکھا کیونکہ آپؐ کی زندگی کا مقصد دلوں کو خدا کے حضور جھکانا تھا جو ڈنڈے کے زور پر نہیں جھکائے جا سکتے۔ خدائے بزرگ و برتر کی ہدایت یہ تھی کہ ''(اے پیغمبرؐ) اگر یہ منہ موڑتے ہیں تو ہم نے تمھیں کوئی نگران بنا کر نہیں بھیجا (کہ زبردستی انہیں راہِ حق پر لے آؤ)، تمھارے ذمہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم (پیغامِ حق کو) ان تک پہنچا دو'' (48 الشوری) ''چنانچہ تم یاد دہانی کراتے رہو کیونکہ تم یاد دہانی کرانے والے ہی ہو، تمھیں لوگوں پر داروغہ مقرر نہیں کیا گیا'' (22،21 الغاشیہ)۔

نبی اکرمؐ کی حیثیت ایک تھانیدار کی نہیں تھی بلکہ ایک ڈاکٹر کی تھی جسے اپنے نسخے پر زبردستی عمل نہیں کروانا ہوتا بلکہ یہ بتانا ہوتا ہے کہ اس پر عمل کرنے سے کیا فائدہ اور عمل نہ کرنے سے کیا نقصان ہوسکتا ہے، اس کے بعد کوئی اس کی ہدایت پر عمل کرے نہ کرے یہ اس کی اپنی مرضی ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم میں آپؐ کو ''بشیر'' یعنی قرآنِ کریم پر عمل کرنے کے اچھے نتائج کی خوشخبری سنانے والا اور ''نزیر'' یعنی احکامِ الٰہی پر عمل نہ کرنے کے نقصانات سے تنبیہ کرنے والا کہا گیا۔ آپؐ اپنی ذاتِ اقدس یا فرقانِ حمید یا خدائے بزرگ و برتر کے بارے میں اٹھائے جانے والے اعتراضات کا جواب ہمیشہ بڑی خندہ پیشانی و خوش اخلاقی کے ساتھ علمی و فکری سطح سے دیا کرتے تھے۔ قرآن میں لکھا ہے کہ ''(اے محمدؐ) ان سے کہو کہ میں بصیرت کی بنیاد پر خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں اور میری پیروی کرنے والے بھی بصیرت کی بنیاد پر ہی

خدا کی طرف دعوت دیں گے'' (108 یوسف)۔

ایک طرف تو یہ حالت تھی کہ خدا اور رسولؐ کے دشمن آپؐ اور آپؐ کے جانثاروں کو بڑی سے بڑی تکلیف پہنچانے کا چھوٹے سے چھوٹا موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے اور دوسری طرف یہ عالم تھا آپؐ (اپنے لیے نہیں بلکہ) ان دشمنوں کے لیے فکرمند رہتے تھے، وہ بھی اسقدر کہ خدا نے یہاں تک کہا کہ ''(اے پیغمبرؐ) شاید تم اس رنج وغم میں اپنی جان ہی کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان لانے والوں (یعنی فلاح پانے والوں) میں سے کیوں نہیں ہو جاتے'' (3 الشعرا، 6 الکھف) ''دیکھو ان لوگوں پر غم کھانے سے تمھاری جان ہی نہ چلی جائے'' (8 فاطر)۔

خدا کی قسم اگر ہم یہ سمجھ جائیں کہ توہینِ قرآن اور توہینِ رسالت کے نام پر لوگوں کے قتل ہونے اور گوجرہ جیسے بہیمانہ و انسانیت سوز واقعات کے رونما ہونے سے ''رحمتہ للعالمین'' کو کتنا دکھ پہنچے گا تو ہمارا دل دہل جائے، ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین نکل جائے اور ہماری باقی کی تمام زندگی خدا کے حضور روتے گڑگڑاتے اور معافیاں مانگتے گزر جائے۔ خدا ہم پر رحم کرے۔

روزنامہ جناح، 10/8/2009

عمران خان سے فوزیہ قصوری تک

آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ فلاں شخص نہ ہوا تو فلاں ادارہ تباہ ہو جائے گا کیونکہ اس ادارے کو اس شخص کے سوا کوئی نہیں چلا سکتا، یہی دلیل ریٹائر ہونے والے کئی سرکاری افسروں کی ملازمت میں توسیع یا نئے سرے سے انکی تعیناتی کے جواز میں بھی پیش کی جاتی ہے، کوئی یہ نہیں سوچتا کہ کیا کسی ایسے محکمے کو ''ادارہ'' کہا جا سکتا ہے جو چلنے کے لیے کسی فرد کا محتاج ہو؟ پاکستان کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ یہاں ادارے نہیں بن سکے بس افراد ہی بنتے رہے اور اس بات کو عظیم شاعر سید ضمیر جعفری نے کچھ اسطرح بیان فرمایا ہے کہ

ہم کو افراد مقدّم تھے اداروں کی جگہ
اب چھوہارے نظر آتے ہیں ستاروں کی جگہ

ادارہ سازی کے فقدان ہی کی بدولت شخصیت پرستی پروان چڑھا کرتی ہے جو زہرِ قاتل اور آزادی و جمہوریت کی سب سے بڑی دشمن ہوتی ہے۔ یہی مسئلہ کیا تحریکِ انصاف کو بھی درپیش ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر عمران خان نہ ہوں تو یہ سیاسی جماعت ایک دن بھی نہیں چل سکتی؟ یہ سوال میں نے ایک مرتبہ عمران خان سے پوچھا تھا اور انہوں نے جواب میں شوکت خانم ہسپتال کی مثال دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس کے بارے میں بھی اسی قسم کی باتیں کی جاتی ہیں لیکن میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ خود وہاں جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ اس ادارے کی ادارہ سازی کس طرح کی گئی ہے، آپ یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اس ہسپتال کو میرے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

شوکت خانم جانے کی سبیل تو نہیں نکلی لیکن چند روز قبل ایک نجی ٹی وی کے ایسے پروگرام میں شمولیت کا موقع ضرور مل گیا جس میں میرے علاوہ تحریکِ انصاف شعبہ خواتین کی صدر فوزیہ قصوری مدعو تھیں جو شوکت خانم ہسپتال کے لیے ''فنڈ ریزنگ'' کی بین الاقوامی مہم کی کوآرڈینیٹر ہیں اور اس وقت سے عمران خان کے ساتھ ہیں جب سے شوکت خانم کی پہلی اینٹ رکھی گئی، انہوں

نے بتایا کہ جب سے عمران خان نے سیاست میں شمولیت اختیار کی ہے کئی مرتبہ تو یہاں تک ہوتا ہے کہ وہ فنڈ ریزنگ کی بڑی اہم تقاریب میں بھی شرکت نہیں کر پاتے اور ہسپتال کا بورڈ آف گورنرز بھی بڑے آزادانہ، خودمختارانہ اور منظّم انداز میں انکے بغیر بھی اپنا کام کرتا رہتا ہے۔

فوزیہ قصوری تحریکِ انصاف کے بانی اراکین میں سے ہیں اور اسکی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کی ممبر بھی ہیں، ان سے بڑی تفصیلی ملاقات ہوئی اور اس دوران میں نے یہ جاننے کی ہر ممکن کوشش کی کہ تحریکِ انصاف کے بارے میں یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ دوسری سیاسی جماعتوں کے برعکس اس پارٹی میں قیادت کی دوسری صف سرے سے ہے ہی نہیں؟ کیا دیگر سیاسی جماعتوں کے شعبہء خواتین کی صدور اس لیے بہتر ہیں کہ انہیں اچھی طرح آزمایا جا چکا ہے؟ یا اس لیے کہ فوزیہ قصوری خلافِ معمول لکیر کی فقیر نہیں اور سوچنے سمجھنے کی جرات رکھتی ہیں، یہی نہیں بلکہ اگر کوئی دوسرا صحیح بات کہہ رہا ہو تو اسے ماننے کا حوصلہ بھی ان میں موجود ہے اور آئیں بائیں شائیں کے عمومی رویے سے بھی اجتناب کرتی ہیں؟ شوکت خانم کے عظیم منصوبے کے علاوہ اس ملک گیر مہم میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں جس کے تحت ان غریب شہری آبادیوں اور دیہاتوں میں صاف پانی کے کنویں کھدوائے جا رہے ہیں جہاں کے لوگ آلودہ پانی پینے پر مجبور ہیں یا جہاں کی بے بس خواتین کو دور دراز علاقوں سے پانی ڈھونے کی مشقت جھیلنی پڑتی ہے۔ 'انصاف سکلز سینٹرز' کے نام سے غریب اور بے روزگار خواتین کی فنی تربیت کا وہ پراگرام بھی چلا رہی ہیں جس کے تحت نہ صرف یہ کہ سلائی، کڑھائی، پینٹنگ، کشیدہ کاری وغیرہ جیسے کام مفت سکھائے جاتے ہیں بلکہ انہیں سیکھنے والی خواتین کے لیے روزگار بھی تلاش کیا جاتا ہے۔

ایک تحریکِ انصاف ہی کیا، کسی بھی تنظیم کے متعلق جب یہ سنتا ہوں کہ اس کا مستقبل تجربہ کار لوگوں کے فقدان کی وجہ سے خوش آئند دکھائی نہیں دیتا تو پطرس بخاری کا ایک دلچسپ واقعہ یاد آ جاتا ہے جب وہ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے اور ٹیسٹ انٹرویو لے رہے تھے۔ انہوں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ آپ خود کو اس آسامی کے لیے ایک موزوں امیدوار کیوں سمجھتے

ہیں؟ صاحب بولے، کیونکہ میں وسیع تجربے کا حامل ہوں۔اس پر پطرس نے یہ خوبصورت بات کہی کہ وسیع تجربے کا مطلب یہ بھی تو لیا جا سکتا ہے کہ آپ اپنی غلطیوں میں پختہ ہو چکے ہیں؟ ایک دوسرے امیدوار سے انہوں نے پوچھا کہ آپ پڑھانے کا دس سالہ تجربہ رکھتے ہیں تو کیا یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ ان دس سالوں میں وہ نصاب کتنی مرتبہ تبدیل ہوا جو آپ پڑھاتے رہے؟ امیدوار نے کہا کہ ایک مرتبہ بھی نہیں۔تو پطرس بولے کہ اس کا مطلب کیا یہ نہیں ہوا کہ آپ پڑھانے کا ایک سالہ تجربہ رکھتے ہیں اور باقی کے نو سال اسی تجربے کو دہراتے رہے ہیں؟ تجربہ کار سیاستدانوں کا المیّہ بھی یہی ہے کہ وہ اپنی غلطیوں میں پختہ ہو چکے ہیں اور کئی کئی برسوں سے ایک ہی برس کے تجربے کو بار بار دہرا رہے ہیں کہ ہماری سیاست کا نصاب بھی تو کبھی نہیں بدلا؟ اسی لیے تو ہماری سیاست اور تاریخ ایک دائرے میں سفر کر رہی ہے اور ہم خلیل جبران کی ''شرمناک قوم'' کی طرح ہر حکمران کا استقبال خوشی کے نقارے بجا کر کرتے ہیں اور آوازے کس کس کے اسے رخصت کرتے ہیں تاکہ اس کے بعد والے کو بھی شادیانوں کے ساتھ خوش آمدید کہہ کر گالیوں کے ساتھ خدا حافظ کہہ سکیں۔ہمیں اس بدترین مقام تک پہنچانے والے کیا ''تجربہ کار'' لوگ ہی نہیں جو کرپشن، ذخیرہ اندوزی، کمیشن خوری، مکر و فریب، جھوٹ اور بددیانتی میں اس قدر ماہر ہو چکے ہیں کہ ہم ان کے ہاتھوں بار ہا لُٹنے کے باوجود انہی کے پیچھے چلنے کی خواہش کرتے ہیں؟

عمران خان سے نظریاتی اختلافات اپنی جگہ لیکن وہ اور فوزیہ قصوری غلط نہیں کہتے کہ سیاست میں ''نا تجربہ کار'' ہونا اگر ''خوبی یا میرٹ'' نہیں تو ''عیب یا ڈی میرٹ'' بھی نہیں ہونا چاہیے؟ کہا جاتا ہے کہ مومن ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جا سکتا لیکن ہم تو بار بار ڈسے جا رہے ہیں۔ حالات کا ناگزیر تقاضا ہے کہ نئی قیادت کو سامنے لایا جائے اور بار بار آزمائے ہوؤں کو پھر نہ آزمایا جائے۔نئی قیادت بھی ضروری نہیں کہ اچھی ثابت ہو لیکن وہ ابھی بری بھی تو ثابت نہیں ہوئی اور ان لوگوں سے تو بہر طور بہتر ہی ہے جو کئی بار بُرے ثابت ہو چکے ہیں۔

روزنامہ جناح،2010

بہترین زندگی آپ بھی گزار سکتے ہیں

زاہد سے کافی عرصے بعد ملاقات ہوئی اور میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پہلے وہ اپنی عمر سے بڑا دکھائی دیتا تھا، اب چھوٹا نظر آنے لگا ہے۔ بجھی ہوئی آنکھوں میں چمک کا بسیرا ہو چکا ہے اور چہرے میں پژمردگی کی جگہ توانائی و رعنائی نے ڈیرے ڈال دیے ہیں۔ میرا یہ عزیز ڈپریشن کا شکار تھا اور مسکرانا بھول چکا تھا لیکن اب اسکے ہونٹوں پر ایک بڑی ہی دل نشیں مسکراہٹ رقصاں رہتی ہے۔ میں سمجھا کہ اس کے مالی حالات بہتر ہو گئے ہیں کیونکہ پچھلی مرتبہ وہ بڑی کسم پرسی کی حالت میں ملا تھا، میں نے کہا کہ خدا کا شکر ہے تمھارا کاروبار چل نکلا اور وہ مسکراتے ہوئے بولا کہ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بہترین زندگی کے لیے دولت اور وسائل کی ضرورت ہوتی ہے، میں بھی یہی سمجھتا تھا اور میرے پاس دولت تھی نہ وسائل تھے، اسی لیے میں ہر وقت ذہنی دباؤ کا شکار رہتا تھا، پھر کسی نے مجھے ایک ای میل بھیجی جس نے میری زندگی بدل کر رکھ دی۔ یہ ای میل میں آپ کے لیے بطورِ خصوصی لایا ہوں تاکہ آپ کا کالم اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا سکے اور زیادہ سے زیادہ لوگ بہترین زندگی گزار سکیں۔ میں نے بڑے تجسس کے ساتھ زاہد سے وہ ای میل لے لی اور بڑی دلچسپی سے اسے پڑھا۔ اس کا خلاصہ چند ضروری اضافوں کے ساتھ اپنے قارئین کی خدمت میں بھی عرض کر دیتا ہوں۔

روزانہ 10 سے 30 منٹ کی واک کریں اور اس دوران مسکراتے رہیں، چاہے اپنے ساتھ زبردستی ہی کیوں نہ کرنی پڑے، یقین مانیے کہ ماہرِ نفسیات کی کوئی دوا آپ کے ذہنی دباؤ کو ختم یا کم کرنے میں وہ کردار ادا نہیں کر سکتی جو آپ کی اپنی مسکراہٹ کر سکتی ہے چاہے وہ نقلی ہی کیوں نہ ہو۔ کم از کم 30 منٹ اپنی پسند کا کوئی کام کریں اور کچھ ایسا بھی کریں یا کہیں جس سے کم از کم 3 لوگ مسکرانے پر مجبور ہو جائیں، کم از کم 10 منٹ مکمل خاموشی میں بیٹھیں جس کے لیے اپنے کمرے کو تالا لگانا پڑے تو اس سے بھی گریز نہ کریں۔ جلدی سونے اور جلدی جاگنے کی عادت ڈالیں۔ ہر صبح خود سے یہ پوچھا کریں کہ آج سکا مقصد کیا ہے اور ہر رات سونے سے

پہلے یہ کہ کیا میں نے آج کا اپنا مقصد پورا کیا؟ کوئی آپ کے بارے میں کیا سوچتا ہے یہ اس کا مسئلہ ہے آپ کا نہیں۔ اچھی بیڈ شیٹیں، تولیے، برتن یا دوسری بہتر چیزیں خاص دنوں یا خاص مہمانوں کے لیے سنبھال کر مت رکھیں بلکہ فوراً استعمال کریں کیونکہ آپ بھی خاص ہیں اور آپ کا ہر دن بھی۔ حالات جیسے بھی ہوں اور آپ جیسا بھی محسوس کر رہے ہوں لیکن اپنے بستر سے اٹھیں، تیار ہوں اور اچھا دکھائی دے کر دنیا کا سامنا کریں۔ ہر اس چیز سے بچیں جو کار آمد، خوبصورت یا پُر لطف نہیں۔ دفتر کے ساتھ ساتھ اپنے گھر کو بھی وقت دیں اور یہ ذہن میں رکھیں کہ آپ بیمار ہو گئے تو آپ کا خیال دفتر والے نہیں بلکہ گھر والے رکھیں گے۔ ناشتہ خوب ڈٹ کر کیا کریں، دن کا کھانا اس سے کم اور رات کا کھانا بہت ہی کم کھایا کریں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی پھل ضرور کھائیں چاہے وہ سستا ہو یا مہنگا، تھوڑا ہو یا زیادہ۔ زیادہ تر خوراک ایسی استعمال کریں جو درختوں اور پودوں کے اوپر اُگتی ہے اور ایسی خوراک کم کھائیں جو پودوں کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ سبز چائے زیادہ سے زیادہ پیا کریں اور دودھ والی کالی چائے سے ہر ممکن حد تک اجتناب کریں۔ پانی صاف نہیں تو اسے ابال لیا کریں یا اس میں کلورین کی گولیاں ملا دیا کریں لیکن سردیوں میں کم از کم 10 اور گرمیوں میں کم از کم 15 گلاس ضرور پیئیں۔ کچھ نہ کچھ ضرور کھیلیں اور کچھ نہ کچھ ضرور پڑھیں، وہ بھی اسطرح کہ جتنا گزشتہ برس کھیلا اور پڑھا اس سے زیادہ اس برس کھیلیں اور پڑھیں۔ زیادہ تر وقت 70 برس سے زیادہ اور 6 برس سے کم عمر کے لوگوں کے ساتھ گزارنے کی کوشش کریں۔ خوب خواب دیکھیں لیکن سوتے ہوئے نہیں بلکہ جاگتے ہوئے اور اس امید کا دامن کبھی نہ چھوڑیں کہ ''بہترین'' ابھی آیا نہیں بلکہ آنے والا ہے۔ اپنے گھر، دفتر یا کسی بھی ایسی جگہ جہاں آپ تواتر سے کام کرتے یا رہتے ہوں، کو صاف ستھرا رکھیں اور وہاں موجود اشیا کی ترتیب و تزئین میں گاہے بگاہے تبدیلی کرتے رہا کریں تاکہ آپ یکسانیت کا شکار ہونے سے بچیں جو موت کا دوسرا نام ہے۔ اپنا وقت ایسی چیزوں کو موضوعِ گفتگو بنا کر برباد مت کریں جنہیں آپ تبدیل نہیں کر سکتے۔ جیون بہت اچھا نہیں تو

بہت برا بھی نہیں۔ یادرکھیں کہ زندگی ایک سکول کی طرح ہوتی ہے جہاں انسان سیکھنے کے لیے آتا ہے اور مسائل نصاب کا حصہ ہوتے ہیں جو کیمسٹری، الجبرے یا کسی دوسری ناپسندیدہ کلاس کی طرح آخرکار ختم ہو جائیں گے لیکن ان سے جو کچھ سیکھا ہوگا وہ ختم نہیں ہوگا۔ ناکامی، زندگی کا ضروری حصہ ہے اور اس سے دوچار ہو جائیں تو بس اتنا سوچ لیا کریں کہ اس ناکامی کی حیثیت آج سے 5 یا 10 سال بعد کیا ہوگی؟ وقت دل کے ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے، دل کے ہر زخم کو وقت دیں، یہ خود بخود بھر جائے گا۔ اپنی زندگی کا موازنہ دوسروں کی زندگی کے ساتھ مت کیا کریں کیونکہ آپ اس بات کا صحیح اندازہ کبھی نہیں کر سکتے کہ انکے اصل حالات کیا ہیں؟ کسی کے ساتھ حسد مت کریں کیونکہ اس سے کسی کو تو نقصان ہونے والا نہیں البتہ آپ کی توانائی و رعنائی ضرور متاثر ہو جائے گی۔ یہ کبھی مت بھولیں کہ اختلافِ رائے ہر انسان کا بنیادی حق ہے اور ضروری نہیں کہ آپ کی ہر دلیل ہر کسی پر کارگر ہو۔ کوئی آپ کی بات جھٹلائے تو اتنا ضرور سوچ لیا کریں کہ جسطرح آپ کو وہ ناگوار گزر رہا ہے ویسے ہی اسے بھی آپ اچھے نہیں لگ رہے ہونگے۔ دوسروں کو معاف کرنا سیکھیں، ہماری عمر اتنی زیادہ نہیں کہ اسے لوگوں سے انتقام لینے اور انہیں نیچا دکھانے میں ضائع کیا جائے۔ خدا سے ہر وقت یہ دعا مانگتے رہیں کہ

میرے آگے کسی بشر کو کہیں
دست بستہ کھڑا نہ کر دینا
کوئی کم تر مجھے نظر آئے
مجھ کو اتنا بڑا نہ کر دینا

کاش تمام لوگ زاہد کی طرح یہ سیکھ سکیں کہ انکی خوشی کا انچارج ان کے سوا کوئی نہیں، اگر وہ چاہیں تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں خوش رہنے سے نہیں روک سکتی، کاش تمام لوگ خود بھی خوش رہیں اور دوسروں میں بھی خوشیاں بانٹیں کہ یہی زندگی ہے اور یہی زندگی کا مقصد۔

روزنامہ جناح، 27/4/2009

راول ردھم

کہتے ہیں کہ مغل بادشاہ اکبر کے دربار میں آ کر ایک شخص نے بڑا دلچسپ دعوی کیا۔اس نے کہا کہ وہ ہندوستان میں بولی جانے والی تمام زبانیں اتنی مہارت سے بولتا ہے کہ کوئی یہ نہیں پہچان سکتا کہ اس کی مادری زبان کونسی ہے؟

دربارِ اکبری میں بڑے بڑے زبان دان ہوا کرتے تھے،سب کو بلا لیا گیا اور اس شخص نے باری باری مختلف زبانیں بولنا شروع کر دیں۔وہ جو زبان بھی بولتا،زبان دانوں کو لگتا کہ یہی اس کی مادری زبان ہے۔آخرِ کار انہوں نے ہتھیار ڈال دیے تو اکبر کا ہونہار وزیر بیربل میدان میں اتر آیا اور بولا کہ یہ پہیلی سلجھانے کا موقع اسے بھی فراہم کیا جائے اور اس کے لیے ایک رات کی مہلت بھی دی جائے۔اکبر نے منظوری دے دی اور دربار کی کاروائی ایک دن کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

وہ رات سب نے بڑے تجسس میں گزاری،اگلے روز دربار شروع ہوا تو بیربل نے فوراً ہی یہ بتا دیا کہ اس شخص کی مادری زبان کونسی ہے جسکی تصدیق اس شخص نے خود اپنی زبان سے کر دی اور اکبر سمیت تمام لوگ ورطہء حیرت میں ڈوب گئے۔سب کے ذہن میں بس یہی سوال کسمسا رہا تھا کہ زبان دانی کا یہ معمہ جو بڑے بڑے زبان دانوں سے حل نہ ہوا بیربل نے کیسے سلجھا لیا اور اس کے لیے ایک رات کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

بیربل نے جواب دیا کہ وہ رات کو چپکے سے شاہی مہمان خانے کے اس کمرے میں داخل ہوا جہاں وہ شخص سویا ہوا تھا اور بھرے ہوئے پانی کی بالٹی اس پر انڈیل دی،وہ ہڑ بڑا کر اُٹھا اور بے ارادہ بولنے لگا،اس وقت اس نے جو زبان بولی مجھے لگا کہ یہی اس کی مادری زبان ہوگی کیونکہ انسان لاشعوری طور پر ہمیشہ اپنی مادری زبان ہی بولتا ہے۔

یہ ہوتا ہے ایک انسان سے اس کی ماں بولی کا رشتہ جس کی ایک اور مثال یہ دیکھیے کہ میری مادری زبان پہاڑی ہے لیکن ماسوائے والدہ کے،گھر کا کوئی فرد بھی مجھ سے اس زبان

میں بات نہیں کرتا۔ گیارہ برس کا ہوا تو ہاسٹل میں چلا گیا، میٹرک کے بعد پاک فضائیہ میں شمولیت اختیار کر لی اور پھر سول سروس میں، ہر جگہ کثرت سے انگریزی یا اردو ہی بولی جاتی تھی۔ سرکاری ملازمت چھوڑ کر صحافت کے شعبے میں آیا تو انگریزی کی نسبت اردو سے رشتہ زیادہ گہرا ہوا، اردو زبان کا شاعر بھی ہوں، سات کتابوں کا مصنف ہوں جن میں سے ایک انگریزی اور چھ اردو کی ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اردو کے مقابلے میں پہاڑی سے میرا عملی رشتہ نہ ہونے کے برابر ہے، اس کے باوجود اپنے خدا کے حضور جب بھی گڑگڑاتا ہوں، لاشعوری طور پر پہاڑی بولنے لگتا ہوں۔

پہاڑی کی بہن پوٹھوہاری ہے جس کا مسکن پوٹھوہار کا خطہ ہے اور اس زبان کی جتنی خدمت آلِ عمران صاحب کر رہے ہیں شاید ہی کوئی اور کرتا ہو؟ پوٹھوہاری ادب کا ایک نا قابلِ فراموش حوالہ ہونے کے علاوہ وہ الیکٹرانک میڈیا میں بھی پوٹھوہار کی پہچان بن چکے ہیں، انہیں پی ٹی وی کی جانب سے بہترین علاقائی کمپیئر (پوٹھوہاری) کے ایوارڈ سے نوازا گیا اور برطانیہ سے ''اپ لنک'' ہونے والے پہاڑی و پوٹھوہاری زبان کے پہلے ٹی وی چینل میں کام کرتے ہوئے انہوں نے اپنی ماں بولی کی ترویج میں جو کردار ادا کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس دوران مجھے انہیں اور ماں بولی سے ان کے معاشقے کو بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا کیونکہ میں اس ٹی وی چینل میں چیف ایگزیکٹو آفیسر کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور اگر میں یہ کہوں کہ پوٹھوہاری اور آلِ عمران، جُگنی اور راول کی طرح ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہو چکے ہیں تو یقین مانیے کہ اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

آلِ عمران صاحب ہی پوٹھوہاری کی اس عظیم الشان تقریب کے میزبان بھی تھے جسے ''راول ردھم'' جیسا خوبصورت نام دیا گیا اور جس کا انعقاد پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس کے چیف ایگزیکٹو محترم نعیم طاہر، ایگزیکٹو ڈائریکٹر محترم توقیر ناصر اور ڈائریکٹر محترمہ محمودہ غازیہ کی خصوصی دلچسپی سے ممکن ہوا۔ یہ ٹیم بڑے ہی رنگا رنگ اور معیاری ثقافتی پروگرام برپا کیا کرتی ہے جن

میں شرکت کا موقع کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔ بد قسمتی سے میں اس تقریب میں شریک نہ ہو سکا لیکن اسکی ویڈیو مجھ تک پہنچی تو اس وقت تک ٹی وی کے سامنے سے اٹھا نہیں گیا جب تک یہ ختم نہیں ہوگئی۔

یوں تو ساری تقریب ہی اپنی مثال آپ تھی لیکن ''راول رنگ'' کے نام سے خطہء پوٹھوہار کے رنگوں پر محیط مختصر مگر جامع دستاویزی رپورٹ نے اپنی جانب خصوصیت سے متوجہ کیا۔ اس کے علاوہ جس چیز نے میری دلچسپی کو خاص طور پر مہمیز کیا وہ ''سمی میری وار'' کا مشہور و معروف روایتی رقص تھا جسے ایک بالکل ہی نئے انداز میں اتنی خوبصورتی سے پیش کیا گیا کہ رنج والم سے بوجھل روح تھوڑی دیر کے لیے بالکل ہی ہلکی پھلکی ہوگئی اور دل ایک تحیر آمیز مسرت سے جھوم اُٹھا۔ اس موقع پر رہ رہ کر یہ خیال دامن گیر ہوا کہ ہمارا معاشرہ مغربی موسیقی کے جس بھنور میں پھنس چکا ہے اس میں کس قدر شور اور انتشار ہے جبکہ ہماری اپنی مشرقی موسیقی کی لہریں جو ہمیں ترس رہی ہیں، کتنی مدھر اور آسودہ ہیں۔ ''راول ردھم'' میں جتنے بھی روایتی رقص دیکھنے کو ملے وہ نیشنل پرفارمنگ آرٹس کے طلبا و طالبات نے پیش کیے جو قوسِ قزح کے رنگوں میں ملبوس اتنی بے ساختگی و روانی سے جھوم رہے تھے کہ انہیں دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ہر طرف بہار آئی ہوئی ہے۔ ان خوش پوش و خوش ادا فنکاروں کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ بڑے میٹھے علاقائی گیت بھی سننے کو ملے جو پوٹھوہار کے معروف گلوکاروں نے گائے۔ سبھی اچھے تھے لیکن طاہر نیر، شکور لوہار اور راجہ جہانگیر کو بالخصوص بڑی پزیرائی حاصل ہوئی۔

پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس راول ردھم جیسے پروگراموں کے ذریعے علاقائی زبانوں کی بقا کے لیے جو کردار ادا کر رہی ہے وہ بڑا ہی قابلِ ستائش ہے اس لیے کہ ان زبانوں کے وجود کو شدید خطرہ لاحق ہو چکا ہے، اگر ایسا نہیں ہوتا تو دنیا بھر میں ہر سال علاقائی زبانوں کا عالمی دن کیوں منایا جاتا؟ کینیڈا میں مقیم میرے بڑے بھائی بتا رہے تھے کہ وہاں کے اساتذہ، والدین کو اپنے بچوں کے ساتھ علاقائی زبانوں میں بات کرنے کی تاکید کرتے

ہیں اور کہتے ہیں انگریزی تو بچے سکول میں سیکھ ہی لیں گے لیکن علاقائی زبان کہاں سے سیکھیں گے؟ اور اگر انہوں نے اپنی مادری زبان نہ سیکھی تو ان کی زندگی میں ایک ایسا خلا رہ جائے گا جو کبھی پُر نہیں ہو پائے گا؟ لیکن پاکستان میں تو گنگا الٹی ہی بہا کرتی ہے، اسی لیے تو احساسِ کمتری کے شکار ہمارے معاشرے میں بچوں کے ساتھ علاقائی زبان میں بات چیت کو بالعموم ایک معیوب فعل سمجھا جاتا ہے اور انگریزی زبان ''سٹیٹس سمبل'' کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ آپ خود ہی فرمائیے کہ ''فرفر'' انگریزی بولنے والے شخص نے چاہے کبھی سکول کالج کا منہ بھی نہ دیکھا ہو لیکن کیا ہم اسے ان پڑھ سمجھنے یا کہنے کی جرات کر سکتے ہیں؟ پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس ''راول ردھم'' کے انعقاد کے لیے بجا طور پر مبارکباد کی مستحق ہے۔

روزنامہ جناح، 23/6/2009

پھولوں اور خوشبوئوں کی وادی

اگر آپ کوئی ایسی جگہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ جہاں سال کے بیشتر حصے کا کوئی ایک پل بھی ایسا نہ ہو کہ جب ہوا سے کسی کیکر، کسی کائل، کسی چیڑ، کسی سفیدے کی سرگوشی کوئی بھید نہ کھولے یا کوئی کوئل، کوئی فاختہ میٹھی و مطمئن بولی نہ بولے یا کسی ککُّو کسی پپیہے کا شوخ و مست نغمہ کانوں میں رس نہ گھولے تو آپ کو میری جنم بھومی راولاکوٹ جانا چاہیے جہاں جا کر میں ہمیشہ سوچتا ہوں کہ مجھے پھولوں اور خوشبوؤں کی اس وادی میں پیدا کر کے میرے خدا نے مجھ پر جو احسان کیا اس کا بدلہ میں کیسے چُکا سکتا ہوں؟

کشمیر کے ہرے بھرے پہاڑ، پہاڑوں میں گھری گل پوش وادیاں، وادیوں میں بکھرے فطرت کے انمول مناظر، درخت ہی درخت، سبزہ ہی سبزہ، پھول ہی پھول، خوشبو ہی خوشبو، رنگ ہی رنگ، روشنی ہی روشنی۔ نہ یہاں کے دن تتلیوں سے خالی ہوتے ہیں نہ راتیں جگنوؤں سے۔ میں نے کہیں اور نہ کبھی اتنے درختوں کو ایک ساتھ جھومتے دیکھا نہ کبھی اتنے پرندوں کو ایک ساتھ گاتے سنا۔

ان دنوں بہار کی آمد آمد ہے،آلو بخارے اور آڑو کے درختوں نے سفید اور گلابی پھولوں کی تہذیب ایسی شائستگی سے اوڑھ رکھی ہیں کہ انہیں نظر بھر کر دیکھ لیا جائے تو انسان بڑے سے بڑا دُکھ بھی بھول سکتا ہے۔ زمین پر گھاس سے زیادہ سفید، پیلے اور نیلے جنگلی پھولوں کے بستر کچھ اسطرح بچھے ہوئے ہیں کہ یقین مانیے جب میں گھر جارہا ہوتا ہوں تو انہیں کُچلے بغیر دو قدم چلنا بھی محال ہوتا ہے۔سرخ دھاریوں والے سفید ''ٹیولپ'' کی ''وائلڈ گروتھ'' بھی آجکل ہر سمت پھیلی ہوتی ہے،اس انمول پھول کی خاص بات یہ ہے کہ دن کے اختتام پر اپنی پتیاں سمیٹ کر شام کے وقار کو دوبالا کر دیتا ہے اور دن کے آغاز پر اپنی پتیاں کھول کر صبح کی تازگی و شگفتگی کو چار چاند لگا دیتا ہے۔سرسوں کی تہہ دار کھیتیاں بھی جا بجا دکھائی دیتی ہیں جن کے پھولوں میں بہار کے

آنے کی خبر مہکتی ہے اور جو بہار کی چنچل ہوا کے ساتھ لہلہاتی ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی زیبا رخ کے شوخ آنچل سے صبا اٹھکیلیاں کر رہی ہو۔

ساڑھے پانچ سے ساڑھے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع وسیع و عریض وادیوں کے اس سرسبز و شاداب سلسلے کو طلوعِ صبح کے وقت کسی پہاڑ کی اونچائی سے دیکھئے۔ ابھرتے سورج کی کرنیں یہاں بکھری اوس کے شفاف قطروں سے گزرتی ہیں تو یہ سرزمین موتیوں کی طرح جگمگا اٹھتی ہے۔ اسی لئے تو اسے پرل ویلی بھی کہا جاتا ہے۔

پرل ویلی کا ذکر ہو اور پرل ویلی پبلک سکول کا نہ ہو یہ کیونکر ہوسکتا ہے جہاں علم کی کرنیں معصوم بچوں کے شفاف ذہنوں سے گزر کر ان کی بصیرت کو صحیح معنوں میں موتیوں جیسی چمک دمک سے نوازتی ہیں ،''کوالٹی ایجوکیشن'' کا یہ ادارہ سابق مشیرِ حکومت آزاد کشمیر سردار حبیب، انکے بچوں اور بھائیوں کے قائم کردہ ٹرسٹ نے بنایا۔ ان بھائیوں نے اس ادارے کے قیام کے لیے وہاں موجود اپنی ساری زمین کا نزرانہ پیش کر کے ایک قابلِ تقلید نمونہ پیش کیا۔ اس ادارے کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں داخلے کے امتحان میں میرٹ پر آنے والے کسی بھی بچے کو داخلے سے محروم نہیں کیا جاتا ، اگر وہ فیس دینے کی گنجائش نہ رکھتا ہو تو اس کے اخراجات ادارہ خود اٹھاتا ہے۔

پرل ویلی جیسی خوبصورت جگہ میں پرل ویلی سکول جیسے خوب سیرت ادارے کا قیام ایک ایسی خدمت ہے جس کی مثال ہماری آزادی سے آج تک کی تاریخ میں تو نہیں ملتی۔ اس سکول کی (غالبًا بانی) پرنسپل جان ایٹکنسن برطانیہ کی رہنے والی تھیں جنہیں بچوں کی طرح پھول بھی بڑے پیارے لگتے تھے، میرے ساتھ ایک ملاقات میں انہوں نے کہا کہ''میں نے ساری دنیا گھومی لیکن راولاکوٹ جیسا علاقہ نہیں دیکھا، بہار آتی ہے تو مجھے سمجھ نہیں آتی کہ اس علاقے کو کیا کہوں؟ کیا یہ (Fairy Land) پریوں کا دیس ہے''؟

بہار میں تو یہ وادی ایسے دلکش روپ میں سامنے آتی ہے کہ انسان جدھر دیکھتا

ہے دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ ان دنوں یہاں نہ بصارتیں نکھرنے سے محروم رہ سکتی ہیں نہ بصیرتیں سنورنے سے۔ دن بھر تتلیوں کے غول اور رات بھر جگنوؤں کے قافلے آس پاس سے گزرتے رہتے ہیں۔ بہار کا جادو بالخصوص اس وقت سر چڑھ کر بولتا ہے جب کیکر کے پھول کھلتے ہیں جو یہاں اتنی کثرت سے ہوتے ہیں کہ اپریل کے وسط تک ان پھولوں سے زیادہ کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا اور یہ تو آپ جانتے ہی ہونگے کہ کیکر کے پھول خوبصورتی اور خوشبو میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ کیکر کے پھول کھل اٹھتے ہیں تو کسی پربت کی اونچائی سے دیکھنے پر یہ وادی ایک گلدستے کی طرح دکھائی دیتی ہے جسکی سیر جنت کی سیر سے کم نہیں۔ یہاں گھومتے گھومتے ایک مرتبہ کچھ اسطرح کے اشعار ہوئے کہ

وہ جاناں کے آنچل میں بھی ہیں کہاں
یہاں فصلِ گل میں ہیں جو شوخیاں
تہی جس سے ہے عنبریں زلف بھی
وہ خوشبو یہاں شام میں ہے جواں
جو زیبا رُخوں میں بھی دیکھے نہیں
وہ جلوے یہاں صبح میں ہیں عیاں
جو شیریں لبوں میں بھی ناپید ہیں
یہاں ہیں پھلوں میں وہ شیرینیاں
اُمنگیں یہاں ایسے اُڑتی پھریں
سرِ شاخِ گل جس طرح تتلیاں
کچھ ایسے یہاں مسکرائے سحر
کہ ہو اوس پر موتیوں کا گماں
شبیں جون کی بھی ٹھٹھرنے لگیں
گھڑی بھر جو برسے یہاں آسماں

عجب لائیں روئیدگی بارشیں
اُگے پتھروں سے بھی سبزہ یہاں
یہاں کی دھنک رنگیاں اوڑھ کر
ہوا سے کریں پھول سرگوشیاں
بہشتِ بریں جیسی خوش رنگ ہیں
مرے راولاکوٹ کی وادیاں

جتنی مہمان نواز اس علاقے کی فطرت ہے اتنے ہی مہمان نواز یہاں کے لوگ بھی ہیں جن کی مہمان نوازی کی تعریف عہد ساز شاعر و افسانہ نگار حضرت احمد ندیم قاسمی نے مجھ سے بڑے خوبصورت انداز میں کی تھی، کہہ رہے تھے کہ ایک مرتبہ وہ اور شہنشاہِ ظرافت سید ضمیر جعفری اپنے ایک دوست کے گھر تک پہنچنے کے لئے راولاکوٹ کے اونچے نیچے راستوں پر جہاں سے بھی گزرتے کوئی نہ کوئی ضرور ملتا اور جو کوئی بھی ملتا انہیں ''اجنبی'' جان کر بڑے تپاک سے پہلے سلام کرتا اور پھر فرداً فرداً دونوں کی خیریت معلوم کرتا۔ ایک تو پہاڑی سفر کی تھکن اس پر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد رک رک کر واعلیکم سلام بھی کہنا اور اپنی خیریت سے بھی آگاہ کرنا، ضمیر جعفری صاحب اس قدر رنڈھال ہو گئے کہ مزید ایک شخص کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر بڑی بے ساختگی، بے چارگی اور معصومیت سے بولے کے ندیم صاحب آپ کی بڑی مہربانی ہو گی ان صاحب کو میری طرف سے بھی واعلیکم سلام کہہ دیں اور یہ بھی بتا دیں کہ میں خیریت سے ہوں۔

ایسے مہمان نواز لوگوں کا ایسا مہمان نواز علاقہ لیکن سیاحت کے اعتبار سے پیچھے بلکہ بہت پیچھے، اس کی وجہ محکمہ سیاحت کی سیاحت دشمنی کے علاوہ لوگوں میں اس شعور کی کمی ہے کہ سیاحت کی ترقی دراصل انکی اپنی ترقی ہے۔ کاش اس علاقے کو سہولیات سے آراستہ کر دیا جائے اور یہاں کے لوگوں میں سیاحت کا شعور بیدار ہو جائے تاکہ ساری دنیا کی سیاح ان انمول نظاروں سے اپنے دیدہ و دل کو معطر کر سکیں؟

روزنامہ جناح 29/3/2010

پہلی حمد

تاریخ پڑھانے والے چنگیز خان کی خامیوں کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ وہ بڑا جابر تھا، اس کے قہر سے دنیا کانپتی تھی، وہ بڑا انتقامی تھا جبکہ اسلامیات کے اساتذہ خدا کی خوبیاں پڑھاتے ہوئے بتاتے تھے کہ وہ جبار ہے، وہ قہار ہے وہ المنتقم ہے اور میں رات بھر یہ سوچ سوچ کر ڈرتا اور جاگتا رہتا تھا کہ جن چیزوں کو چنگیز خان کی خامیاں کہا جاتا ہے کیا وہ خدا کی خوبیاں کہلاسکتی ہیں؟ کیا جبر کرنا یا قہر کرنا یا انتقام لینا کوئی اچھی بات ہے جو خدا ایسا کرتا ہے؟ میں ان دنوں سکول کا طالب علم تھا اور اسلام کے بارے میں وہی واجبی سا علم رکھتا تھا جو میرے آباؤاجداد اور ان کے آباؤاجداد رکھتے تھے۔ اس علم کی سب سے بڑی ''خصوصیت'' یہ تھی کی اس میں سوال پوچھنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جو کچھ بتایا جاتا تھا اسے سوچے سمجھے بغیر ہی مان لینا اصل ایمان تھا بالخصوص ایسے سوال پوچھنا جن کے جواب ''علماء'' کے پاس نہیں ہوتے تھے، ایک ''شیطانی فعل'' تھا جسے اپنانے والے ''مرتد'' کا آخری ٹھکانہ جہنم ہوتا ہے۔ میں ہاسٹل میں رہتا تھا جہاں بعض لڑکوں کے پاس ''موت'' کا منظر اور ''بہشتی زیور'' جیسی ''سبق آموز'' اسلامی کتابیں تھیں۔ یہ کتابیں وہ آئے روز کسی نئے لڑکے کو بہلا پھسلا کر پڑھنے کے لیے دے دیا کرتے تھے اور جن دنوں مجھے خدا کی خوبیوں والے سوال نے پریشان کر رکھا تھا ان دنوں میں موت کا منظر پڑھ رہا تھا۔ آنکھ لگتی تو طرح طرح کے بھیانک خواب سونا حرام کر دیتے اور آنکھ کھلتی تو ذہنی الجھن جاگنا عذاب کر دیتی۔ اس کشمکش سے میرے اور خدا کے درمیان ایک ایسی دوری پیدا ہوگئی جسے کئی برس کی مسلسل عبادتوں کے باوجود نہ مٹا سکا، اور مٹاتا بھی کیسے کہ اپنے سوال کا جواب جس کسی سے بھی مانگا اس نے ٹال دیا یا ڈرا دیا؟

عملی زندگی میں داخل ہوا تو لکھنا پڑھنا ہی اوڑھنا بچھونا بن گیا، پھر اتفاق سے علامہ اقبال کے لیکچرز پر مبنی ایک انگریزی کتاب نظر سے گزری جس کا ترجمہ ''فکر اسلامی کی تشکیل نو'' اور ''خطبات'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اسلام کے بارے میں ایسی خوبصورت کتاب کم

ازکم میں نے پہلے کبھی نہیں پڑھی تھی۔ ''مفکر اسلام'' کی یہ سیر حاصل کتاب خدا جانے ہمارے تعلیمی نصاب میں کیوں شامل نہیں ؟ شاید اس لیے کہ اس سے مسلمان کا سویا ہوا ''ایمان'' جاگ سکتا ہے؟ اس کتاب نے مجھے قرآن کی طرف مائل کیا اور بڑے واضح' مدلل اور دوٹوک الفاظ میں یہ بنیادی سبق سکھایا کہ فکر اسلامی کا مغز فکر و تحقیق ہے۔

قرآن پر کام شروع کیا تو پتہ چلا کہ عربوں کے یہاں جب کسی کی ہڈی ٹوٹتی تو اسے اوپر نیچے سے کس کر اس طرح باندھ دیا جاتا تھا کہ کچھ عرصے میں جڑ کر اصل حالت میں واپس آجاتی تھی ۔عرب اس طریقہ علاج کو''جبر'' کہتے تھے جو''پلاسٹر آف پیرس'' کے عام ہونے سے پہلے برصغیر میں بھی عام ہے(اس سے میں بذاتِ خود بھی مستفید ہو چکا ہوں)۔ جس لکڑی سے ہڈی کو جکڑا جاتا تھا، اسے ''جبارۃ'' کہتے تھے اور جس پٹی سے لکڑیوں کو باندہ جاتا تھا ''جبیرۃ'' کہلاتی تھی ۔یعنی خدا کے جبر سے مراد ہڈیاں توڑنا نہیں بلکہ ہڈیاں جوڑنا ہے، جس سے تھوڑی تکلیف تو ہوتی ہے لیکن انسان بڑی تکلیف سے بچ جاتا ہے۔اب آیئے قہار کی طرف،عرب لوگ گوشت کو جس طریقے سے پکا کر کھانے کے قابل بناتے تھے اسے ''قہر'' کہا جاتا تھا، اسی اعتبار سے ''لحم مقہور'' اس گوشت کو کہتے ہیں جسے آگ پر رکھ کر گلایا جاتا ہے۔یعنی خدا کے قہر سے مراد وہ قوت وشدت ہے جس سے گوشت (جلایا نہیں بلکہ) گلایا جاتا ہے۔ ''المنتقم'' کا معاملہ بھی مختلف نہیں کہ وہ جانور جو راستے سے بھٹک کر دائیں بائیں ہو جاتے تھے ، انہیں گھیر کر (کبھی پیار اور کبھی سختی سے) صحیح راستے پر لانے کو عربوں کے یہاں انتقام لینا کہا جاتا تھا' یعنی خدا کے ''المنتقم'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے قوانین کے ذریعے بھٹکے ہوئے لوگوں کو (کبھی پیار اور کبھی سختی سے) راہِ راست پر لاتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ عربی میں جبر، قہر اور انتقام کے معانی اردو میں ان الفاظ کے رائج مفاہیم سے کس قدر مختلف ہیں اور مثبت بھی ؟ اس حقیقت سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد میرا ذہنی انتشار ختم ہو گیا جس کے ساتھ ہی میرے اور خدا کے درمیان وہ دوری بھی ختم ہو گئی جو اس

کی وجہ سے حائل تھی، دل سے بے اختیار یہ دعا نکلی کہ یا اللہ حکمرانوں اورزورآوروں کے ''جبر'' کو بھی ایسا بنا دے جس سے ہڈیاں توڑی نہیں بلکہ جوڑی جائیں ''قہر'' کو ایسا بنا دے جس سے گوشت جلایا نہ جائے بلکہ گلایا جائے اور انتقام کو ایسا بنا دے جس سے لوگوں کو بھٹکایا نہ جائے بلکہ راہ راست پر لایا جائے۔اس رات میں ایک مدت کے بعد بڑے اطمینان سے بڑی گہری نیند سویا اور خواب میں اپنی زندگی کی پہلی حمد ''اللہ ہو'' کے پہلے دو مصرعے کہے جو بعد میں کچھ اسطرح ہوئی کہ

کر رہی ہے گلوں سے تری گفتگو
کر کے بادِصبا خوشبوؤں سے وضو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو
تتلیوں کو تری دید کی آرزو
فصلِ گل کو ترے لمس کی جستجو
اک کلی کے تبسم کی تکمیل پر
زندگی لگ رہی ہے قضا ہو بہو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو
تیری رحمت کے گل ہیں چمن در چمن
روشنی تیری چاہت کی ہے چار سو
تیری توصیف میں جھومتے ہیں شجر
ذکر جاری ترا جابجا کوبکو
اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

روزنامہ خبریں، 19/6/2007